اکتیسواں سال

سالنامہ "نگار"

سنہ ۱۹۵۲ء

حسرت نمبر

تذکرۂ حسرت

(نیاز فتحپوری)

مولانا حسرت موہانی کی خبر رحلت جس وقت میں نے سنی تو معاً شریف رضی کے مرثیہ کا ایک شعر جو اس نے صابی کی وفات پر لکھا تھا بے اختیار زبان پر آگیا:

أرأيت من حملوا على الأعواد
أرأيت كيف خبا ضياء النادي

(تم نے دیکھا کہ لوگ یہ کس کو لکڑیوں پر اٹھا کر لے گئے اور کیا تم نے دیکھا کہ ہماری مجلس کی روشنی کیسی بجھ گئی)

یقیناً حسرت کی وفات ہماری محفل شعر و سخن کی اس شمع کا گل ہو جانا ہے جو اب سے تقریباً ۶۰ سال قبل روشن ہوئی تھی اور اس وقت تک کچھ نہ کچھ روشنی دے رہی تھی۔

حسرت کا نام سید فضل الحسن تھا اور ضلع اناؤ (یو-پی) کا ایک مشہور قصبہ موہان آپ کا مسقط الراس تھا۔ حسرت کا سلسلۂ نسب امام علی موسیٰ رضا سے ملتا ہے۔ امام رضا کی اولاد میں سے ایک بزرگ سید محمود نیشاپوری نے جو حسرت کے جد اعلیٰ تھے موہان میں اقامت اختیار کی اور یہیں ۱۲۹۵ھ میں حسرت پیدا ہوئے ان کے والد کا نام سید اظہر حسین تھا جن کو اپنی دادی کی طرف سے تحصیل کھجوا ضلع فتحپور میں تین گاؤں وراثتاً ملے تھے اور اسی سلسلہ سے حسرت کا آنا فتحپور ہوا۔

حسرت کی ابتدائی تعلیم قدیم مکتبی طرز کی موہان ہی میں ہوئی اور وہیں سے ۱۸۹۴ء میں اس اعزاز کے ساتھ اردو مڈل کا امتحان پاس کیا کہ صوبہ بھر میں اول آئے۔ اس کے بعد وہ موہان سے فتحپور آئے اور گورنمنٹ اسکول میں انگریزی تعلیم شروع کی لیکن خارج اوقات میں مولانا سید ظہور الاسلام (مرحوم) بانی مدرسہ اسلامیہ سے عربی اور میرے والد مرحوم سے فارسی پڑھی۔ فتحپور میں اول اول مجھے ان سے ملنے کا موقعہ ملا اور وہ بھی اس خصوصیت کے ساتھ کہ مجھے ان سے نسبت خواجہ تاشی حاصل تھی۔ وہ میرے مکان سے قریب ہی شیخ شاکر علی مرحوم کے مردانخانہ میں رہا کرتے تھے اور وہیں ہر وقت صحبت شعر و سخن گرم رہتی تھی۔ ان کو اپنے فتحپوری احباب میں سید ہاشم (ساکن کوڑا سے) خصوصیت کے ساتھ بڑا شغف تھا اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ وہ حسرت کی شاعری کا موضوع تھے۔ چنانچہ حسرت نے اپنے اشعار میں متعدد جگہ ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔ ۱۸۹۵ء میں انٹرنس کا امتحان درجۂ اول میں پاس کر کے علیگڈھ چلے گئے اور ۱۹۰۳ء میں بی-اے پاس کیا۔ سید سجاد حیدر یلدرم اور مولانا شوکت علی ان کے ساتھیوں میں تھے۔ کالج کی تعلیم کے زمانہ ہی میں ان کے سیاسی رجحانات کا علم لوگوں کو ہو گیا تھا اور ارباب کالج ان کو اچھی نگاہوں سے نہ دیکھتے تھے۔ گریجویٹ ہونے کے بعد آپ نے علیگڈھ سے "اردوئے معلیٰ" جاری کیا اور اسی کے ساتھ بال گنگا دھر تلک اور آربند و گھوش کے عقاید کے پیش نظر انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ کانگرس میں سب سے پہلے آپ نے ۱۹۰۴ء میں شرکت کی اور برابر اس میں شریک ہوتے رہے۔ چونکہ کانگرس کی پالیسی بہت نرم تھی اور حکومت سے صرف چند رعایتوں کی طالب تھی اور یہ غیر مشروط آزادی کے حامی تھے اس لئے سورت کے اجلاس کانگرس میں تلک کے ساتھ انھوں نے بھی استعفا دیدیا

آپ کو مسلم لیگ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، آپ اسے آغا خانی لیگ کہتے تھے، لیکن جب لکھنؤ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا اور اس کے سیاسی عقاید میں تبدیلی ہوئی تو یہ اس میں شرکت کرنے لگے۔ لیکن اپنے اصول کے خلاف جب کوئی بات دیکھی تو ہمیشہ اس کی مخالفت کی، یہاں تک کہ بعض اوقات انھوں نے سر آغا خاں اور محمد علی جناح کی پروا نہ کی اور نہایت آزادی و بیباکی سے ان کی مخالفت کر کے جلسہ کا رنگ بدلدیا۔ حسرت کے قید و بند کی تاریخ ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتی ہے۔ آپ نے ۱۹۰۸ء میں انگریزی پالیسی کے متعلق ایک مضمون اردوئے معلیٰ میں شایع کیا اور حکومت نے جرم بغاوت عاید کر کے دو سال قید سخت کی سزا دیدی۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں اسی جرم میں قید کئے گئے اور تیسری بار ۱۹۲۲ء میں حکومت بمبئی نے بغاوت کا مقدمہ قایم کر کے دو سال کے لئے یروداسنٹرل جیل بھیجدیا۔ قید فرنگ کے زمانہ میں جتنی شکر... اشاعت... بلند... آپ کو پہونچائی گئیں ان کا اندازہ "مشاہدات زندان" سے ہو سکتا ہے جو آپ نے اردوئے معلیٰ میں شایع کیا تھا۔ حسرت سودیشی تحریک کے بڑے زبردست ... تھے۔ انھوں نے خود بھی ایک سودیشی اسٹور کانپور میں قایم کیا اور دوسرے مقامات پر بھی متعدد سودیشی دوکانیں قایم کرائیں۔ انھوں نے آخر عمر تک ان...

حسرت نے اپنے دیوان حصہ ہشتم میں جو سب سے پہلی بار الناظر پریس میں طبع ہوا تھا حسرت لکھتے ہیں کہ: ''وہ فارسی غزلیں بھی قیام فتحپور کے اس زمانہ کی یادگار ہیں جبکہ حضرت استاد مولانا ظہور الاسلام مرحوم، نیز حضرت نیاز فتحپوری کے مرحوم والد ماجد کے فیض قربت نے نظم و نثر فارسی کی مشق کا ایک خاص شوق پیدا کر دیا تھا۔''

کوئی ولایتی چیز استعمال نہیں کی اور اگر کسی شے کے متعلق انھیں شبہ ہو جاتا تھا کہ یہ دیسی نہیں ہے تو اسے فوراً علٰحدہ کر دیتے تھے ۔ تقسیم ہند کے وقت آپ کا تعلق مسلم لیگ سے تھا اور لیگ ہی کے ٹکٹ سے آپ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے اور اخیر وقت تک رکنیت پارلیمنٹ کے فرائض نہایت آزادی و بیباکی سے انجام دیتے رہے۔

حسرت اپنے سیاسی عقاید کے لحاظ سے کمیونسٹ تھے ۔ وہ پاکستان کی تخلیق کے ضرور حامی تھے لیکن پاکستان ڈومی نین کے قایل نہ تھے بلکہ پاکستانی جمہوریت کے حامی تھے اور یہی مسئلہ ان کے اور قایداعظم محمد علی جیناح کے درمیان آخر تک مابہ النزاع رہا ۔ اپنے مذہبی عقاید پر خود انھوں نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے کہ " میں قدامت پرست ، سُنّی اور صوفی ہوں ، تصوف کو مذہب کا جوہر سمجھتا ہوں اور تصوف ما حصل میرے نزدیک جذبۂ عشق ہے"[1]

حسرت ابتدا ہی سے مولانا شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی کے معتقد تھے اور ان کے بعد ان کے جانشین و فرزند مولانا عبدالوہاب فرنگی محلی سے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کر لی تھی ۔ سماع کے بڑے شایق تھے اور بعض اوقات ان پر اک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی ۔ حسرت کی علمی و ادبی خدمات اور ان کے مرتبۂ شاعری کا اندازہ آپ کو سالنامہ کے دوسرے مضامین سے بخوبی ہو سکے گا ۔ ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ یہ ہے کہ اساتذۂ قدیم کے تمام دواوین فراہم کر کے ان کا انتخاب شایع کیا اور محض ان کی اس سعی و کوشش کی بدولت بہت سے اساتذہ کا کلام محفوظ ہو گیا ۔ فنی حیثیت سے نکات سخن ، محاسن سخن اور معایب سخن پر ان کے رسالے خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ۴۰ سال تک اُردوئے معلیٰ کا جاری رکھنا بجائے خود بڑی عظیم ادبی خدمت تھی جس کو تاریخ ادب اُردو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی ۔

حسرت بڑی پختہ طبیعت کے انسان تھے اور جس سے جو تعلق ایک بار قایم کر لیا اسے کبھی قطع نہیں کیا ۔ وہ بڑے خوش مزاج ، منکسر طبیعت ، صلح کل اور سادہ وضع کے انسان تھے ۔ روزہ نماز کے سخت پابند تھے اور اخیر عمر میں تو سالہا سال تک انھوں نے حج بھی ترک نہیں کیا ، لیکن زاہدانہ تقشف ان میں کبھی پیدا نہیں ہوا ۔

جو وضع انھوں نے شروع میں اختیار کی اس پر آخر وقت تک قایم رہے ۔ شیروانی ، ترکی ٹوپی ، شرعی پاجامہ ان کا مخصوص لباس تھا ۔ دور کی نظر انکی ہمیشہ سے کم تھی اس لئے عینک لگانے کے وہ عادی تھے لیکن کتاب پڑھتے وقت وہ اسے علٰحدہ کر دیتے تھے ۔

پان تو خیر کبھی کبھی کھا لیتے تھے لیکن تماکو ، حقہ ، سگریٹ سے انھوں نے ہمیشہ اجتناب کیا اور سُرمہ لگانا کبھی نہیں چھوڑا ۔

ان کا قد چھوٹا تھا اور رنگ صاف ، آنکھیں بڑی تھیں اور چہرہ پر چیچک کے داغ کافی نمایاں تھے ، آواز باریک تھی اور جوانی میں کافی مترنم تھی ۔

ان کی زندگی درویشانہ بلکہ قلندرانہ قسم کی تھی اور مزاج میں حد درجہ استغنا تھا ۔ انھوں نے نہ کبھی لیڈر بننے کی کوشش کی اور نہ کسی بڑے سے بڑے لیڈر سے مرعوب ہوئے ۔ دُنیاوی لحاظ سے وہ بڑی مختصر تمنّایٔں رکھنے والے انسان تھے ، اس لئے ان پر کبھی مایوسی کی کیفیت طاری نہیں ہوئی ، وہ بڑے مرد انسان تھے اور سخت سے سخت مصائب کو نہایت خوشدلی کے ساتھ جھیل جاتے تھے ۔ اپنی ضرورت کے لئے کسی سے اعانت و امداد کی خواہش کرنا ان کے یہاں کفر تھا ۔

انسان ہونے کی حیثیت سے وہ بڑی چیز تھے اور شعر و انسانیت کا جیسا دلکش امتزاج حسرت کے یہاں پایا جاتا تھا اس کی نظیر ہمیں متقدمین میں بھی نہیں ملتی متاخرین کا کیا ذکر ہے ۔ محض شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ کوئی مفکر شاعر نہ تھے ان کی شاعری یکسر اسی دُنیا کی عاشقانہ شاعری تھی اور اس رنگ میں وہ یقیناً بڑے دل کے شاعر تھے ۔ ان کا کلیات تقریباً سات ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور سخت انتخاب کے بعد بھی ان میں ۶ ۔ ۷ سو اشعار ہم کو ملجاتے ہیں ، اگر اساتذۂ قدیم کی تقلید میں تمام حروف تہجی میں غزلیں لکھنے کی پابندی نہ کرتے تو انتخاب کا اوسط اور بڑھ جاتا ۔ میں نے انتخاب میں ہر اس شعر کو لے لیا ہے جو کسی نہ کسی کو ضرور پسند آسکتا ہے ، ورنہ ان اشعار کو ترک کر دیا ہے جنھیں حسرت غالباً خود بھی انتخاب نہ کرتے اگر یہ کلیات کسی اور کا ہوتا ۔

وفات سے کچھ زمانہ قبل وہ لکھنؤ آگئے تھے اور فرنگی محل میں عارضی اقامت اختیار کر لی تھی ۔ ان کو " اسہال کبدی " کی شکایت ہو گئی تھی ، جس نے رفتہ رفتہ حد درجہ ضعیف و ناتواں کر دیا تھا ، لیکن اضطراب کا کوئی اثر ان کے چہرہ سے نمایاں نہ تھا ۔

وصال سے چند دن قبل جب میں حاضر ہوا تو وہ بالکل صاحب فراش آنکھ بند کئے ہوئے خاموش لیٹے تھے لیکن ان کے ہونٹ جنبش میں تھے اور ایسا ہوتا تھا کہ وہ کچھ پڑھ رہے ہیں اور اُنگلیوں پر اس کا شمار بھی کرتے جاتے ہیں ۔ میری آواز پہچان کر ہاتھ کے اشارہ سے مزاج پُرسی کی اور پھر ذکر و شغل میں مصروف ہو گئے ۔

۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو ۷۵ سال کی عمر میں ان کی وفات ہوئی اور انوار باغ میں اپنے پیر و مرشد کے پائیں سپرد خاک کئے گئے ۔ اخیر وقت میں انھوں نے یہ وصیت کی کہ ان کے پیر و مرشد کے عرس کے ساتھ ان کا عرس بھی ہر سال ماہ صفر میں ہوتا رہے ۔

---

[1] " حسرت موہانی " از پرنسپل عبدالشکور

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۱	جنوری، فروری ۱۹۵۲ء	شمارہ ۱-۲

فہرست مقالات

کلیات حسرت موہانی

بقیہ انتخاب

(بہ سلسلۂ صفحہ ۱۴۲)

جنوری ۴۳ء سے دسمبر ۱۹۵۰ء تک

ہزار شکر کہ مستغنیِ شفا ہو کر
مری دُعا بھی ترے غم سے شرمسار نہیں

بجا ہے گر تری نسبت سے جانِ حسرت کو
ترے فراق کا صدمہ بھی ناگوار نہیں

اب تک ہے یاد اے تند خو مقتل میں وہ آنا ترا
وہ سر جُھکا دینا مرا وہ حکم فرمانا ترا

اس شوخ کا شکوا کیا، حسرت یہ تو نے کیا کیا
اس سے تو اے مردِ خدا، بہتر تھا مرجانا ترا

دل ان سے مل کے اب ان کو ڈھونڈ نہیں سکتا
مگر یہ کیوں ہے، میں خود بھی بتا نہیں سکتا

بقدر حوصلۂ عاشقی ہے شوقِ وصال
مگر وہ شوق جو دل میں سما نہیں سکتا

یہ کس کے عجزِ تمنا کا پاس ہے کہ وہ شوخ
بہ زعمِ ناز بھی دامن چھڑا نہیں سکتا

اگرچہ میں ہمہ تن درد ہوں مگر حسرت
کوئی جو پوچھے کہاں ہے، بتا نہیں سکتا

رونقِ دل یوں بڑھا لی جائے گی
غم کی اِک دُنیا بسا لی جائے گی

دل نہ توڑو حسرتِ ناکام کا
زلف تو پھر بھی بنا لی جائے گی

چھوڑ کر اس بتِ بدخو کی محبت حسرت
کہتے ہو کھا کے قسم کچھ بھی تمھیں غم نہ ہوا

خود فراموشیوں میں بھی تو ہمیں،
بھول جانا کسی کا یاد رہا،

بدگماں آپ ہیں کیوں آپ کا شکوا ہے کسے
جو شکایت ہے ہمیں گردشِ ایام سے ہے

پیمانِ وفا کے ایفا کا ہم ان سے تقاضا بھول گئے
اس کا بھی تو اب احساس نہیں کیا یاد رہا کیا بھول گئے

جملہ ۱۴ اشعار

میزان کل — ۶۴۲ اشعار

ملاحظات

(نیاز فتحپوری)

مولانا حسرت کی رحلت کے بعد مجھے خیال پیدا ہوا کہ اگر حسرت اکاڈیمی کے نام سے ایک ادارہ قایم کرکے مرحوم کی ادبی خدمات کو صدقۂ جاریہ کی صورت دیدی جائے تو یہ ان کی بڑی موزوں یادگار ہوگی، لیکن اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ مرحوم کا کتب خانہ حاصل کیا جائے اور جو بیش قیمت ذخیرہ انھوں نے اساتذۂ قدیم کے دواوین، اخبارات کے تراشوں، اکابر علم و ادب کے خطوط اور اپنی ڈائری کی صورت میں چھوڑا ہے، اسے محفوظ کرلیا جائے

مولانا جمال میاں فرنگی محلی سے ذکر آیا تو انھوں نے فرمایا کہ مرحوم کے کتب خانہ کی حفاظت کا انتظام کر دیا گیا ہے اور بہت جلد اسے لکھنؤ منتقل کردیا جائے گا - یہ سن کر بڑا اطمینان ہوا اور حسرت اکاڈیمی کے قیام کی تجویز میرے ذہن میں زیادہ مستحکم ہوگئی، لیکن بدقسمتی سے جمال میاں کو اس دوران میں اپنی ذاتی ضروریات کی وجہ سے لکھنؤ چھوڑنا پڑا اور وہ غالباً اب تک واپس تشریف نہیں لائے اس لئے لائبریری کی منتقلی ابھی تک عمل میں نہیں آسکی

میں نے سوچا کہ جب تک لائبریری یہاں منتقل ہو اور حسرت اکاڈیمی وجود میں آئے انفرادی حیثیت سے کچھ نہ کچھ کام شروع کردینا چاہئے اور یہی خیال نگار کے حسرت نمبر شایع کرنے کا باعث ہوا - میں نے اس کا ذکر پروفیسر آل احمد سرور سے کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ وہ خود بھی انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالہ "اُردو ادب" کی ایک اشاعت (ماہ اکتوبر) حسرت کے لئے وقف کرنا چاہتے ہیں، یہ معلوم کرکے میں نے سالنامۂ نگار کی نوعیت کو بدل دینا چاہا اور حسرت کے خاص خاص مقالات فراہم کرکے انھیں سالنامہ کی صورت میں شایع کرنے کا خیال ذہن میں آیا ——— لیکن جب بعد کو معلوم ہوا کہ "اردو ادب" کے حسرت نمبر کی اشاعت غالباً جلد نہ ہوسکے گی تو میں نے پھر اپنا خیال بدل دیا اور یہی مناسب سمجھا کہ حسرت کی شخصیت اور ان کی شاعری پر ملک کے اکابر نقد و ادب کے مقالات شایع کئے جائیں اور میں حد درجہ شکر گزار ہوں تمام ان احباب کا جنھوں نے میرے اس ارادہ کی تکمیل میں میری اعانت فرمائی اور میں سالنامہ کی اشاعت کے قابل ہوسکا

سالنامہ کے مقالات سے آپ کو معلوم ہوگا کہ حسرت کی ذاتی خصوصیات، یعنی ان کے ارادہ کی مضبوطی اور اخلاقی بلندی کا سب کو اعتراف ہے، لیکن ان کے مرتبۂ شاعری کے متعلق البتہ تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے، یعنی ہرچند ان کی شاعرانہ صداقت سے تو کسی کو انکار نہیں اور ان کی عاشقانہ شاعری کے بھی سب معترف ہیں، لیکن یہ امر کہ حسرت کو کس درجہ کا شاعر قرار دیا جائے اور انھیں کس صف میں رکھا جائے البتہ مختلف فیہ ہے

اس باب میں سب سے زیادہ کھلی ہوئی بحث جناب خلیل الرحمان اعظمی نے کی ہے - وہ حسرت کو اچھا شاعر تو

کہتے ہیں لیکن بڑا شاعر نہیں سمجھتے، کیونکہ ان کے نزدیک حسرت کی شاعری نہ مفکرانہ قسم کی ہے اور نہ اس میں وہ ضبط پایا جاتا ہے جو شاعر میں زندگی کا ادراک پیدا کرتا ہے۔ اعظمی صاحب کی رائے میں وہ محض ہیجانی شاعر تھے اور شباب کے ہیجان کے ساتھ ہی ان کی شاعری بھی ختم ہوگئی

میں اعظمی صاحب کے اس بیان سے بالکل متفق ہوں اور میں نے بھی اپنے مضمون میں اس بات کو ظاہر کیا ہے کہ ان کی شاعری شباب کی شاعری تھی جو شباب ہی کے ساتھ رخصت ہوگئی، لیکن حسرت کی بخشی ہوئی اس "دولتِ مستعجل" کو بھی میں بڑا بیش بہا سرمایہ قرار دیتا ہوں، کیونکہ میری رائے میں شاعرانہ عظمت حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کسی شاعر کا کلام انحطاط پذیر نہ ہو بلکہ اصل چیز اس کی صداقت ہے اور ایک جذباتی شاعر کی صداقت کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ ہم اس کے اشعار سے اس کے جذبات کے عروج و زوال کی تاریخ مرتب کرسکیں — ہاں، اس سلسلہ میں حسرت سے ایک غلطی ضرور ہوئی (اور اس غلطی سے شاید کوئی شاعر نہیں بچ سکا ہے) وہ یہ کہ انھوں نے شعر کہنا اخیر وقت تک ترک نہیں کیا اور اپنی جیتی جاگتی شاعری کے ساتھ (جس کی عمر ۱۹۲۲ء میں ختم ہوچکی تھی) اپنی "دلے برندش" قسم کی شاعری کو بھی شامل کردیا

حسرت ایک مخصوص رنگ کے غزل گو شاعر تھے اور اسی رنگ کو سامنے رکھ کر ان کے مرتبۂ شاعری پر حکم لگانا چاہئے۔ اعظمی صاحب نے اس سلسلہ میں اقبال کا ذکر بالکل بے محل کیا ہے کیونکہ اقبال کی عظمت کا تعلق تغزل سے مطلق نہ تھا، البتہ میر، مصحفی و غالب کا سوال ضرور سامنے آتا ہے، سو ان میں بھی میر و غالب کو علحدہ کر دینا چاہئے، کیونکہ حسرت کا رنگ ان دونوں سے مختلف تھا۔ مصحفی کا رنگ بیشک حسرت کے یہاں پایا جاتا ہے اور اگر دونوں کا تقابل کیا جائے تو ہم یقیناً مصحفی کو بہتر شاعر قرار دیں گے، لیکن یہ بات شاید حسرت کو بڑا شاعر سمجھنے کے منافی نہیں، کیونکہ اگر اس فرق و امتیاز کے لئے کوئی اصطلاح وضع کرنا ضروری ہو تو بھی حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہم میر، غالب و مصحفی کو بڑا شاعر کہہ کر ان کے حقیقی مرتبہ کو ظاہر نہیں کرسکتے اسی طرح حسرت کو محض اچھا شاعر کہہ کر خاموش ہوجانا ان کے دونِ مرتبت ہے

اعظمی صاحب ہمارے نوجوان نقادوں میں بڑی سلجھی ہوئی طبیعت رکھتے ہیں اور قدرت کی طرف سے انھیں غیر معمولی سوجھ بوجھ ملی ہے، لیکن بدقسمتی سے زمانہ نے انھیں شباب کو شباب کی طرح گزرنے کا زیادہ موقع نہیں دیا اور "موسمِ دیر غنودن" کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے سے قبل ہی ان کو "عقلِ بیدار" دیدی گئی، ورنہ شاید وہ سمجھ سکتے کہ زندگی ہر وقت چہرہ پر شکن ڈالے رکھنے اور ہر وقت بقراط بنے رہنے کا نام نہیں ہے، بلکہ جس چیز کو وہ "زندگی" کہتے ہیں اس میں وہ لمحاتِ حیات میں بھی شامل ہیں جب بڑے سے بڑے مفکر کو اپنے دماغی اعصاب کے سکون کے لئے آسمان سے اتر کر زمین پر آنا پڑتا ہے اور اسی وقت اس کا پتہ چلتا ہے کہ زندگی کی کچھ پرلطف و بامزہ حقیقتیں ایسی بھی ہیں جو یاسیات سے جدا رہنے کے بعد ہی سمجھی جاسکتی ہیں اور یہی وہ حقیقتیں ہیں جو حسرت کی شاعری کی جان ہیں اور

"شانِ ماضی بھی، گرانمایگیٔ مستقبل بھی!"

حسرت کی غزل

پروفیسر مجنوں گورکھپوری

اُردو میں کہاں ہے اور حسرت
یہ طرزِ نظیری و فغانی

اُنیسویں صدی کا آخری حصّہ اور بیسویں صدی کے پہلے دس سال ہندوستان کی تمدنی تاریخ میں بڑی سنگین اہمیت رکھتے ہیں۔ یہاں تو غیر ملکی حکومت و اقتدار کے خلاف اور ملکی آزادی اور خود مختاری کے لئے جدوجہد کی ابتدا اس اندھا دھند سرفروشانہ کوشش سے ہوتی ہے جسکو برطانوی سامراج نے غدر یا بدعملی کہکر دنیا کی تاریخ میں بدنام کیا۔ لیکن ہمارے جذبۂ وطنیت اور حوصلۂ آزادی کو استحکام انھیں پچیس برسوں کے اندر حاصل ہوا جن کا ابھی حوالہ دیا گیا ہے — غدر کے خام اور بدانجام ہنگامے میں پسپا و غارت ہونے کے بعد ہم نے اپنی توانائیوں کا جائزہ انھیں چند سالوں میں لیا اور ہمارے اندر جدید سیاسی شعور کی باضابطہ تربیت انھیں دنوں میں شروع ہوئی۔ ہم نے آزادی حاصل کرنے کے لئے دستوری یا قانونی طریقہ اسی زمانہ میں اختیار کیا۔ اور بغاوتوں اور تہ خانوں کی سازشوں کو چھوڑکر جتنی پُرامن تدریجی اصلاحی تحریکیں ہوئی ہیں سب اسی چوتھائی صدی کی یادگار ہیں۔ آریہ سماج - برہمو سماج - سرسید کی تحریک سب اسی عبوری دور کی پیداوار ہیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ اسی مدت کے اندر وجود میں آئیں اور ہم کو ایک انقباض کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ سب کچھ یا تو انگریزی تعلیم و تربیت کا اثر تھا یا براہ راست "گوری حکومت" کی دین جو یقیناً سیاسی دور اندیشی کی دلیل تھی۔ انگریزی حکومت کو گالیاں دیتے ہوئے بھی دعائیں دینا پڑتی ہیں کہ اس کی غلامی نے ہمارے اندر وطنیت اور قومیت کا جذبہ پیدا کیا

مجھ سے پوچھا جا سکتا ہے کہ میں حسرت کی شاعری پر تبصرہ کر رہا ہوں اس کے لئے غدر سے لیکر اس وقت تک تمام دفتر اُلٹنے کی کیا ضرورت ہے — سو یہ محض میرا خیال نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے کہ حسرت اور ان کی شاعری کو ملک کی تاریخی قوتوں اور تحریکوں سے الگ کرکے نہیں پیش کیا جا سکتا۔ شاید ہی کوئی معاشری تنظیم یا سیاسی تحریک ایسی ہو جس کو حسرت نے ملک کے حق میں صحت بخش نہ سمجھا ہو اور اس میں جی جان سے (مال کا سوال نہیں تھا) شریک نہ رہے ہوں۔ حسرت کی ذات ایک ہمہ گیر ذات تھی۔ وہ شاعر کے علاوہ بہت کچھ تھے اور جو کچھ وہ زندگی کی دوسری سمتوں میں تھے اس سے ان کی شاعری نے بھی نہایت گہرے اور مستقل اثرات قبول کئے، ان کی شاعری نے "چکی کی مشقت" کو ان کے لئے سرمایۂ رحمت بنایا اور "چکی کی مشقت" نے ان کی شاعری کے مزاج اور اس کی ہیئت کو متعین کیا۔ قید فرنگ میں حسرت نے پیٹھ پر جو کوڑے کھائے ہیں وہ ان کے تغزل کی تربیت اور تہذیب میں ترکیبی عناصر کی طرح داخل ہیں۔ حسرت کی غزل میں جو رچا ہوا سوز و گداز ہے وہ اس پرآشوب بغاوت کا محض ایک بدلا ہوا روپ ہے جس کا دوسری سمتوں میں وہ اس خطرناک بلند آہنگی کے ساتھ مظاہرہ کر رہے تھے۔ وہ گویا غالب کے اس مصرعہ کو برت کر دکھا رہے تھے :-

بحسرت مردن استغنائے قاتل را جواب است

جو شخص برطانوی سامراج کے سفاکانہ مظالم کو اس لذت کے ساتھ برداشت کر رہا ہو وہ معشوق کی جفاؤں اور عشق کی آزمائشوں کے مقابلہ میں کیا ہمت ہارتا۔ وہ دونوں سے ریاضتِ نفس اور تربیتِ کردار میں مدد لے رہا تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حسرت کی شاعری میں فراریت ہے وہ فرار کے نہ زندگی میں قائل تھے نہ شاعری میں اس اعتبار سے وہ ہندوستان کے مایۂ ناز اور شہرۂ آفاق شاعر ٹیگور سے بھی ممتاز نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ذوقِ جمال کو اپنے لئے پندار گزینی کا حیلہ نہیں بنایا۔ شاعری حسرت کے لئے کوئی ہاتھی دانت کا مینارہ نہیں تھی جس میں وہ ساری دنیا کے فتنہ و آشوب سے بھاگ کر امن و سکون

کے ساتھ مبتلا رہتے ــــ باوجود اس کے کہ وہ غزل کے شاعر تھے ان کی شاعری میں توازن اور سنجیدگی کے ساتھ انسانی زندگی کے آلام و محن کی کسک محسوس ہوتی ہے جو بڑا پاکیزہ انداز رکھتی ہے

حسرت کی شاعری کو سمجھنے اور اس کی صحیح قدر کو پرکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اُن کے زمانہ کے تمام میلانات و محرکات کو نگاہ میں رکھا جائے۔ یوں تو غدر اور غدر کے بعد جتنی اجتماعی اور معاشرتی قوتیں بروئے کار آئیں اور جتنی قانونی اور غیر قانونی تحریکیں اور شورشیں رونما ہوئیں وہ سب براہ راست یا بالواسطہ۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی حد تک ہندوستان کے ادبیات پر اثر انداز ہوئیں۔ لیکن جہاں تک خصوصیت کے ساتھ اُردو ادب کا تعلق ہے ان تمام نئے اسباب و محرکات میں سب سے زیادہ موثر قوت سرسید کی اصلاحی تحریک تھی۔ سرسید اور ان کی تحریک پر دوسرے اعتبارات سے جو اعتراضات بھی کئے جائیں۔ مخالفین کو اس میں جو بھی کمزوریاں نظر آئیں لیکن اُردو زبان اور ادب کے حق میں وہ بہت مبارک ثابت ہوئی جس کا اعتراف بہرحال کرنا پڑے گا اُردو ادب کو خواب و خیال کی دُنیا سے نکال کر زندہ حقایق اور واقعات کی دنیا میں سرسید ہی کی تحریک لائی ۔ سرسید سے ہماری زبان اور ادب میں نیا شعور پیدا ہوا۔ یہ سرسید ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اُردو ادب جو اس وقت تک صرف دواوین اور خیالی داستانوں کا ایک دفتر بے معنی تھی چند سالوں کے اندر "آب حیات"۔ "نیرنگ خیال"۔ "دربار اکبری"۔ "مقدمہ شعر و شاعری"۔ "حیات سعدی"۔ "یادگار غالب"۔ "مسدس حالی"۔ "مناجات بیوہ" "حب وطن" جیسے شاہکار لے کر ہمارے سامنے آسکا۔ ادب کی کون سی اہم اور مستند صنف ایسی ہے جس کے قابل قدر نمونے اُردو نے اس تھوڑی سی مدت میں نہ پیش کئے ہوں۔ تاریخ۔ سیرت ۔ ادبی تنقید۔ مقالات۔ ناول اور اخلاقی، معاشرتی، تاریخی اور منظری نظمیں۔ غرضکہ نظم و نثر کے جملہ اقسام کے بہترین کارناموں کو دیکھتے دیکھتے اُردو میں معتدبہ ذخیرہ تیار ہوگیا۔ آزاد ۔ حالی ۔ نذیر احمد۔ شبلی اور خود سرسید نے اُردو کو اس قابل بنا دیا کہ وہ دوسری مائل بہ ترقی زبانوں سے آنکھیں چار کرسکے

سرسید کی تحریک ایک افادی اور اصلاحی تحریک تھی اور اس نے اُردو ادب کو زندگی سے قریب لانے میں ہماری بڑی مدد کی۔ آج ہم کو اُردو ادب میں جو ترقی پسندی کا ایسا غالب اور کامیاب میلان نظر آرہا ہے وہ محض ایک تاریخی سلسلہ ہے تحریک سرسید کا۔ لیکن اس تحریک نے اُردو ادب کی ایک صنف کی طرف ایسی بے اعتنائی برتی جس کو کسی طرح معاف نہیں کیا جاسکتا۔ میری مراد غزل سے ہے۔ سرسید خود نہ شاعر تھے نہ انشا پرداز اس لئے اگر وہ غزل کی اہمیت کو نہ سمجھ سکے اور اپنی مغفرت کے لئے اس کو کافی سمجھا کہ انھوں نے حالی جیسے غزل گو شاعر سے "مسدس" لکھوائی تو ہم ان کو معذور سمجھتے ہیں۔ لیکن خود حالی جو سرسید کی زد میں آنے سے پہلے ایسے کھرے غزل گو تھے غزل کی عنصری توانائیوں کا صحیح اندازہ نہ کرسکے اور "پیروی مغربی" کی دھن میں "اقتدائے مصحفی و میر" سے بیزار رہے۔ یہ اُردو شاعری کی تاریخ میں بڑا افسوسناک واقعہ ہے۔ سرسید اور حالی نے یہ نہ سمجھا کہ غزل کا ہر شعر کہاوت بن جانے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے ــــــــــ اور غزل کے ایک ایک شعر میں عوام کو زندگی کا ایک نیا نصاب دیا جاسکتا ہے اور پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُردو غزل اس زمانہ میں کس قدر رو بہ انحطاط تھی تو حالی جیسے شاعر کی غزل کی طرف سے یہ بے التفاتی کسی طرح قابل درگزر نہیں معلوم ہوتی۔ مختصر یہ کہ سرسید کی تحریک نے اُردو غزل کو از سر نو زندہ کرنے میں ہماری بہت کم مدد کی ۔ اور حالی جیسے غزل گو کے ہوتے ہوئے بھی اُردو غزل جہاں کی تہاں رہ گئی۔ حالی پر ایک "پیر دیرینہ سال" کا رعب کچھ ایسا چھایا کہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ "بلبل کی ہمزبانی" چھوڑ کر وہ چمن والوں کو کیسا نقصان پہونچا رہے ہیں۔ اس راز کو شاید حسرت نے سمجھا اور انھوں نے جس طرح اپنی زندگی ایک طرف آزادی کی جد و جہد کے لئے وقف کر دی اسی طرح دوسری طرف اُردو غزل کی تہذیب و تحسین کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔ انھوں نے چھوٹے بڑے اُردو غزل کے اساتذہ کے جو انتخابات اُردوئے معلےٰ میں شایع کئے وہ بھی اسی نصب العین کا ایک لازمی جزو ہیں اگر حسرت خود شاعر نہ ہوتے اور انھوں نے صرف ان اساتذہ کے انتخابات شایع کردئے ہوتے تو بھی وہ ایک تاریخی شخصیت ہوتے۔ لیکن حسرت اپنی انگلیوں کے ایک ایک پور تک شاعر تھے اور ان سے اُردو غزل کا نشاۃ ثانیہ شروع ہوا۔ انھوں نے نہ صرف غزل کو از سر نو زندہ کیا اور اس کو اس کی کھوئی ہوئی آبرو واپس دی بلکہ اس کو ایک نیا وقار بخشا۔ حسرت کی غزل کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس زمانہ میں جس معیار کی غزل رائج اور مقبول تھی اس پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے

سرسید اور ان کے رفیقوں نے اُردو ادب کو یہ کر کہ فلاح و ترقی کی نئی منزلوں سے آگاہ کرنے اور نئے راستوں پر لگانے میں جو ان تھک کوشش کی

لیں اور اُردو نظم و نثر کے کم و بیش جملہ اصناف پر ان کوششوں کا جیسا مستقل اثر پڑا اس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن اب بھی ہماری پرانی وضعداریاں اور روایتی تصورات و اسالیب کے ساتھ ہماری اُلفت نہ صرف باقی تھی بلکہ ترقی کی ہر کوشش میں رخنے پیدا کر رہی تھی۔ اور جہاں تک اُردو غزل کا تعلق ہے یہ روایت پرستی اور قدامت پسندی سب سے زیادہ خطرناک نظر آ رہی تھی۔ غزل کا روایتی تصور اپنی منطقی حد سے گزر کر انحطاط کی طرف مایل تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُردو غزل کو جو کچھ کرنا تھا کر چکی اور اس کے مقدر اور مقصد کی تکمیل ہو چکی۔ اب نہ اس کے لئے نئی راہیں کھل سکتی ہیں اور نہ وہ کوئی نیا موڑ اختیار کر سکتی ہے۔ شاعری کی وہ صنف جس کو نظم جدید کہتے ہیں اور جس کی بنیاد حالی، آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی کے ہاتھوں پڑی وہ مسلسل ترقی کر رہی تھی اور اس کے اندر روز بروز نئی وسعتیں اور نئے امکانات پیدا ہو رہے تھے۔ سرور جہاں آبادی، اقبال اور چکبست جیسے شاعر اُردو شاعری کو نئے نمونے دے رہے تھے اور نئی روشنی میں تعلیم و تربیت پائے ہوئے نئے نوجوانوں کی عام رغبت نظم ہی کی طرف تھی۔ لیکن ہم کو غزل کا چسکا لگا تھا اور ہمارا عام میلان غزل ہی کی طرف تھا۔ عوام کی تشفی غزل ہی سے ہو رہی تھی اور غزل بھی وہ غزل جس کی امامت امیر اور داغ کے ہاتھوں میں تھی۔ امیر، داغ اور ان کے شاگرد انحطاطی غزل سرائی کی آخری کڑی تھے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے ہم ان کو ایک ردعمل ماننے کے لئے مجبور ہیں۔ ان سے پہلے غالب اور مومن کی پیچیدہ خیالیوں اور مشکل گوئیوں اور ناسخ اور ان کے مدرسہ کی شاعرانہ بنوٹ سے ہم اُکتا سے گئے تھے اور جاہل یا نیم تعلیم یافتہ طبقہ ان کو بالکل اپنے سے غیر مانوس پاتا تھا۔ اس لئے جب داغ کی عشقیہ واقعیت اور امیر کی پر تکلف عمومیت نے جس کا تعلق جذبات کی اصلیت سے زیادہ زبان اور محاورات کی سلاست اور عام فہمی سے تھا سستے قسم کی لذت پرستی اور خوش باشی کے سامان بہم پہونچانا شروع کیا تو ہم نے ان کو اپنے سے بہت قریب پایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ یوروپ کی پہلی جنگ عظیم کے کئی سال بعد تک نہ صرف مشاعروں بلکہ منتخب صحبتوں میں جس قسم کی غزل پر سر دھنا جا رہا تھا وہ وہی تھی جو دربار داغ و امیر سے سند لے کر نکلی ہو۔

اس ادنیٰ درجہ کی سطحی عیش کوشی اور لذت پرستی کی لے بڑھتے بڑھتے بہت بڑھ گئی تھی۔ امیر اور داغ اور ان کے چیلوں کا جم غفیر ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک چھایا ہوا تھا۔ نئی نسل زیادہ تر نظم کی طرف مایل تھی اور اس میں شک نہیں کہ حالی اور آزاد کی سرکردگی میں نظم نگاروں کی ایک جماعت پیدا ہو چکی تھی جس کے اکتسابات شعری واقعی قابل قدر تھے۔ لیکن حالی کی صلاح و ترغیب کے باوجود غزل کی اصلاح و ترقی کی طرف کسی کا دھیان نہیں جا رہا تھا اور ہم کو کسی طرف سے امید نہ تھی کہ اُردو غزل سنبھالا تو خیر کیا کوئی نئی کروٹ بھی لے گی۔ یکایک ہمارے کان غزل کی ایک نئی آواز سنتے ہیں جو ہر لحاظ سے نئی تھی مگر کسی اعتبار سے بھی اس کو بدعت یا بدراہی نہیں کہہ سکتے۔ یہ حسرت کی آواز تھی

خیال کیجئے کہ اُردو غزل میں اس وقت جس قسم کے شعر کہنے اور سننے کے لوگ خوگر تھے اس کا تعلق ایک عیار، حیلہ ساز اور دغاباز معشوق کے عامیانہ اور بازاری حرکات و سکنات سے تھا یا پھر اس میں عاشق کی ہوسکارانہ دلباختگیوں کا بے حجابی کے ساتھ بیان ہوتا تھا ہم عاشق کی زبان سے اس قسم کی باتیں سننے لگے تھے:۔

گرے ہوتے اُلجھ کر آستاں سے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

ہمیں جھوٹے ہیں دغاباز ہمیں ہیں صاحب
ہم ستم کرتے ہیں اور آپ کرم کرتے ہیں۔

صحبت غیر کے ظاہر ہیں اثر آنکھوں پر
مہربان آپ کی خفت مرے سر آنکھوں پر

آج کل میں داغ ہو گے کامیاب
کیوں مرے جاتے ہو دو دن کے لئے

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنا ہے ایک کمسن کے لئے

یہ اُٹھنا بیٹھنا محفل میں اُن کا رنگ لائے گا
قیامت ہو کے اُٹھیں گے بھبوکا بن کے بیٹھے ہیں

چھپا چھپا کے نظر باز یاں ہوں غیروں سے
ہمیں سے آنکھ چرانا ذرا ادھر دیکھو

اس شان سے وہ برق وش آتا ہے ادھر آج
گلنار دوپٹے سے بھی اُڑتے ہیں شرارے

امیر اتنا نہ چھیڑ اس کو سرِ شام
کہ شب بھر پیار کرنے کو پڑی ہے

وہ پھول والوں کا میلہ وہ سیر یاد ہے داغ
وہ روز جھرنے پہ جگھٹ پری جمالوں کا

گدگدایا جو انھیں نام کسی کا لے کر
مسکرانے لگے وہ منہ پہ دوپٹہ لے کر

اور کچھ ہی دنوں کے اندر یہ لے وصل کرا دہی بھی باک ہو گئی اور بغیر کسی قسم کی جھجک کے سر محفل ایسے اشعار میں مزہ آنے لگا:-

عید کا دن ہے پری زاد ہیں سارے گھر میں
زیب زر کا اکھاڑہ ہے ہمارے گھر میں

پردہ اٹھا کے مجھ سے ملاقات بھی نہ کی
رخصت کے پان بھیج دئے بات بھی نہ کی

صبح کو آئے ہو بھولے شام کے
جاؤ بھی اب تم رہے کس کام کے

ہاتھا پائی سے یہی مطلب بھی تھا
کوئی منہ چومے کلائی تھام کے

جو کونچ الجھی بالے کی جھنجھلا کے بولے
لگے پیار کو آگ ابھی کان دابتا

وصل کی رات چلی ایک نہ شوخی ان کی
کچھ نہ بن آئی تو چٹکی سے کہا مان گئے

پان بن بن کے مری جان کہاں جاتے ہیں
یہ مرے قتل کے سامان کہاں جاتے ہیں

ایک ہمارے لئے دربان ہیں نگہباں ہیں حفیظ
اور جو چاہے وہاں شوق سے جائے آئے

کیوں مجھ سے ہے بہ منت کی تکرار کیا ہوا
اچھا جو میں نے کر ہی لیا پیار کیا ہوا

اور پھر ہم ان اشعار کو کیا سمجھیں:-

جب وہ باہیں گلے کا ہار نہیں
دور کا پیار کوئی پیار نہیں

وہ ایک ہم کہ جو چاہا کیا وصال کی رات
وہ ایک تم کہ تمہاری حیا سے کچھ نہ ہوا

مضطر اس بیوفا سے الفت کی
ارے میاں جاؤ یار کچھ نہ کیا

تم نے نازک بوسہ پہ مضطر دل مضطر بیچا
یار ایماں کی یہ ہے کہ بڑے دام لئے

کہتے ہیں وصل میں تم چھیڑے ہی جاتے ہو مجھے
گالیاں کچھ ابھی پڑ جائیں تو کیا بات رہے

کسی سے وصل میں سنتے ہی جان سوکھ گئی
چلو ہٹو بھی ہماری زبان سوکھ گئی

آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

چلے ہیں غیر کیا کیا وہ جو خلوت سے مرے نکلے
پریشاں باندھ کر جوڑا دوپٹہ اوڑھ کر الٹا

چھیڑ دینا تھا کہ پھر مار بھی دشناموں کی
ایک صیغہ تھا کہ فرفر اسے گردان گئے

یہ دوسری یا تیسری صف کے شعرا کا کلام نہیں ہے۔ یہ مسلم الثبوت مشاہیر کے اشعار ہیں جن کو اردو شاعری کی تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی کیونکہ ان کی کوششوں نے زبان کو سلیس و عام فہم بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے امیر و داغ نے اردو زبان کی جمہوریت کو مستحکم بنایا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جہاں تک نفس شاعری کا تعلق ہے اس میں رکاکت، ابتذال اور پستی کی نے بھی انھیں بزرگوں کے دم سے بڑھی۔ سوچنے کی بات ہے کہ امیر جیسا فاضل اور درویش بھی اس قسم کے رکیک اور تبذل مضامین باندھنا کمال شاعری اور اپنے لئے باعث فخر سمجھتا تھا۔ ایسے عالم میں جب ہم حسرتؔ کی زبان سے یہ اشعار سنتے ہیں تو ہمارے اندر ایک نئی لہر دوڑ جاتی ہے اور ہم چونک پڑتے ہیں، ہم کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کہیں سے اردو غزل میں نئی توانائی آگئی ہے اور اب اس نے ایک نئی اور خوشتر آئندہ سمت میں قدم اٹھایا ہے:-

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترک الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

جان کو صبر ہے نہ دل کو ہے تاب
تو نہیں ہے تو زندگی ہے خراب

لطف جاناں ہے جور کی تمہید
دیکھ حسرت نہ کھا فریب سراب

آرزو تیری برقرار رہے
دل کا کیا ہے رہا رہا نہ رہا

آپ کو اب ہوئی ہے قدر وفا
جبکہ میں لائق جفا نہ رہا

آپ کا شوق بھی تو اب دل میں
آپ کی یاد کے سوا نہ رہا

وصل میں بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہے حسرت
ان سے ملکر بھی نہ اظہار تمنا کرنا

شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی
ورنہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں

حال کھل جائے گا بیتابی دل کا حسرت
بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

یا ہماری ہی یہ قسمت ہے کہ محروم ہیں ہم
یا مگر ان کی محبت کا نتیجہ ہے یہی

مجھ کو اتنا ہی تم سے اُنس بڑھا
جس قدر تم کو اجتناب ہوا

ان اشعار میں نہ تو کوئی خیال آفرینی ہے نہ کسی طرح کی فنی جدت طرازی پھر بھی معشوق کی ایک بے نام ادا کی طرح وہ ہمارے اندر ایک نیا تاثر پیدا کرتے ہیں اور ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ اُردو غزل میں ایک نئے لے چھیڑی گئی ہے جو نئی ہوتے ہوئے بھی بڑی پختہ اور گمبھیر ہے۔ حسرت کی آواز اپنی تمام ندرت اور تازگی کے باوجود اُردو غزل کی روایت عظمیٰ کی ایک ایسی جاندار یادگار ہے جو نئی نسل کے غزل سراؤں کے لئے نمونہ بنی۔ زندہ ماضی کسے کہتے ہیں ؟ ہم اپنی پُرانی میراث کو لے کر ترقی کے راستے میں نیا قدم کیسے اُٹھا سکتے ہیں ؟ اس سوال کا بہترین جواب جہاں تک غزل کا تعلق ہے حسرت کی شاعری ہے۔

میں نے اس سے پہلے کسی موقع پر حسرت کی شاعری کو انتخابی ([illegible]) شاعری بتایا تھا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے اساتذہ سے لیکر اس وقت تک شاید ہی کوئی دوسرا اُردو شاعر ایسا ہو جس نے سعدی دکنی سے لیکر ادنیٰ سے ادنیٰ ہمعصر شاعر تک کے کلام کا مطالعہ اس محنت اور دقتِ نظر کے ساتھ کیا ہو۔ یہی نہیں انھوں نے جس دوڑ دھوپ اور جن مشقتوں کے ساتھ اُردو شعرا کے دواوین حاصل کرکے اُردوئے معلےٰ میں انکے انتخابات شایع کئے وہ خود اپنی جگہ ایک یادگار کارنامہ ہے۔ اگر حسرت خود شاعر نہ ہوتے تو بھی ان انتخابات کی بدولت آج اُردو شاعری کی تاریخ میں ان کا نام زندہ رہتا —— آج بھی اگر حسرت کے شایع کئے ہوئے یہ انتخابات ہمارے سامنے نہ ہوں تو ہم نہ جانے کتنے چھوٹے بڑے اُردو شعرا کے ناموں اور ان کے اکتسابات سے ناواقف رہ جایئں۔ کسی کا کہنا ہے کہ جس کا کوئی ماضی نہیں وہ کسی مستقبل کا مستحق نہیں۔ اسلاف کی چھوڑی ہوئی میراث ہماری نئی زندگی کا سرمایہ کیسے اور کس حد تک بن سکتی ہے ؟ اس کا اندازہ کرنا ہو تو حسرت کے کلام کا مطالعہ کیجئے جو ایک مربوط مسلسل اور زندہ غزل کی تاریخ ہے۔ نئی نسل کے نوجوان شاعروں اور انشاپردازوں میں کہیں یہی ایک افسوسناک کمی نظر آتی ہے دو ایک کو چھوڑ کر نئے ادیبوں میں کوئی ایسا نہیں جس نے اُردو نظم و نثر کا مکمل تاریخی مطالعہ کیا ہو اور جب ہم ان پر اعتراض کرتے ہیں تو اکثر نئے لکھنے والے ترقی پسندی کی پناہ لیکر ماضی کے اکتسابات کو حرف غلط بتانے لگتے ہیں۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ زندگی اور ادب دونوں تاریخ ہیں۔ ماضی سے رشتہ توڑ کر نہ تو حال کوئی حیثیت رکھتا اور نہ مستقبل کے کوئی معنی ہوتے۔ اُردو ہی نہیں دُنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس میں کوئی ایسا شاعر بڑا شاعر مانا گیا ہو جو ادب الاساتذہ ([illegible]) میں کافی دستگاہ نہ رکھتا ہو۔ ہمارے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہے، چاہے جاہے وہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔ خیر یہ تو ضمنی بات تھی۔ اصل بحث حسرت کی شاعری سے تھی

حسرت اُردو شاعری کی ایک جیتی جاگتی تاریخ تھے۔ انھوں نے ہر صنف اور صنف کے شاعروں کا ذوق اور شغف کے ساتھ مطالعہ کیا تھا اور چونکہ وہ طبیعت کے بیحد شریف تھے اس لئے شاعروں عام اس سے کہ وہ قدیم عہد یا جدید یا بیچ کی دمعن کا ہو یا تیسری صف کا جو صالح اور قابل قبول عنصر پایا

اس کو اپنی شاعری کے خمیر میں سمو لیا۔ حسرت کی یہ ہمہ گیری اور یہ وسعت ذوق و نظر ان کی معمولی خصوصیت نہیں ہے۔ ماننا پڑتا ہے کہ حسرت نے اپنے نفس شعری کی تربیت اور تہذیب میں بڑی ریاضت سے کام لیا ہے جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ یوں تو حسرت شعوری یا غیر شعوری طور پر ان تمام قدیم و جدید شعرائے اردو سے متاثر اور مستفید ہوئے ہیں جن کا انھوں نے مطالعہ کیا ہے لیکن میر۔ مصحفی۔ غالب۔ مومن۔ اصغر علی خاں نسیم دہلوی اور خود اپنے استاد منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کی آواز ان کے کلام میں نہایت واضح اور نمایاں طور پر گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ حسرت کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے جن پر عوام کو ان گنائے ہوئے اساتذہ کے رنگ کا دھوکا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ دھوکا محض سطحی ہے اور اس کا تعلق اسلوب سے زیادہ ہے اور شعر کی اصلی مزاج سے کم۔ اصلی مزاج اور اندرونی کیفیت کے لحاظ سے حسرت کا ہر شعر چاہے وہ میر و درد کی یاد دلائے، چاہے غالب و مومن اور چاہے جرأت و مصحفی کی۔ اپنے اندر ایک شدید انفرادیت بھی رکھتا ہے جس کو ہم صرف حسرت سے منسوب کر سکتے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں جو ایک مسلسل غزل سے لئے گئے ہیں :-

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

میری تحریرِ ندامت کا نہ دیجئے کچھ جواب
دیکھ لیجئے اور تغافل آشنا ہو جائیے

مجھ سے تنہائی میں گر ملئے تو دیجئے گالیاں
اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جائیے

ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُر جفا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملئے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے

ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں
یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے

ہائے رے بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر
اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے

ان اشعار میں اور اسی قبیل کے بہت سے اشعار میں جو دردمندی اور خود گزاشتگی ہے وہ میر کا انداز لئے ہوئے ہے اور لب و لہجہ میں جو تیکھاپن ہے وہ جرأت اور جرأت سے زیادہ مومن کی شان ہے اور زبان میں جو ناقابلِ تحلیل داخلیت اور خارجیت کا امتزاج ہے وہ مصحفی کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن ان بظاہر مستعار خصوصیات کے ساتھ گھلی ملی ہوئی حسرت کی اپنی ایک انفرادی خصوصیت ہے جس کو الگ کر کے بتانا آسان نہیں۔ معشوق کے سامنے سراپا رضا و تسلیم ہو جانا حسرت کی بھی تعلیم ہے مگر وہ اپنی شخصیت اور اس کے وقار کو اس سپردگی اور بے خودی میں بھی قایم رکھتے ہیں اور عشق کی والہانہ سپردگی کی حرمت میں بھی خلل نہیں آنے دیتے۔ یہ دراصل جدید نفسیات کا ایک میلان ہے جس کو "اگلے وقتوں کے لوگوں" میں ڈھونڈنا بیکار ہے جو خاموش تیکھاپن ان کے کلام میں محسوس ہوتا ہے وہ مومن۔ جرأت اور داغ کا تیکھاپن تو خیر ایک طرف غالب کے طنز سے بھی زیادہ عارفانہ اور زیادہ باوقار ہے ——— حسرت کے طنز میں بھی ایک نرمی اور گداختگی ہوتی ہے۔ ان کو ایک طرف تو یہ احساس ہے کہ محبوب کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا عشق کا فطری تقاضا اور اصلی شیوہ ہے دوسری طرف ان کو یہ پندار ہے کہ جو ایسا کرتا ہے وہ کسی طرح محبوب سے کم قابلِ قدر اور لایقِ احترام نہیں۔ چند اشعار کے تیور ملاحظہ ہوں :-

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

ہم رضا شیوہ ہیں تاویلِ ستم خود کر لیں
کیا ہوا اُن سے اگر بات بنائی نہ گئی

تم جفا کار تھے کرم نہ کیا
میں وفا دار تھا خفا نہ ہوا

دل رہے گا جو اُن سے ملنا ہے
لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں

اب تو آتا ہے یہی جی میں کہ اے محوِ جفا
کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں

اک تم کہ وفا تم سے نہ ہوگی نہ ہوئی ہے
اک ہم کہ تقاضا نہ کیا ہے نہ کریں گے

ہشیار کہ اس پرسشِ پیہم کی نوازش
عشاقِ عکشش کو ہو سکا رہ نہ کر دے

ہم پر بھی مثل غیر ہیں کیوں مہربانیاں اے بدگماں یہ خوب نہیں بدگمانیاں

نئی بات شاید کوئی نہیں لیکن انداز اور لب و لہجہ کی انفرادیت کے ساتھ ان اشعار میں ایک بدلے ہوئے ذہنی میلان کا بھی پتہ چلتا ہے اور یہ دونوں حسرت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور حسرت خود جیسا کہ میں ایک اور سلسلہ میں کہہ چکا ہوں اپنے زمانہ کی نہایت کھری اور صالح پیداوار ہیں

حسرت سے اُردو شاعری میں نئے دور کی نئی نفسیات شروع ہوتی ہے۔ ان کی غزلیں پڑھ کر ہم کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اندر ایک نیا شعور جاگ رہا ہے۔ حسرت کی شاعری میں جو نئے انداز کی مجاہدانہ از خود رفتگی ہے اور اُن کے تیور اور ان کی آواز میں جو نئے قسم کی سرفروشانہ بے نیازی ہے وہ اس میلان کی صرف بدلی ہوئی ہیئتیں ہیں جو زندگی کے اور شعبوں میں خاصکر سیاسیات میں شروع ہو چکا تھا اور تیزی اور گرمی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ حسرت کے کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کو زندگی اور محبت کی تمام مشکلوں اور آزمائشوں پر عبور ہو چکا ہے اور اب اس کو کڑی سے کڑی منزل کا تصور خائف نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ اس نے "نفس مطمئنہ" کی کیمیا حاصل کر لی ہے۔ حسرت کے انداز اور ان کے لب و لہجہ میں نرمی، گھلاوٹ، خستگی کے ساتھ ساتھ خودداری اور اعتماد کا جو عنصر ہے وہ بالکل ان کا اپنا ہے جس سے پایا جاتا ہے کہ اس شخص کے لئے بڑی سے بڑی مصیبت اور نئی سے نئی افتاد کوئی قابل اعتنا بات نہیں ہو سکتی۔ جو شخص حکومت کے مظالم برداشت کر چکا ہو ظاہر ہے کہ معشوق کی جفاکاریاں یا غفلت شعاریاں اس کے حوصلے پست نہ کر سکتی تھیں بلکہ خلاف معمول ایسے مظالم اور مصائب حسرت کے دل میں زندگی کا نیا ولولہ پیدا کرتے ہیں اور وہ ان کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے ریشہ ریشہ میں بالیدگی کی ایک تازہ لہر محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے شاعر ہوتے ہوئے بھی وہ یاس پرست نہیں ہیں۔ ان کے لہجہ میں ایک رجائیت ہوتی ہے جو کبھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی اس جگہ پھر کچھ اشعار سنئے :۔

التفات یار تھا اک خواب آغاز وفا سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں
تیری بے صبری ہے حسرت خامکاری کی دلیل گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں،

جور پیہم نہ کرے شان توجہ پیدا دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

نہیں غم جیب و دامن کا مگر ہاں فکر ہے اتنی نہ اُٹھے گا مرے دست جنوں سے رنج بیکاری

کسی پر مٹ کے رہ جانا ہے حسرت ہمیں کیا کام عمر جاوداں سے

نہ سہی آپ جفا سے جو نہیں باز آتے جائیے جائیے اب ہم کو بھی اصرار نہیں

ان اشعار میں حسرت کا اصلی کردار جھلک رہا ہے جو جانبازانہ صداقت ان کی شخصیت کی ترکیب میں داخل ہے وہ ان کے اشعار میں بھی نمایاں ہے جو بغاوت کی حد تک بڑھا ہوا خلوص ان کی زندگی کا سب سے زیادہ اہم عنصر ہے وہی ان کی غزلوں کی جان ہے۔ حسرت کو کبھی ہمارے ملک کی انقلابی تاریخ بھلا نہیں سکتی اور نہ اُردو غزل کی تاریخ کبھی حسرت سے تجاہل برت سکتی ہے

اب ایک بار پھر میں حسرت کی شاعری کی اُس خصوصیت کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہوں جس کو میں نے انتخابیت کہا ہے —— حسرت کے کلیات میں ہر رنگ کے اشعار ملتے ہیں اور ان کے اکثر اشعار پر بادی النظر میں پُرانے اساتذہ کے رنگ کا دھوکا ہو سکتا ہے۔ ان میں کافی تعداد ایسے اشعار کی بھی ہے جن میں حسرت، حسرت نہیں اور جو یا تو اساتذہ کی تقلید میں صرف مشق و ریاضت کے لئے کہے گئے ہیں یا جن کا تعلق ان کے ذاتی عقائد سے ہے۔ بعض نقادوں نے انھیں پر حسرت کی تنقید کی بنیاد رکھی ہے۔ ایسا کرنا یا تو سراسر مغالطہ ہے یا بدنیتی۔ حسرت کے کلام میں ایسے اشعار کافی مل جائیں گے جو اولیاء و اصفیا کی خدمت میں بہ طور نذر عقیدت کے پیش کئے گئے ہیں۔ ان سے اُن کی شاعری کی نمایندگی نہیں ہوتی۔ پھر چونکہ حسرت، میر اور غالب سے لے کر امانت اور جان صاحب سب ہی کے معترف تھے اس لئے ان کے کلیات میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن کو ہم محض استادانہ تقلید کہہ سکتے ہیں اور جو حسرت کا اصلی رنگ ہرگز نہیں۔ میں ایسے اشعار کو مثال کے طور پر پیش کر کے اپنا وقت ضایع کرنا نہیں چاہتا

لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اور جیسا کہ خود حسرت نے اعتراف کیا ہے وہ دلی اور لکھنؤ کے اساتذہ میں سبھی سے مستفیض ہوئے ہیں اور سبھی کے اثرات اُن کے کلام کی اندرونی ترکیب میں عنصری حیثیت سے داخل ہیں۔ ان کے کلام کا ایک حصہ تو میر اور ان کے معاصرین کے معصومانہ تغزل کی

یاد دلاتا ہے۔ مثلاً :-

طعن اغیار سے سرزنش خلق سہی — ہم نے کیا کیا تری خاطر سے گوارا نہ کیا
جان کو صبر ہے نہ دل کو تاب — تو نہیں ہے تو زندگی ہے خراب
صبر مشکل ہے آرزو بیکار — کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں
شوق ان کا سو مٹ چکا حسرت — کیا کریں ہم اگر وفا نہ کریں
شکوہ سنج الم ہوئے حسرت — ستم یار کا ادب نہ کیا،
کٹ گئی احتیاط عشق میں عمر — ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا
ان سے کچھ تو ملا در غم ہی سہی — آبرو کچھ تو رہ گئی دل کی،
مرتا ہے کسی شوخ جفا کار پہ حسرت — شاید یہ فسانہ کہیں تم نے بھی سنا ہو
بغیر ان کے دم بھر نہیں چین دل کو — کبھی ان سے گویا جدائی نہ ہوگی
آنکھوں کو انتظار سے گردیدہ کر چلے — تم یہ تو خوب کا لب زیدہ کر چلے

میں نے ان اشعار کو میرؔ کے رنگ کے اشعار میں شمار کیا ہے۔ اس لئے کہ میرا خیال ہے کہ میرؔ بھی اس انداز کے شعر کہہ سکتے تھے۔ لیکن ان میں حسرتؔ کی اپنی شخصیت بھی اس طرح نمایاں ہے کہ کوئی صاحب شعور اس کو محسوس کئے ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح دوسرے اساتذہ کا رنگ بھی حسرتؔ کی غزلوں میں ملتا ہے مثلاً ذیل کے اشعار جن میں الفاظ کی بندش اور ترکیبوں کی تراش خراش پر مومنؔ۔ غالبؔ اور نسیمؔ دہلوی کا دھوکا ہو سکتا ہے :-

ازبسکہ ناز یار پہ مشکل عتاب تھا — جو کامیاب تھا وہی ناکامیاب تھا
مے دینا سے یاریاں نہ گئیں — میری پرہیزگاریاں نہ گئیں
شغل مے سے فلک جناب ہوا — کون کہتا ہے میں خراب ہوا
تسکین ہو سکی نہ دل ناشکیب کی — سب ہم پہ کھل گئیں تیری باتیں فریب کی
ملتے ہیں اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں — کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں،
گھبرا کے تغافل سے تمنا ہے ستم کی — حالت کوئی دیکھے ترے مجبور الم کی
سب سے شوخی ہے اک ہمیں سے حیا — اے فریب نگاہ یار یہ کیا،
انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار — ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی
ایک بار سنی تھی سو مرے دل میں ہے موجود — اے جان تمنا تری تقریر ابھی تک
کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں تری کج ادائیاں — اس درجہ اعتبار تمنا نہ چاہیے
گر جوش آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی — میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا
افزوں ہوئیں کچھ اور محبت کی شورشیں — تجدید آرزو جو ہوئی التوا کے بعد

ان کے علاوہ حسرتؔ کے یہاں اور نہ جانے کتنے اشعار ہیں جن پر مومنؔ اور غالبؔ اور ان کے دبستاں کے دوسرے شعرا کا دھوکا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ دھوکا ہی دھوکا ہے ورنہ صاحب نقد و نظر کے لئے ان اشعار میں خود حسرتؔ کی اپنی آواز کے ارتعاشات اس قدر غالب اور حاوی ہیں کہ دھوکے کی گنجایش نہیں۔ مومنؔ جب اس قسم کے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتے تھے تو ان کا مقصد زیادہ تر اپنی شاعرانہ جدت طرازیوں کا کرشمہ دکھانا ہوتا تھا اور وہ اپنے اشعار کو اکثر چیستاں بنا کر رکھ دیتے تھے اور غالبؔ کے اشعار محض چیستاں تو نہیں ہوتے لیکن ان کے الفاظ "گنجینۂ معنی" کا اچھا خاصا طلسم ضرور ہوتے ہیں جن پر عبور پانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ مگر حسرتؔ بیان اور الفاظ اور بندشوں کی نازگی کو قایم رکھتے ہوئے مضمون کی واقعیت اور موضوع کی عمومیت اور جامعیت کو ایک لمحہ کے لئے بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ جو اشعار ابھی سنائے گئے ہیں ان کو سمجھنے کے لئے تامل ضرور کرنا

پڑتا ہے مشقت یا ذہنی کاوش کرنا نہیں پڑتی۔ حسرت کا شاید ہی کوئی شعر ایسا ہو جو ایک اوسط درجہ کے پڑھے لکھے انسان کی سمجھ میں نہ آجائے اور جب ایک مرتبہ ہم ان کے شعر کے مفہوم کو سمجھ لیتے ہیں تو اس کو عام انسانی دنیا کے لئے قابلِ قبول پاتے ہیں۔ حسرت کی یہ ہمہ گیر انسانیت کم سے کم اُردو غزل میں ان کا اپنا ذاتی اکتساب ہے

حسرت کے کلام کا ایک جزو ایسا بھی ہے جو معاملہ بندی اور ادا بندی سے تعلق رکھتا ہے اور جس کی بنا پر بعض سطحی نظر رکھنے والوں کو حسرت محض تقلیدی شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے اسوقت کچھ ایسے حضرات یاد آرہے ہیں جو ایک سے زیادہ مرتبہ تحریر اور گفتگو میں اس خیال کا اظہار کر چکے ہیں کہ حسرت کی شاعری میں اُن کو نئی کیفیت نہیں ملتی۔ میں ان لوگوں سے حسرت کی طرف سے اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ :۔

"تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے"

لیکن حسرت کی شاعری کے ہر رخ کے بارے میں میری ایک رائے ہے جس کو ظاہر کئے ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ بات میں اچھی طرح واضح کر چکا ہوں کہ حسرت کی نظر میں ادبا لاساتذہ کی بڑی منزلت تھی۔ اور جو جس رنگ میں اور جس سطح سے لکھتا تھا اس کی قدر وہ اسی رنگ میں اور اسی سطح سے کرتے تھے۔ وہ میرؔ۔ غالبؔ اور مومنؔ کے بھی قایل تھے اور مصحفیؔ، انشاؔ، شاہ نصیرؔ، اور ذوقؔ کے بھی۔ وہ امیرؔ، داغؔ اور ان کے مقلدین مثلاً ریاضؔ خیرآبادی حفیظؔ جونپوری۔ نسیمؔ بھرتپوری اور جلیلؔ مانکپوری کی بھی داد دے رہے تھے اور حالیؔ۔ شیفتہؔ۔ اسمٰعیلؔ میرٹھی۔ اکبرؔ الہ آبادی کی عظمت کا بھی اعتراف کر رہے تھے۔ ایک طرف تو وہ اماؔنت۔ فصاحتؔ اور مضطرؔ خیرآبادی کی شاعری سے انکار نہیں کر سکتے تھے دوسری طرف وہ عزیزؔ۔ فانیؔ۔ جگرؔ اور اصغرؔ کے کلام کو اُردو شاعری میں ایک نئی برکت سمجھ کر اس کا خیر مقدم کر رہے تھے ایسا شخص جب خود شاعر ہو تو اس کے لئے انتخابیت ایک فطری بات ہوگی۔ لیکن میرا دعویٰ یہ ہے کہ حسرت نے ہر رنگ میں اور ہر سطح پر اپنی انفرادیت قایم رکھی ہے۔ وہ جس وقت مصحفیؔ۔ جرأتؔ اور داغؔ جیسے شاعروں کے رنگ میں بھی شعر کہتے ہیں تو وہ اپنے پیشروؤں اور ہمعصروں سے زیادہ مہذب زیادہ شایستہ اور زیادہ سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اور ان کے انداز بیان میں وہ دلنشینی ہوتی ہے جو صرف معصومیت سے پیدا ہو سکتی ہے۔ حسن وعشق کے معاملات یا محبوب کے حرکات وسکنات۔ اس کی وضع قطع یا اس کے سراپا اور اس کی اداؤں کا ذکر کرتے ہوئے حسرت محبوب کی حرمت اور عاشق کے وقار کے احساس کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ چند اشعار کو چھوڑ کر جن میں صرف شاعرانہ مہارت دکھانا مقصود ہے باقی اس عنوان کے جتنے اشعار ہیں ان میں حسرت نے اپنی سنجیدگی کو قایم رکھا ہے۔ اس سنجیدگی۔ اس شایستگی اس جذباتی متانت کا تعلق خیالات اور الفاظ سے زیادہ لب ولہجہ سے ہے اور جو لب ولہجہ کی درجہ بدرجہ نفاستوں اور نزاکتوں میں فرق محسوس کرنے کا ملکہ اپنے اندر نہیں رکھتا اس سے مجھے کچھ نہیں کہنا ہے اس لئے کہ وہ داغؔ اور امیرؔ کی سوقیت اور ابتذال اور حسرت کی فطری معصومیت اور خداداد آزادمنشی میں کوئی امتیاز محسوس نہیں کر سکتا۔ بہر حال میں اس موقع پر مثالیں دینے سے باز نہیں رہ سکتا:۔

آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

سر کہیں بال کہیں ہاتھ کہیں پاؤں کہیں
ان کا سونا بھی ہے کس شان کا سونا دیکھو

گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال
شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو

سامنے سب کے مناسب نہیں ہم پر یہ عتاب
سر سے ڈھل جائے نہ غصے میں دوپٹا دیکھو

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

دو پہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

چادر جو کہیں حسن رخِ یار سے سرکی
قابو میں طبیعت نہ رہی ذوقِ نظر کی

اپنے آپے میں نہیں شوق سے مارے گیسو
پھیلے جاتے ہیں رخِ یار پہ سارے گیسو

مائلِ شوق مجھے پاکے وہ بولے ہنس کر
دیکھو تم نے جو چھوئے آج ہمارے گیسو

یہ اشعار ایسے ہیں جو داغؔ۔ امیرؔ اور اماؔنت کوئی بھی کہہ سکتا تھا۔ لیکن اول ترلب ولہجہ میں بڑا نازک فرق ہے جس کو محسوس کرنے کے لئے بڑی نازک

صلاحیت درکار ہے۔ دوسرے ایک اس سے بھی زیادہ نازک بات ہے۔ حسرت کسی فطری صورت حال سے فطری لذت حاصل کرنے کی بڑی فطری صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ بڑے بیباک انسان تھے اور ان کے اندر کسی قسم کے نفسیاتی مصالح مزاحم نہیں تھے۔ وہ تمنا کی نظارہ بازی کو انسان کی فطرت معصوم کا ایک بہت معمولی تقاضا سمجھتے تھے اور وہ "حسن کی بے شعوری" یا باشعوری سے پورا مزہ حاصل کرنے کے لئے طیار تھے۔ وہ حسن کا بہت صحیح ذوق اپنے اندر رکھتے تھے اور ان کے لئے جسمانی اور غیرجسمانی کے درمیان کوئی تفاوت نہیں تھا۔ وہ افلاطون کی طرح خیر، حسن اور حقیقت کو ایک ہی سمجھتے تھے۔ یعنے وہ ایک کائناتی بصیرت رکھتے تھے اور وہ حسن کو بہرحال خلاق کائنات سمجھتے تھے۔ وہ اس راز سے واقف تھے کہ :-

ہزار نقش دریں کارگاہ درکار است		نگیر خورده نظیری همه نکو بستند

ایسا شخص ظاہر ہے جس قدر بھی وسیع المشرب ہو کم ہے لیکن پھر بھی مندرجۂ ذیل قسم کے اشعار حسرت کے شایان شان نہیں مگر پھر ایسے اشعار حسرت کی صحیح نمائندگی نہیں کرتے :-

حایل تھی بیچ میں جو رضائی تمام شب		اس غم میں ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

ایسے اشعار دیوان میں ردیفوں کی خانہ پری کرنے کے لئے کہے گئے ہیں یا قافیہ بندی کی غرض سے یا پھر بطور مشق کے جن کو حسرت کے اصلی مزاج شاعری سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسی طرح میں حسرت کے کلام کے اس حصہ کو بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتا جس کا تعلق اُن کے اپنے مذہبی اعتقادات و ارادات سے ہے اور جس کو بلاوجہ کلام حسرت کے انتخابات میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ حسرت نے یہ اشعار اس لئے ہرگز نہیں کہے کہ آپ ان کو پڑھیں اور ان کی شاعری کی داد دیں۔ حسرت نے ایک مرتبہ شاعری کی مختلف قسمیں بیان کی تھیں۔ لیکن وہ محض ایک ضمنی بات تھی۔ میرے سامنے انھوں نے شاعری کی تین قسمیں گنائی تھیں۔ عاشقانہ۔ عارفانہ اور فاسقانہ۔ پرنسپل عبدالشکور نے اپنے "حسرت موہانی" میں اس کے علاوہ بھی کئی قسمیں گنائی ہیں۔ لیکن میں نے خود حسرت سے کہہ دیا تھا کہ اب بھی کہتا ہوں کہ حسرت کے کلام کے عام تیور صرف عاشقانہ ہیں وہ صرف عاشقی اور شاعری کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ یہاں میں عاشقی کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ حسرت کی زندگی میں عشق "چکی کی مشقت" کی صورت اختیار کئے ہوئے تھا۔ غالب نے کہا تھا :-

"قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد		ہاں کچھ اک رنج گرانباری زنجیر بھی تھا"

اور حسرت بھی کہتے ہیں :-

"کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت		گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا"

غالب کا شعر محض تخیل ہے۔ حسرت کا شعر ایک نہایت شدید تجربہ ہے۔ حسرت نے بڑی وسیع المشرب اور ہمہ گیر طبیعت پائی تھی۔ اس لئے ان کے کلام میں رنگ اور طرز کا جیسا تنوع پایا جاتا ہے اس کی مثال کسی دوسرے اُردو شاعر کے کلام میں شاید ہی ملے۔ حسرت کے اشعار میں میر کی گھلاوٹ اور سوز و گداز درد کی خستگی اور برشتگی۔ غالب کی پُرتامل خلش اور کہیں کہیں ان کے بڑے بلیغ نفسیاتی اشارے، مومن کی واقفکارانہ رمز شناسی اور ان کی اور ان کے شاگرد رشید نسیم دہلوی کی رنگین اور پرمعنی بندشیں۔ مصحفی کی رچی ہوئی خارجیت جرأت اور داغ سے زیادہ تربیت یافتہ معاملہ بندی۔ سبھی کچھ سلیقہ اور قرینہ سے ساتھ ملے گی مگر انداز اور لہجہ میں ایک انفرادیت بہرصورت محسوس ہوگی۔ حسرت کا ہر شعر چاہے وہ اساتذہ میں کسی کے رنگ کی بھی یاد دلائے بہرحال حسرت کا اپنا شعر معلوم ہوتا ہے۔ حسرت کی اس وسیع المشربی نے ان کو زندگی اور ادب دونوں میں تھوڑا سا نقصان بھی پہونچایا ہے۔ مذاق شاعری کے اعتبار سے وہ بہت روادار تھے۔ ان کی فراخ دلی کا یہ عالم تھا کہ ہر سطح کے شاعر کو شاعر اور ہر قسم کے شعر کو شعر سمجھتے تھے اور اس سے اثر قبول کرتے تھے۔ یہیں تک ہوتا تو خیر کوئی مضایقہ نہ تھا۔ وہ خود بھی ایسے اشعار کہکر اپنے دیوان میں شامل کر لیتے تھے جو اُن کے اشعار نہیں معلوم ہوتے اور جن کو خواہ مخواہ کی بھرتی کہنا پڑتا ہے۔ اس قسم کے اشعار تعداد میں کم ہیں اور ان کو حسرت کے بہترین کارناموں میں شمار کرنا اور انھیں پر تنقید کی بنیاد رکھنا نقاد کا چھچھوراپن ہوگا۔ ایسے اشعار سے حسرت کی شاعرانہ حیثیت کو جو نقصان پہونچ سکتا ہے وہ ناقابل لحاظ ہے۔ اور پھر حسرت کی شاعرانہ حیثیت کو جو نقصان پہونچ سکتا ہے وہ ناقابل لحاظ ہے اور پھر حسرت زندگی کو نقصان اور فایدہ کے پیمانوں سے ناپتے کب تھے ؟ جس شخص کی زندگی کا بہترین حصہ انگریزوں کی قید اور اس کی اذیتوں میں گزرا ہو وہ نقصان اور فایدہ کیا جانے ؟ وہ تو بقول اقبال :- "برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی" — کا قایل تھا۔

اب میں اخیر میں حسرت کے کلام کا ایک انتخاب دینا چاہتا ہوں جس میں ہر رنگ کے اشعار شامل ہوں گے اور جس سے ارباب ذوق و نظر پر ظاہر ہو جائے گا کہ حسرت نے اُردو غزل کی قدیم روایت کا احترام کرتے ہوئے اور اس کو قائم رکھتے ہوئے اُردو غزل کو نئی جان اور نئی توانائی بخش دی:-

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا
ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

رو برو ان کے کچھ نہیں معلوم
کیا ہوا بیخودی میں کیا نہ ہوا

کون لاتا ترے عتاب کی تاب
خیر گزری کہ سامنا نہ ہوا

عشق حسرت کے سب ہوئے قایل
ایک وہ دشمنِ وفا نہ ہوا

شکوۂ جور، تقاضائے کرم، عرضِ وفا
تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دلنواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں،

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاریِ دل
التفات آپ کی نگاہوں نے دوبارا نہ کیا

گر یہی ہے ستمِ یار تو ہم نے حسرت
نہ کیا کچھ بھی جو دنیا سے کنارا نہ کیا

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا
آئینِ اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

دلِ بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت
نگہِ شوق نے کیا جانیے کیا دیکھا ہے

جس کی ذلت میں بھی عزت ہے سزا میں بھی مزا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ محبت کیا ہے،

دعوائے عاشقی ہے تو حسرت کرو نباہ
یہ کیا کہ ابتدا ہی میں گھبرا کے رہ گئے

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا
اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا

آہ کہنا وہ ترا پا کے مجھے گرمِ نظر
ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں

تماشے کی خوب نظارہ بازی
مزا دے گئی حسن کی بے شعوری

ہوسِ دید مٹی ہے نہ مٹے گی حسرت
دیکھنے کے لئے چاہو انھیں جتنا دیکھو

اثرِ حسنِ یار سے آخر
آ گئی عشق میں بھی رعنائی

پھر تازہ ہوا جوشِ جنوں فصلِ گل آئی
پھر شوق ہوا سلسلہ جنبانِ تمنا

تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے
تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

رائیگاں حسرت نہ جائے گا مرا مشتِ غبار
کچھ زمیں لے جائے گی کچھ آسماں لے جائیگا

بھول ہی جائیں ہم کو یہ تو نہ ہو
کوئی کہتا ہے وہ جفا نہ کریں

وہ بھی نہ حسرت کہیں دیدیں جواب
ایک انھیں کا ہے سہارا ہمیں،

لو وہ دامن چھڑا کے چل بھی دئے ۔۔۔ عاشقِ ناتواں سے کچھ نہ ہوا
ان کو جی بھر کے دیکھ بھی نہ سکا ۔۔۔ حسرتِ بدگماں سے کچھ نہ ہوا

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو ۔۔۔ لوگ میرے لئے دعا نہ کریں

عشق جب شکوہ سنجِ حسن ہوا ۔۔۔ التجا ہو گئی گلا نہ رہا

راضی برضا ہم ہیں بہرحال مگر ہاں ۔۔۔ ڈر ہے کہ یہ خو کو ستمگار نہ کر دے

نہ ملیں گے دل بیتاب کرے لاکھ اصرار ۔۔۔ ہم بھی جا اب تجھے اور عہد شکن بھول گئے

حسرت کے جتنے اشعار ان صفحات میں مثال کے طور پر درج کئے گئے ہیں اُن کو پڑھئے تو ان میں تمام اکابر شعرائے اُردو کے لطیف ترین عناصر کے ساتھ حسرت کی اپنی روح کھلی ہوئی ملے گی۔ حسرت کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اُردو شاعری میں مرکزی آمریت کو ختم کر دیا اور دلّی اور لکھنؤ کے مدرسوں کی زندہ اور صالح خصوصیتوں کو قبول کر کے اپنے کلام میں اس طرح جذب کر لیا کہ دونوں کا فرق باقی نہ رہا۔ اس طرح دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کا پُرانا جھگڑا جو کبھی بغض و عناد کی حد تک بڑھ جاتا تھا خود بخود مٹ گیا۔

اُردو زبان کے قدیم گلدستے

(حسرت موہانی)

اپنے تذکرے کے لئے دریافت حال و تلاش کلام شعرا کے سلسلہ میں اُردو زبان کے تقریباً کل مطبوعہ و غیر مطبوعہ دواوین اور تذکروں کے علاوہ ہم نے قدیم گلدستوں کی بھی اکثر جلدیں بہم پہونچائی ہیں۔ اپنے زمانۂ حیات میں یہ گلدستے اچھے سمجھے جاتے ہوں یا بُرے، کامیاب ہوں یا ناکام، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرور ایام نے ان میں سے ہر ایک کو بجائے خود تاریخی اور ادبی دلچسپیوں کا ایک ایسا مجموعہ بنا دیا ہے جس کا مطالعہ کسی حالت میں تضیع اوقات کا موجب نہیں ٹھہر تا ہمیں ہمارے خیال میں گزشتہ صدی عیسوی کے بعض مشہور گلدستوں کی مختصر کیفیت کا تفریح ناظرین کے لئے اُردوئے معلیٰ کے ہر پرچہ میں سلسلہ وار شایع ہونا خالی از لطف نہ ہوگا۔ گلدستوں کے نام بقید سنہ اجرا ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

۱ - گلدستۂ شعر ضمیمۂ انوار الاخبار لکھنؤ سنہ ۱۸۶۴ء
۲ - گلکدۂ ریاض خیرآباد سنہ ۱۸۶۹ء
۳ - نتیجۂ سخن کلکتہ سنہ ۸۲ء
۴ - پیامِ یار لکھنؤ سنہ ۸۳ء
۵ - تحفۂ عشاق لکھنؤ سنہ ۸۴ء
۶ - کرشمۂ دلبر خیرآباد سنہ ۸۵ء
۷ - ریاضِ سخن مرادآباد سنہ ۸۵ء
۸ - دامنِ گلچیں لکھنؤ سنہ ۸۵ء
۱۷ - فتنۂ عطر فتنہ سنہ ۸۵ء

۹ - نغمۂ بہار لکھنؤ سنہ ۸۶ء
۱۰ - گلدستۂ کیف اناؤ سنہ ۸۹ء
۱۱ - دامنِ بہار آگرہ سنہ ۹۲ء
۱۲ - گلچیں لکھنؤ سنہ ۹۳ء
۱۳ - انتخاب لکھنؤ سنہ ۹۳ء
۱۴ - تصویرِ عالم لکھنؤ سنہ ۹۶ء
۱۵ - ریاضِ سخن مارہرہ سنہ ۹۶ء
۱۶ - خدنگِ نظر لکھنؤ سنہ ۹۷ء
۱۸ - معیار لکھنؤ سنہ ۹۸ء

(اردوئے معلّیٰ نمبر ۱۱)

کچھ حسرت کے بارہ میں

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اُسکی ہے مشکل کشی جفا طلبی
(اقبالؔ)

حسرت نے شاعری اختیار کی۔ حسرت ہی تھے، اُن کا کوئی کیا کر سکتا تھا لیکن کوئی شاعری سے پوچھے کہ نیک بخت تجھے کیا پڑی تھی کہ تو نے حسرت کو اختیار کیا۔ حسرت اور غزل بڑی مشکل سے سمجھ میں آنے کی بات ہے۔ حسرت کی کونسی بات غزل سے مناسبت رکھتی تھی!

ایک دفعہ میں نے پوچھا کیوں حسرت صاحب۔ آپ کے شعر پڑھ پڑھ کر جو چاہے کسی کے معشوق پر قبضہ کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مولوی بھی ایسا کر سکتا ہے جو آپ کے اُن اشعار کو بھی پڑھنے سے باز نہ آئے گا جو اولیائے عظام کی شان میں آپ نے لکھے ہیں اور جن میں کہیں کہیں ردیف قافئے مصرعوں میں ناپ سے کچھ ہی کم لیکن تول میں یقیناً زیادہ ہیں اور وہ اس لئے کہ معشوق نہ ملا تو اولیائے کرام ہی مل جائیں گے لیکن یہ تو بتایئے ان اشعار سے آپ خود کسی معشوق پر قبضہ پا سکے یا نہیں اور پا سکے تو کتنے دنوں قبضہ "فاسقانہ" رہا اس کے بعد "عارفانہ" رہ گیا!

حسرت صاحب بچوں کی طرح کھل کھلا کر ہنس پڑے اور کہنے لگے بھئی آپ نے لطیفہ خوب کہا، خوب، بہت خوب!

حسرت کی غزلوں میں خواہ مخواہ کے کھیلے نہیں ملتے۔ وہ سسکتے بلکتے نہیں۔ نہ مرثیہ خوانی نہ حدی خوانی۔ نہ پیچ نہ خم نہ بیچ، نہ پینترے دکھاتے ہیں نہ پُراسرار بننے کی کوشش کرتے ہیں، نہ خود عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں نہ ہم کو ہونے دیتے ہیں۔ جذبات و تخیل کی بھی کچھ ایسی زیادہ کار فرمائی نہیں ہے شعر کہنے کے لئے نہ خود افیون، شراب یا بھنگ استعمال کرتے ہیں نہ ان کے اشعار ان چیزوں کے استعمال پر اصرار کرتے ہیں

حسرت کو زبان پر بڑا عبور ہے، غزل میں زبان کو بڑا دخل ہوتا بھی ہے۔ اس لئے کہ اُردو خود ایک بھرپور غزل ہے۔ غزل اور اُردو ایک دوسرے میں کچھ اس طرح من تو شدم تو من شدی ہو گئے ہیں کہ ہم غزل سنتے ہیں تو ہمارا ذہن بیک وقت موضوع، اسلوب، لہجہ اظہار و ابلاغ ہی کی طرف متوجہ نہیں رہتا بلکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ زبان ذوق اور ظرف کے بھی تقاضے پورے ہوئے یا نہیں! اتنے سارے تقاضے اکثر بڑی مشکل سے پورے ہوتے ہیں۔ یہ باتیں جاگیردارانہ نظام کی لعنت ہوں یا برکت مجھے اس سے بحث نہیں، میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ یہ باتیں اور اس طرح کی باتیں ملامت اور رکھ رکھاؤ سے آئیں یا فتنہ و فساد سے۔ بڑی باتیں اور بڑی شخصیتیں جتنی انسانی عظمت پر گواہ ہوتی ہیں اتنی کسی نظام کی لعنت یا برکت نہیں ہوتیں!

حسرت کے زبان پر عبور رکھنے اور کسی دوسرے کے زبان پر عبور رکھنے میں فرق ہے۔ عام طور پر ہم زبان کا ماہر اس کو قرار دینے کے عادی ہیں جو روزمرہ، محاورہ، ضرب الامثال یا رعایات لفظی وغیرہ کو اچھا لتا بناتا اور کھپاتا رہتا ہے۔ زبان میں مہارت کا یہ تصور مولویانہ یا مدرسانہ ہے۔ زبان میں مہارت اسے کہتے ہیں کہ زبان کو بے تکلف استعمال کرے، لیکن زبان کی صحت اور حسن میں فرق نہ آنے پائے اور سننے والے کو یہ محسوس نہ ہو کہ شاعر یا ادیب نے زبان کے کرتب یا اپنے کرتوت دکھائے ہیں۔

حسرت زبان کی نمائش کبھی نہیں کرتے۔ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو جن الفاظ اور فقروں میں ظاہر کرتے ہیں انھیں کو ذرا ادھر اُدھر کر کے شعر کی صورت دے دیتے ہیں۔ آپ حسرت کی عبارت کا مطالعہ کر کے بتا سکتے ہیں کہ جن خیالات و جذبات کے وہ حامل ہیں وہ کس شکل و شان سے کب اور کیونکر نازل ہوئے۔ اکثر شعرا اور ادیب خیالات و جذبات کے اظہار کے لئے اپنے نزدیک بہترین الفاظ و عبارت تلاش کرتے ہیں اور اس کے لئے

اور سنوارنے میں بڑی محنت کرتے ہیں۔ یہ کوئی عیب یا کمزوری نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے۔ اس شاعر یا ادیب کا زیادہ قایل ہونا پڑے گا جو تقریباً اسی زبان و عبارت میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار و ابلاغ خوبی سے کر سکے جس میں وہ وقوع میں آئے ہوں۔ یہاں یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ حقیقی شاعر کے ہاں ہر جذبہ اور ہر خیال اپنی زبان اپنے ساتھ لاتا ہے۔ حسرت کے ہاں اکثر الفاظ اور ترکیبیں غریب سی معلوم ہوں گی۔ لیکن بات بھرپور اور دلنشین ہوگی اور کچھ ایسا محسوس ہوگا جیسے وہ بات اُسی انداز سے انھیں الفاظ میں کہی جا سکتی تھیں یا دلنشین ہو سکتی تھی!

حسرت جن اکابر شعرا سے جس شد و مد سے اظہار عقیدت کرتے ہیں، مثلاً میر، قائم۔ مومن۔ مصحفی۔ نسیم لکھنوی یا نسیم دہلوی یا مولانا شمس الدین تبریزی۔ نظیری۔ فغانی۔ سعدی و جامی اتنا ان اساتذہ کا اثر ان کے کلام پر نظر نہیں آتا۔ اس میں بھی شبہ ہے کہ انھوں نے براہ راست ان سے استفادہ کیا ہو۔ وہ ان کا نام رسماً اور تبرکاً لیتے ہیں اور خود اپنے کلام کی داد دینا چاہتے ہیں تو بجائے کچھ اور کہنے کے ان مشاہیر کا نام لے لیتے ہیں.

شاعری میں حسرت دہلی کے بہ نسبت لکھنؤ سے زیادہ قریب ہیں۔ لکھنؤ کی روایات شاعری سے ان کو خاص دلچسپی ہے۔ لکھنؤ کے دبستان شاعری میں اتنا عشق نہیں جتنی عیاشی ہے۔ حُسن سے اتنا لگاؤ نہیں جتنا حسینہ سے۔ اس عیاشی میں بھی لمس و لذت کا اتنا دخل نہیں ہے جتنا خرافات کا۔ لکھنوی شعرا رقیب کا بہت کم تذکرہ کرتے ہیں۔ رقیب سے مجھے کوئی عشق نہیں لیکن اس پر تعجب ضرور ہوا ہے کہ لکھنؤ کے شعرا کا محبوب کا تصور رقیب کے تصور سے اتنا بے نیاز یا رشک کے عنصر سے اتنا پاک کیوں ہے۔ حسرت کے ہاں بھی رقیب کا عمل دخل تقریباً صفر ہے

اگر دُنیا کے انقلابات کی کبھی "اندرون خانہ" تاریخ لکھی جا سکی تو عشق مجازی کے کرتوت اور کارناموں کے عجیب و غریب کرشمے ملیں گے۔ حسرت کا عشق تمامتر مجازی ہے، انھوں نے اولیا اور اتقیا کی شان میں جو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ بھی اسی عشق مجازی کا ردعمل ہو تو کچھ تعجب نہیں۔ ایسا ہوتا ہے۔ میں اپنے اس گمان کو حسرت کے حضور میں گستاخی نہیں سمجھتا۔ میں حسرت کے عقیدہ کی پختگی خیال کی رعنائی، طبیعت کی سادگی و جذبات کی صحت مندی کا دل سے معترف ہوں۔ ان کی زندگی اور ان کی شاعری کے عوامل ایک دوسرے سے کہیں برسر پیکار نہیں ہوتے۔ انکی شاعری ان کا عشق، ان کی سیاست، ان کا ائمہ دین سے شغف، ان کی زندگی کے طور طریقے سب علٰحدہ علٰحدہ خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کا مصرف، ہر ایک کے اوقات اور ہر ایک کا محور اور عالم جدا ہے

حسرت نے اپنی عاشقی کے بارہ میں جو اعتراف کیا ہے وہ بڑا معنی خیز ہے یعنی:-

مجازی عشق بھی اک شے ہے لیکن ہم اس نعمت کے منکر ہیں نہ عادی!

کسی نعمت کا نہ منکر ہونا نہ عادی بالخصوص عشق مجازی جیسی نعمت کا جسے حسرت نے وہ زیبائی اور صحتمندی بخشی جو اُن سے پہلے ان سے یقیناً بڑے شعرا کے بھی حصے میں نہ آئی تھی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا شاید بے محل نہ ہو کہ شاعری میں حسرت کا کوئی محور نہیں

کوئی انسان ایسا نہیں جو فطری جذبات سے خالی ہو۔ لیکن جب تک یہ جذبات زندگی کی کسی اعلیٰ قدر کے حصول یا حفاظت یا خدمت میں صرف نہ کئے جائیں نہ ان جذبات کو کوئی خاص وقعت دی جا سکتی ہے اور نہ ان جذبات کے حامل کو۔ یہی سبب ہے کہ عشق مجازی اپنی ساری لذتوں کے باوجود اور عشق مجازی کا شاعر اپنی تمام رنگینی اور دلکشی کے باوجود اچھا شاعر تو ہوتا ہے، بڑا شاعر نہیں ہوتا۔ گویا میں بالکل ضروری نہیں سمجھتا کہ ہر شاعر بڑا شاعر بننے یا کہلانے کے لئے خطبۂ صدارت ہی تصنیف کرتا رہے۔ اچھا شاعر ہونا بھی بہت بڑی بات ہے۔ مزے کی بات کہنا بڑی بات کہنے سے کبھی کبھی دشوار تر ہوتا ہے

بایں ہمہ یہ کہنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ حسرت کا غزل پر بڑا احسان ہے اور میرے نزدیک جس کا غزل پر احسان ہے اس کا پوری اُردو شاعری اور اُردو زبان پر احسان ہے۔ حسرت نے غزل کی آبرو اس زمانہ میں رکھ لی جب غزل بہت بدنام اور ہر طرف سے نرغہ میں تھی انھوں نے اُردو میں غزل کی اہمیت اور عظمت ایک نامعلوم مدت تک منوالی

حسرت خالص غزل گو تھے۔ ان سے پہلے بڑے بڑے جید غزل گو گزرے تھے۔ معاصر غزل گو بھی اپنا اپنا مقام رکھتے تھے پھر بھی حسرت کی غزلگوئی ممتاز و منفرد ہے۔ اس لئے کہ حسرت غزل کا سہارا غزل ہی سے لیتے ہیں کسی اور سے نہیں، غزل گوئی کوئی کرے غزل کا معیار حسرت ہی رہیں گے

حسرت، جرأت اور داغ کے قبیلہ سے ہیں لیکن حسرت کی سطح، حسرت کا سلیقہ، حسرت کی شائستگی یا بحیثیت مجموعی حسرت کا ذوق ان دونوں سے زیادہ پاکیزہ اور گوارا ہے۔ حسرت کا نہ صرف محبوب جرأت اور داغ کے محبوب سے زیادہ شائستہ اور شستہ ہے۔ مجازی عشق میں محبوب کی شائستگی شاعر اور عاشق دونوں کے لئے بہت بڑی نعمت ہے ورنہ دونوں ایک دوسرے کے لئے باعث ننگ بن جاتے ہیں اور بالآخر ایک دوسرے کو لے ڈوبتے ہیں

حسرت کے ہاں نہ الفاظ اور فقروں کی تام جھام ہے نہ جذبات کی نفخ، وہ اس بارے میں بڑے کفایت شعار، سادگی پسند اور "براہ راست" ہیں۔ اُردو میں شاعری بڑی کثرت سے، بڑی دھوم دھام سے۔ اور بڑی دیر تک ہوتی رہی ہے۔ اب بھی چور بازاری کے بعد اسی کی گرم بازاری ہے۔ اس لئے اُردو لکھنے والوں میں مبالغہ نگاری عام ہے۔ یہاں تک کہ ہم شریفوں میں بیٹھ کر اس طرح SUPERLATIVES "افضل التفضیل" میں گفتگو کرتے ہیں جیسے کوئی مولوی مذہبی رسالے یا اخبار کی اڈیٹری کر رہا ہو! حسرت کو خوبصورتی، بے تکلفی اور بھولے پن سے پتہ کی بات مزے سے کہہ جانے کا جو ملکہ ہے وہ دوسرے شعرا کے حصہ میں بہت کم آیا ہے

حسرت جہاں تہاں خام، بے جھجک بھی ہو جاتے ہیں لیکن وہ شستہ اور شائستہ اتنے ہیں کہ بڑی آسانی اور کامیابی سے ایک طرف داغ و جرأت سے اور دوسری طرف آجکل کے نئے انداز کے لکھنے والوں سے علحدہ اور اونچے ہو جاتے ہیں۔ حسرت وہ آخری حد متعین کر دیتے ہیں۔ جہاں تک ہم جنسی جذبات کے اظہار میں جا سکتے ہیں، اس کے بعد جنسی جذبات کا اظہار نہیں رہ جاتا۔ ارتکاب شروع ہو جاتا ہے! ہمارے نوجوان شعرا شاعری کرتے وقت اظہار، اعلان۔ ابلاغ اور ارتکاب میں تمیز کرنے کی بہت کم زحمت اُٹھاتے ہیں۔ شاعری کرتے وقت اُردو شاعری میں جہاں تہاں سہدپن کا عمل دخل اسی زحمت سے بچنے کا نتیجہ ہے

حسرت کے یہاں خدا کا تصور بہت کم ملتا ہے۔ تقریباً نہیں کے برابر، وہ اصحاب القبور کی خوشنودی پر جتنی توجہ دیتے ہیں اتنا یوم القیامہ کی آزمائش سے عہدہ برآ ہونے کا عزم نہیں دکھاتے۔ یہ باتیں شاعری میں تلاش کرنا یا ان کو شاعری کا معیار قرار دینا کچھ ضروری نہیں بالخصوص کسی غزل گو کے ہاں لیکن یہ باتیں اتنی رسمی یا مذہبی نہیں ہوتیں جتنی ان سے ماوراء کچھ اور بڑی شاعری میں انسان کی برتری و بغاوت کا احساس و اہتزاز پایا جانا ضروری ہے۔ ایسا احساس و اہتزاز جو "اصلح و اعظم" قدروں کا اثبات کرے نہ کہ نفی

اب جبکہ بعض غیر متعلق باتیں چھڑ ہی گئیں ان کے بعض "متوسلین و متعلقین" کے بارے میں بھی کچھ کہہ ڈالنے میں مضایقہ نہیں، میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ بڑی شاعری میں انسان کی برتری و بغاوت کا احساس و اہتزاز پایا جانا ضروری ہے (ہر برتری میں بغاوت مضمر ہوتی ہے) لیکن عام طور پر اس نقطۂ نظر کی خانہ پری ہمارے بعض نامور شعرا اور ان کے عقیدت مند اس طرح کرتے ہیں کہ وہ انسان نہیں بلکہ شاعر کے احساس برتری اور کمتری کو سب کچھ یا بہت کچھ سمجھ کر وجد کرتے ہیں یا ہماری آپ کی آبرو کے درپے ہوتے ہیں، یہی نہیں بلکہ ان شعرا کے ہاں برتری کا اتنا احساس نہیں ہوتا جتنا برتری کی خواہش کے اظہار و اعلان کا ہوگا۔[1]

اُردو شاعری میں احساس برتری کا خصوصیت کے ساتھ اظہار سب سے پہلے غالب نے کیا جس پر اقبال نے ایسا قصر تعمیر کر دیا جس کے کنگرے عرش کی بلندیوں میں اوجھل ہیں، دوسری مثال یگانہ چنگیزی اور بعض دوسرے شعرا کی ہے جن کی تلاش آسان ہے

یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہے کہ غزل میں سیاسی رنگ کا اضافہ حسرت نے سب سے پہلے کیا لیکن حسرت کے کلام میں جہاں تہاں جو سیاسی باتیں ملتی ہیں ان کی حیثیت جتنی سیاسی خبروں کی ہے اتنی سیاسی شعور کی نہیں۔ تصوف کا ہماری شاعری میں طرح طرح سے دخل رہا ہے۔ لیکن جس طرح حسرت کے ہاں عشق کا تصور اتنا مجرد نہیں ہے جتنا مشخص یا مجازی اسی طرح ان کے ہاں تصوف سے اتنا لگاؤ نہیں ملتا جتنا صوفیا سے بلکہ یہ کہنا بھی غیر محل نہ ہوگا کہ حسرت جتنے پیر پرست واقع ہوئے ہیں اتنے تصوف پرست نہیں۔ اولیا اور اتقیا کے حضور میں نذر عقیدت پیش کرتے وقت حسرت

---

[1] یہ لفظ بظاہر غیر ثقہ معلوم ہوگا لیکن جہاں پر یہ آیا ہے وہاں اس سے زیادہ موزوں لفظ لانا میرے بس کی بات نہ تھی۔

شاعری بالخصوص غزل کے تقاضوں کو بالکل نظرانداز کر جاتے ہیں

غزل میں ثواب کمانے کا مشغلہ میں کچھ بہت اچھا نہیں سمجھتا۔ شاعری کرنی ہے تو شاعری کا حق ادا کرنا پڑے گا۔ چاہے ثواب کا مقصد پورا ہو یا نہ ہو۔ حسرت نے نعت اور منقبت بھی لکھی ہے لیکن ان کی شاعری میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ نعت لکھنا معمولی بات نہیں ہے، مولود خوانوں اور قوالوں کے لئے نعت لکھ دینا تو آسان ہے۔ لیکن حضور آیۂ رحمت میں لب کشائی آسان نہیں۔ شرف و سعادت کی یہ متاع گرانمایہ حالی اور اقبال کے حصہ میں آئی اور ہمارے ہی کیا دوسرے شعر و ادب میں بھی حالی اور اقبال روز روز نہیں پیدا ہوتے

حسرت شخص کے اعتبار سے خاصے انتہاپسند واقع ہوئے تھے لیکن ان کی شاعری میں جو توازن، تازگی اور ترنم ملتا ہے وہ دوسرے شعرا کے ہاں نہیں ملتا خواہ وہ حسرت سے زیادہ انتہاپسند ہوں، خواہ بہت کم یا بالکل نہیں۔ کم شعرا ایسے ہوں گے جن کو اپنے جذبات یا تخیل پر اتنی قدرت ہو جتنی حسرت کو۔ حسرت شاید ہی کبھی افضل التفضیل کا صیغہ استعمال کرتے ہوں، ان کی شاعری میں نہ جھٹکے ہیں نہ کچوکے۔ نہ دھماکے۔ نہ کھنگی۔ نہ کمینہ پن۔ ہم نے عاشقی کی ہو یا نہ کی ہو ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس کوچہ سے گزرے ہیں اور اسی طرح سے گزرے ہیں جس طرح حسرت۔ حسرت کا عشق گھریلو ہے بازاری نہیں۔ انسانی ہے خانقاہی نہیں، مجازی ہے ماورائی نہیں۔ حسرت اپنی شاعری میں صرف اپنی خوبیوں کا اظہار کرتے ہیں، نفسیاتی اُلجھنوں یا خامیوں پر شاعری کا ملمع نہیں چڑھاتے۔ حسرت میں جو بات مجھے بہت زیادہ تعجب انگیز اور اتنی ہی قابل تعریف نظر آئی وہ یہ کہ مذہب اور سیاست میں اس درجہ کٹر ہونے کے باوجود شاعری میں حسرت کس درجہ شیریں نوا اور شریف النفس اور زندگی میں کیسے درویش صفت اور تیغ اصیل تھے!

یہ باتیں تو ہوئیں حسرت کی شعر و شاعری سے متعلق لیکن حسرت کی جو حیثیت میرے لئے حیرت انگیز ہے اور جس سے میں متاثر ہوں وہ انکی عجیب غریب شخصیت ہے! ان کی شکل وصورت، وضع قطع، رہن سہن، طور طریقے بات چیت ان کی مشکل کشی جفاطلبی! اور ان سب پر فوق ان کی غزل سرائی!

کون جانے اور کون کہہ سکتا ہے کہ انھوں نے جب سے ہوش سنبھالا اور جب تک اس جہان سے اُٹھ نہ گئے وہ زندگی کے جہنم میں رہے یا جنت میں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ اُنھوں نے شاید اسی دنیا کے جہنم میں اپنے لئے کوئی جنت تعمیر کر لی تھی اور کبھی یہ گمان ہوتا ہے کہ انھوں نے اسی دُنیا کی جنت میں کوئی جہنم بنا لیا تھا جس میں وہ سوتے جاگتے تھے کھاتے پیتے تھے لڑتے جھگڑتے تھے خلوص برتتے تھے شاعری کرتے تھے خود خوش ہوتے تھے اور ہم کو آپ کو سب کو خوش رکھتے تھے۔ پھر سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ حسرت کی نہ کوئی جنت تھی نہ کوئی جہنم وہ اپنی درویشی میں ہر جنت و جہنم سے بے نیاز مست اور مگن تھے نہ اپنے سے باہر کسی بات کی خوشی یا غم مناتے تھے نہ اپنے اندر رنج و راحت کے لئے کوئی جگہ رکھتے تھے!

شادی اور غم کی ان کے ہاں شاید کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ ان کو فطرت کے اُن مظاہر سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے جو حلقۂ شام و سحر میں اسیر تھے۔ آئے اور چلے گئے آتے رہیں گے اور جاتے رہیں گے نہ ان کو معلوم کہ وہ کیا ہیں کیوں ہیں کیونکر کہاں کے اور کب تک نہ ہم کو۔ جس طرح حلقۂ شام و سحر میں ہم اسیر ہیں حلقہ حسرت میں شاید رنج راحت، نفع و ضرر اور خیر و شر اسیر تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ حسرت کی دُنیا و عقبیٰ حسرت خود تھے! اور کون اپنی دنیا و عقبیٰ خود نہیں ہے!

ان کی گول چھدری داڑھی انکی باریک آواز انکی چھوٹی تال کی عینک، بغیر پھُندنے کی پُرانی ترکی ٹوپی، گھسی پسی چپل موزہ سے کوئی سروکار نہیں موٹے کھدر کی پیوندلگی کاواک سی شیروانی جس کے اکثر بٹن ٹوٹے یا غائب ہاتھ میں بدرنگ سا جوٹ کا ایک جھولا دری تکیہ اور موٹی ملگجی چادر کا مختصر بستر۔ ٹیڑھا میڑھا پُرانا چھوٹا سا ایک ٹرنک۔ یہ تھے حسرت!

لیکن کس قیامت کا یہ آدمی تھا محشر خیال نہیں محشر عمل! جس بات کو اپنے نزدیک حق سمجھتا تھا اس کو بغیر کسی تامل کے بغیر گھٹائے بڑھائے بغیر ہموار کئے بغیر مصلحت یا موقع کا انتظار کئے، بے ضغطۂ زبان بغیر پلک جھپکائے مخاطب فلاطون ہو یا فرعون اس کے سامنے کہہ ڈالنا حسرت کے لئے معمولی بات تھی۔ ایسا نڈر، سچا، محبت کرنے والا اور محبت کا گیت گانے والا اب کہاں سے آئے گا! کسی سے نہ دبنے والا، ہر شخص پر شفقت کرنے والا زبان کا نباض، شاعروں کا والی غزل کا امام ادب کا خدمتگذار، کیسی سچی بات ایک عزیز نے کہی کہ سیاست کوئلہ کا کاروبار ہے جس میں بھی کا ہاتھ

تھوڑا بہت کالا ہوتا ہے سوا حسرت کے !

دُنیا کی تمام عقل و حکمت، دولت و اقتدار، فریب و فتن کیسی ہی ایجادیں کیوں نہ کر ڈالیں، ایسے سرپھروں کا کیا کرلیں گے جیسے کہ حسرت تھے۔ جو نفس رنج و راحت، جینے مرنے، نفع و نقصان کی پروا نہ کرتا ہو اس کا ایٹم بم کیا بگاڑے گا۔ فطرت نے انسان کے نفع و ضرر کے کتنے سامان فراہم کر دئے ہیں انسانی معاشرہ نے زندگی کو استوار و خوشگوار بنانے کے لئے کیسی کیسی سہولتیں اور دلچسپیاں اکٹھا کرلی ہیں لیکن حسرت کا کیا علاج جن کو ان میں سے ایک کی پروا نہیں، نہ مجبور ہونے کا غم نہ مختار ہونے کی خوشی، فرض اور فن دونوں کا دھنی، فن کی خوشی، فرض کا افتخار، انسان کی یہی عبادت بھی ہے بغاوت بھی !

یوروپ نے زندہ رہنے کا ایک گُر بتایا ہے یعنی "خطرہ بنے رہو !" جہاں سے آئے دن تہلکے اُٹھتے ہوں وہاں کے لئے یہ اصول کچھ غلط یا غیر معمولی بھی نہیں اور ایسا تو ہرگز نہیں ہے کہ اسے قرب قیامت کی دلیل بتایا جائے۔

البتہ اس تلقین کی روشنی میں حسرت کی زندگی اور طور طریقوں پر نظر ڈالتا ہوں تو بعض عجیب باتیں سامنے آتی ہیں۔ حسرت کو شروع سے آخر تک دولت، امارت، شہرت سے بے نیازی رہی۔ جیسے دُنیا کے سود و زیاں سے کوئی سروکار نہ ہو ظاہر ہے اسے خطرہ بنے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن جور و استبداد کے مقابلہ اور حق و باطل کے معرکہ میں حسرت نے جس بے جگری اور سرفروشی کا تمام عمر ثبوت دیا وہ ہندوستان میں مسلمان کی وطن دوستی کی معمولی مثال نہیں۔ بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا جب انگریزی حکومت کی مخالفت کا فوری اور براہ راست انجام دار و رسن ورنہ عبور دریائے شور تھا۔ اس زمانہ میں ایسوں کا ماتم کرنے والا کوئی نہ تھا اور ایسوں پر ہنسنے والے اور انکا شکار کرنے کرانے والے ہر طبقہ میں ہر طرف موجود تھے لیکن حسرت کے طور طریقوں میں سرمو فرق نہ آیا۔ سودیشی تحریک کی حمایت، سامراجی طاقتوں کی بیخکنی اور شعر و ادب کی خدمت ان کا شیوہ رہا اور یہ درویش بے یار و مددگار ہر ستم اور ستمگر کے لئے خطرہ بنا رہا !

انگریز دشمنی میں حسرت علیگڈھ کالج سے نکالے گئے۔ علیگڈھ ہی میں سودیشی کپڑوں کی دوکان رکھ لی، غالب پر حاشیہ لکھا، اُردوئے معلیٰ کی اڈیٹری کرتے رہے اور ان شغلوں سے جو کچھ روکھا پھیکا میسر آجاتا اسی پر اکتفا کرتے اور دنیا کی تمام عیش و کامرانی پر مسکراتے رہے! کسی صاحب دولت و اقتدار کا زہرہ نہ تھا کہ محبت و مسکنت کے اس بوریہ نشین سے آنکھ ملا سکے۔ دیسی کھرّے مٹیالے کاغذ پر اُردو کے مشاہیر نیز کم نصیب، گوشہ گیر اور تقریبًا بھلائے ہوئے شعراء کے کلام کا انتخاب شایع کرتے رہے۔ کتنے شعراء کے کارناموں کو حسرت نے ہر طرح کی مجبوری و بے سر و سامانی کے باوجود دوام بخشا اس کا اندازہ آج اُردو کے اس دورِ ابتلا و آزمایش میں کرتا ہوں تو حسرت کی یاد میں دل بے قرار ہو جاتا ہے۔

وہ زمانہ علیگڈھ کالج کے بڑے دبدبہ اور طنطنہ کا دور تھا۔ کیسے کیسے طلبا یہاں تھے جو بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ حسرت کے لئے کالج کی سرزمین ارضِ ممنوعہ تھی۔ اور خود حسرت نے کبھی کالج کا رخ نہ کیا۔ حسرت سے اس زمانہ میں کسی طرح کا تعلق انگریزی حکومت کے قہر و عتاب کا موجب ہوتا، لیکن یہاں کے اچھے سے اچھے طالب علم حسرت کی خدمت میں عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے برابر حاضر ہوتے اور اس پر فخر کرتے کہ حسرت نے ان کو اپنے بوریے پر بٹھایا، شفقت اور محبت کی باتیں کیں۔ اپنا کلام سنایا، اساتذہ سخن اور شعر و ادب کے نکات سے آشنا کیا۔

گزشتہ ۴۳ سال میں جو لوگ یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر پبلک لائف میں داخل ہوئے اور ہوچکے، ان میں غالبًا کوئی ایسا نہیں جس کو میں نہ جانتا بوجھتا ہوں۔ علیگڈھ میں رہتے بستے ایک عمر ہوئی یہاں کی زندگی کا کون سا پہلو ہے جو نظر سے نہ گزرا ہو اور کونسی نعمتیں ہیں جو یہاں میسر نہ آئیں۔ یہاں کے بعض طالب علم کسی نہ کسی بنا پر یہاں سے بجا یا بے جا طور پر نکالے بھی گئے۔ ایسوں کا علیگڈھ سے بیزار ہونا فطری تھا، لیکن اس وقت صرف دو ہستیاں ایسی یاد آتی ہیں۔ حسرت اور ذاکر صاحب جنھوں نے یہاں سے نکالے جانے کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ کبھی کوئی خلاف کاروائی کی یا کوئی کلمہ زبان پر آنے دیا بلکہ ہمیشہ علیگڈھ کے حامی و ناصر رہے۔ ذاکر صاحب تو نان کوآپریشن کی تحریک کے بعد سے جب وہ یہاں سے نکالے گئے تھے آج تک علیگڈھ کی خدمت میں برابر مصروف و منہمک رہے اور اس وقت مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ہمارے لئے "ترکش ما را خدنگ آخریں" کی حیثیت رکھتے ہیں !

اُردو بی ایچ ڈی کا زبانی امتحان لینے حسرت علیگڈھ تشریف لائے تھے۔ اسی سج دھج سے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ سفر خرچ کا بل فارم دستخط کے لئے پیش کیا گیا تو بولے یہ فرسٹ کلاس کا کرایہ کیسا۔ میں تو تھرڈ کلاس میں سفر کیا کرتا ہوں اور دراصل میں دہلی جارہا ہوں پروگرام ایسا رکھا تھا کہ یہاں اتر پڑوں اور امتحان لیکر آگے بڑھ جاؤں پھر یہ کرایہ کیسا اور ٹھہرنے کا الاؤنس کیوں۔ طعام و قیام تو آپ کے یاں رہا۔ بڑی دیر تک بڑے مزے کی ردوقدح ہوتی رہی اور علیگڈھ سے اپنی الفت کا اظہار کرتے رہے۔ حسرت بڑے زندہ دل اور خوش گفتار تھے۔ میں نے کہا "مولانا یہ روپیہ تو آپ میری خاطر سے لے ہی لیں۔ اور میرے ہی اوپر اپنے ہاتھ سے صرف کردیں"۔ بولے ہاں یہ ہوسکتا ہے، بتائیے کیسے؟ میں نے کہا "میرے لئے ایک ویسا ہی یونیفارم بنوا دیجئے جیسا کہ آپ پہنے رہتے ہیں"۔ بے اختیار ہنس پڑے پھر بولے "یہ یونیفارم کیا کیجئے گا؟" میں نے کہا "دشمنوں کا خیال ہے کہ آپ اپنے بعد اپنا خلیفہ مجھی کو نامزد کریں گے۔ اُس وقت یہ سجادہ میرے کام آئے گا"۔ بولے "خرقہ یا سجادہ"۔ میں نے کہا "نہ خرقہ نہ سجادہ، انکا کاروبار تو سبھی کرتے ہیں۔ آپ کے یونیفارم میں تو آپ کا خلیفہ خانقاہ بردوش نظر آئے گا!" بہت محظوظ ہوئے رہ رہ کر ہنستے اور داد دیتے رہے۔

حسرت ہندوستانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ لیکن ان کے اپنے انداز درویشانہ میں کوئی فرق نہ آیا نہ ممبروں کی آرام دہ کشادہ اور پرفضا قیام گاہ نہ ٹیلیفون نہ موٹر نہ تفریح نہ دعوت نہ دید و باز دید۔ نئی دہلی کے ایک غیر معروف شکستہ مسجد میں چٹائی پر قیام رہتا تھا۔ فرش پر آس پاس اخبارات، کاغذات اور فائلیں! وقت آیا تو کسی دوکان پر جاکر کھانا کھالیا۔ کاغذات جھولے میں ڈالے اور پارلیمنٹ پہونچ گئے۔ راستہ اکثر پیدل ہی طے کرتے اور موقع آن پڑتا تو پارلیمنٹ میں ایسی دو ٹوک اور بے لاگ تقریر کرتے کہ درو بام گونج اُٹھتے ؎

تنم می بلرزد چو یاد آورم!

پاکستان اور ہندوستان کے بڑے بڑے عہدہ داروں کا دہلی میں ایک سرکاری اجتماع تھا بعض اہم اور نازک مسایل زیر بحث تھے۔ شام کو عصرانہ تھا۔ اعیان و اکابر جمع تھے حسرت بھی مدعو تھے۔ ایسے مواقع پر ایسی پارٹیاں صرف چائے پینے پلانے کے لئے نہیں ہوتیں اور باتیں بھی مدنظر ہوتی ہیں۔ آرایش و زیبایش، جاہ و حشم، ساز و سامان، تکلف و تواضع، صاحبان ثروت، ماہرین سیاست، اکابر علم و حکمت اپنے اپنے وزن و وقار کے ساتھ اور خواتین معہ اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے موجود تھیں "فضا آراستہ چمن پیراستہ" اتنے میں ایک طرف سے حسرت نمودار ہوئے اسی سج دھج سے جو صرف اُن کی تھی اُسی وقار درویشی اور انداز قلندری سے جو ان کا مسلک تھا اور اسی شعلہ سامانی و شبنم افشانی کے ساتھ جو ان کی زندگی تھی۔ مجمع میں ایک لہر سی دوڑ گئی ہر شخص نے بڑے لطف و احترام سے حسرت کی پذیرائی کی اور دیکھتے دیکھتے وہ سب کی توجہ اور تپاک کا مرکز بن گئے۔ شایستہ فقرے، لطف کی باتیں، عقیدت اور محبت کی پیش کش ایسا معلوم ہونے لگا جیسے یہ تقریب حسرت کے خیر مقدم کے لئے منعقد ہوئی تھی۔ فرمایش شروع ہوگئی حسرت نے شعر سنانے شروع کردئے۔ حسرت زیادہ تر اپنا کلام تحت اللفظ سناتے تھے بالکل جیسے باتیں کرتے ہوں مگر معلوم نہیں کیوں کبھی کبھی ترنم بھی فرمانے لگتے اس پر مجھے ہمیشہ ہنسی آجاتی ان کا ترنم ایسا ہوتا جیسے کوئی معصوم بچہ ترنم کے ہر اصول سے بیگانہ محض ترنم کی نقل کر رہا ہو یا کوئی ملّا ہو جسے ترنم سے کوئی واسطہ نہ ہو لیکن اس کے بغیر رہا بھی نہ جاتا ہو۔ ساتھ ہی ساتھ اس کوشش سے بھی باز نہ آتا ہو کہ نیکی یا بدی لکھنے والے فرشتے یہ طے نہ کرپائیں کہ ملّا صاحب ترنم میں مبتلا ہیں یا تلاوت میں مصروف! مجھے معلوم نہیں حشر کے دن خود گناہ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں فریاد کرنے کی اجازت ملے گی یا نہیں ورنہ میرا خیال ہے کہ اس دن سب سے زیادہ مجمع وہاں ہوگا جہاں بیچارہ گناہ کسی ملّا کے خلاف اللہ تعالیٰ کے حضور میں فریاد کرتا ہوگا!

ہاں تو ذکر اس پارٹی کا تھا جہاں حسرت اپنا کلام سُنا رہے تھے سارے اکابر حسرت کے گرد جمع ہوگئے اور محفل کا رنگ ہی بدل گیا تھوڑی دیر تک ذہن میں کچھ اور باتیں آتی رہیں اور اپنا اپنا نقش چھوڑتی چلی گئیں سارا گرد و پیش جو دولت، امارت اور نفاست کا ترجمان اور آئینہ دار تھا ایک "شخص" کی موجودگی سے کیا سے کیا ہوگیا اور اس مرد درویش کے جلال اور اس کی شاعری کے جمال میں گرد و پیش کا سارا اہتمام کس درجہ سطحی اور ضمنی معلوم ہونے لگا۔ کتنی ایسی باتیں ذہن میں آئیں جن کو باضابطہ و بامعنی تحریر کا جامہ پہنانا ناممکن معلوم ہونے لگا

یکایک اقبال کی مسجدِ قرطبہ کے نقوش تصور میں اُبھرنے لگے اور بے اختیار یاد آنے لگا۔

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اسکے دنوں کی تپش اسکی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم — اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اسکا ناز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکار حق، مردِ خدا کا یقیں — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار — حاملِ "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب — سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں!
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب — ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

بیاض حسرت موہانی

محتشم کاشی:۔
خنک آں نسیم بشارتے کہ ز غائب از نظرے رسد — پس از انتظارے و مدتے خبرے ز بیخبرے رسد

ممنون سونی پتی:۔
کس قدر شرح گرانباریِ غم لکھی تھی — کہ مرے نامے نے بازوئے کبوتر توڑے

شہیدی:۔
بیمار محبت کو اللہ شفا دے — سنتے ہیں کہ ہاتھ اس سے مسیحا نے اُٹھایا

میر تقی میر:۔
کیا میں بھی پریشانیِ خاطر سے قریں تھا — آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غمدیدہ کہیں تھا
اب کوفت سے ہجراں کے جہاں تن پہ رکھا تھا — جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ یہیں تھا

قبول لکھنوی شاگرد ناسخ:۔
رحم قاتل سے اسیرِ درد و غم یونہیں رہے — قیدِ غم سے چھٹ گئے اغیار ہم یونہیں رہے

شاپور طہرانی:۔
نمیگویم کہ از زندانِ ہجر آزاد کن مارا — اگر جائے گرفتارے بہ بینی یاد کن مارا
در کوئے تو شکرِ دلِ ناشاد نہ کردم — خود رفتم و اورا ز غم آزادے کردم

میرزا شرف قزوینی:۔
غم نیست گر بخنجرِ کیں میکشد مرا — بہرِ رقیب میکشد ایں میکشد مرا
آمد بہ پرسشِ من و دردم فزود و رفت — صبرے کہ من نداشتم آنہم ربود و رفت
آخر شرف براہِ سگانِ تو جاں سپرد — رسمِ وفا بمردمِ عالم نمود و رفت
اے ہمنشیں رقیبِ من زار بودۂ — من غافل و تو نیز گرفتار بودۂ

محتشم کاشی:۔
روئے ناشستہ چو ماہش نگرید — چشمِ بے سرمہ سیاہش نگرید
عذر خواہی کندم بعد از قتل — عذر بدتر ز گناہش نگرید

حسرت موہانی

(پروفیسر فراق گورکھپوری)

زندگی یا شاعری کا ایک دور ختم نہیں ہو چکتا کہ دوسرا دور شروع ہو جاتا ہے۔ امیر و داغ کے دور کے زمانہ ہی میں اگلے دور تغزل کی پیش گوئی یا جھلک جلال، حالی، شاد عظیم آبادی، آسی غازی پوری کی غزلوں میں سنائی اور دکھائی دیتی ہے۔ امیر کی غزل گوئی میں ایک داخلی قسم کی خاموش تبدیلی، ایک نئی نرمی تھی اور سنجیدگی اور رحت النغمہ سوز و ساز جلیل کے ہاتھوں پیدا ہو رہا تھا۔ یہ سب ہو رہا تھا لیکن ابھی فضا پر امیر و داغ ہی کی آواز بازگشت چھائی ہوئی تھی۔ اسی دھندلکے میں جب دونوں وقت مل رہے تھے یا یوں کہیئے کہ جب شاعری کا تبدیل موسم ہو رہا تھا، انہلی نکلتے پیٹھتے دنوں میں آج سے پچاس برس پہلے حسرت نے ایک نئی دُھن میں غزل سرائی شروع کر دی جس میں کچھ وہ پُرانی دُھنیں بھی ملی ہوئی تھیں جنھیں ہمارے کان بھول چکے تھے۔ اس طرح گویا اُردو غزل کی ڈھائی سو برس کی تاریخ میں حسرت کا تغزل ایک نشاۃ ثانیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اُنیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائی اور خصوصاً بیسویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں امیر و داغ کے علاوہ جن متغزلین کا نام آیا ہے وہ کسی ایک مدرسۂ شاعری کے نمایندے نہیں ہیں۔ ان سب کے یہاں اگر کوئی صفت عام ہے تو وہ جذباتی خلوص اور سچائی ہے اور تصنع و سطحیت سے احتراز۔ خلوص سب کے یہاں ہے لیکن ایک انفرادی شان اور تیور ہے۔ اس سلسلہ میں یعنی غزل کی احیا کے معاملے میں حسرت کے متعلق ایک بات میں ایک عرصہ سے سنتا آیا ہوں جو غور کرنے پر ٹھیک نہ اُترے گی۔ وہ بات یہ ہے کہ اُردو غزل بے جان اور خشک چیز ہو چکی تھی اور حسرت نے اُسے پھر سے زندہ کیا۔ جلال، حالی، شاد۔ آسی اور جلیل غزل کو مُردہ خشک ہونے سے پہلے ہی بچا چکے تھے۔ حسرت کے تغزل کی قدر و قیمت یہ کہکر نہیں بتائی جا سکتی کہ حسرت نے امیر و داغ کے بعد اُردو غزل جو مر چکی تھی اُسے پھر سے جلا لیا۔ غزل کے حق میں حسرت کی آواز صدائے قم کی حیثیت نہیں رکھتی۔ حسرت کے تغزل کی سحرکاری بالکل دوسری ہی چیز ہے۔

اگر حسرت اور اُن کا رنگ تغزل عالم وجود میں نہ آتا تو بھی اُردو غزل نئی زندگی کا ثبوت دیتی اور اس میں صدق و خلوص و شعریت آکر رہتی۔ عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی، نوبت رائے نظر، فانی، یاس، اصغر، جگر اُسی پیش گوئی کی تکمیل ہیں جو جلال و جلیل کی آوازوں میں گونج رہی تھی اور جو شاد، حالی اور آسی کے نغموں میں واضح ہو چکی تھی۔ خود حسرت کی غزل بھی انہی نغموں کی ایک پھوٹتی ہوئی کرن ہے۔ حسرت اور ان کے ہمعصر ایک ہی قوس قزح کی جھلکیاں اور جھلملاہٹیں ہیں۔ حسرت کے ہم عمر متغزلین حسرت سے بالکل متاثر نہیں ہیں نہ ان کا تغزل حسرت کی غزل سرائی کا کسی طرح مرہونِ منت رہا ہے۔ وہ حسرت سے اور حسرت اُن سے بالکل الگ ہیں۔ میں نے حسرت کی کامیاب تقلید، ان کے لب و لہجہ کی قریب قریب بجنسہٖ تکرار، صرف جلال الدین اکبر اور جلیل قدوائی کے یہاں دیکھی ہے اور یہ دونوں عمر میں حسرت سے اندازاً تیس برس چھوٹے ہیں۔ جس طرح میر، ناسخ و آتش، امیر و داغ کے زمانہ کی قریب قریب پوری شاعری اُن اُستادوں کی آواز کی پرچھائیں معلوم ہوتی ہے اسی طرح گزشتہ چالیس پچاس برس کی اُردو غزل کسی ایک یا دو استاد کی آواز کا عکس نہیں ہے۔ اس دور میں ہر چوٹی کا غزل گو اپنے ہمعصروں سے بالکل الگ ہے اور ذرا بھی متاثر نہیں ہے۔ اُردو غزل اب تقلید و تتبع کی منزلوں سے آگے نکل چکی ہے۔ صرف زبان و بیان و اسلوب میں نہیں بلکہ جذبات و تخیل و تفکر و ادراک و شعور میں بھی ہر غزل گو کی جداگانہ حیثیت ہے۔

ہاں تو جب حسرت کی غزل گوئی نے آنکھ کھولی تو حقیقی غزل گوئی کئی انداز سے شروع ہو چکی تھی۔ پھر حسرت نے کیا کیا؟ پہلے ان شعرا کی کچھ نغمہ سرائیاں سنئے جو حسرت سے پہلے اُردو غزل میں نشاۃ ثانیہ پیدا کر رہے تھے:-

جلال :- وہ داغ نصیب ہوا جس کا داغ بھی نہ ملا ملا وہ غمکدہ جس کو چراغ بھی نہ ملا
گئی تھی کہہ کے کہ لاتی ہوں زلفِ یار کی بو پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

شاد عظیم آبادی :- نگہ کی برچھیاں جو سہہ سکے سینا اسی کا ہے ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے
یہ بزمِ مئے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی جو بڑھ کر خود اُٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

حالی :- ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں
اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق رکھی ہے آج لذتِ دردِ جگر کہاں

آسی غازیپوری :- صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے او بادِ صبا یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

عبرت گورکھپوری :- زمانے کے ہاتھوں سے چارا نہیں ہے زمانہ ہمارا تمھارا نہیں ہے

جلیل :- نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

دیکھا آپ نے حسرت سے کئی برس پہلے کے متغزلین نے داغ و امیر کی کڑی زمین کو کس طرح نرمانا اور سیراب کرنا اور اس میں نئی کاشت کرنا شروع کر دی تھی۔ غزل کی نشاۃ ثانیہ شروع ہوگئی تھی اور ابھی حسرت نے زبان نہیں کھولی تھی۔ جب تھوڑے ہی دنوں بعد حسرت کی آواز بلند ہوئی تو اس کے آگے پیچھے یہ نغمے بھی گونج اُٹھے :-

فانی بدایونی :- میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے
چمن سے رخصتِ فانی قریب ہے شاید کہ اب کے بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

یاس :- ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش دُنیا یہی دُنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
پیامِ زیرِ لب ایسا کہ کچھ سُنا نہ گیا اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

عزیز لکھنوی :- دل نے دُنیا نئی بنا ڈالی اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی
خامۂ قدرت نے دل کا نام یہ کہکر لکھدا ہر جگہ اس لفظ کے معنی بدلتے جائیں گے

اقبال :- رہیں عشق میں نہ وہ گرمیاں رہیں حُسن میں نہ وہ شوخیاں نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں
نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

محشر لکھنوی :- تمام عمر اسی احتیاط میں گزری کہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو
مدتیں ہوگئی ہیں چپ رہتے کوئی سنتا تو ہم بھی کچھ کہتے

صفی لکھنوی :- غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

ثاقب لکھنوی :- بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

بینظیر شاہ :- وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل گئے وہ مری جبینِ نیاز تھی کہ وہیں دھری کی دھری رہی
بڑی احتیاط طلب ہے وہ جو شراب ساغرِ دل میں ہے جو چھلک گئی تو چھلک گئی جو بھری رہی تو بھری رہی

اصغر گونڈوی :- جو مجھ پہ گزری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم چھلک رہا ہے مزہ پر ستارۂ سحری
عارضِ نازک پہ ان کے رنگ سا اک آگیا ان گلوں کو چھیڑ کر میں نے گلستاں کر دیا

جگر مرادآبادی :- یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں
وہ رو رو کے گلے مل مل کے رخصت ہوتے جاتے ہیں مری آنکھوں کی یا رب روشنی کم ہوتی جاتی ہے

ان اقتباسات سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ غزل کی نشاۃ ثانیہ جو جلال سے شروع ہوئی تھی اب ابتدائی منزلوں سے گزر چکی ہے۔ بیسویں صدی کا تغزل اب اپنی پوری جوانی پر ہے۔ یہ کسی اگلے دور کی صدائے بازگشت نہیں ہے۔ اب اسی دور میں حسرت کی وہ نغمہ سرائی سنئے جو انھیں ان کے معاصرین سے صاف الگ کر دیتی ہے اور انھیں ایک نمایاں امتیازی شان بخشتی ہے:۔

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیِ جسمِ نازنیں　　اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا
رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا　　طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا دے گی　　اے حسنِ حیا پرور شوخی بھی شرارت بھی
اے شوق کی بیباکی کیا تیری خواہش تھی　　جس پر انھیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی
جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں　　جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ　　تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے
بدلِ لذتِ آزار کہاں سے لاؤں　　اب تجھے اے ستمِ یار کہاں سے لاؤں
مے و مینا سے یاریاں نہ گئیں　　میری پرہیزگاریاں نہ گئیں
گرفتارِ محبت ہوں اسیرِ دامِ محنت ہوں　　میں رسوائے جہانِ آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں
ہم نے کس دن ترے کوچے سے گزارا نہ کیا،　　تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا
دل اور تہیۂ ترکِ خیالِ یار کرے　　کسے یقین ہو کون اس کا اعتبار کرے
وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں　　آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں
مرے اصرارِ مضطر میں نہاں تھی میری مایوسی　　ترے اقرارِ آساں سے ترا انکار پیدا ہے،
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی　　مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں،
حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی　　مجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھکر یاد آتے ہیں
سب کی خاطر کا ہے خیال تمھیں　　کچھ ہمارا بھی انتظام کرو
حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا　　کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا
حسرت تری نگاہِ محبت کو کیا کہوں　　محفل میں ان سے رات شرارت نہ ہو سکی
اہلِ ہوس کو بھی سرِ سودائے عشق ہے　　یہ کفر ہے یہ دعویٰ بیجائے عشق ہے
گنہگار تھے باصفا ہو گئے ہم،　　ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
رنگ تیری شفق جمالی کا　　اک نمونہ ہے بے مثالی کا
آئینہ ہے تبسمِ لبِ دوست　　حسنِ خوباں کی بے ملالی کا
حالِ مجبوریِ دل کی نگراں ٹھہری ہے　　دیکھنا وہ نگہِ ناز کہاں ٹھہری ہے
کیونکر کوئی سنائے انھیں شوق کی وہ بات　　جو پڑ گئی ہو کشمکشِ التماس میں
حسن ہے بے نیازِ عشق و ہوس　　ہم بھی ناکام ہیں عدو ہی نہیں
آنکھوں کو انتظار سے گردیدہ کر چلے　　تم تو یہ خوب کارِ پسندیدہ کر چلے
اتنی سی شے کا تم سے تقاضا کرے گا کون　　دل لیکے ہم سے آنکھ چرانا نہ چاہئے
رونقِ حسنِ مراعات چلی جاتی ہے　　ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے

دن کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے — رسم پابندی اوقات چلی جاتی ہے
ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی ان کا — گفتگو کی کوئی تمہید اُٹھائی نہ گئی
حسینوں میں آج ایک تم سا نہیں ہے — خوشامد فقیروں کا شیوہ نہیں ہے
رشک اس طرۂ گیسو پہ ہیں کیا کیا مجھ کو — وہ لٹکتا جو پڑا ہے ترے رخسار کے پاس
آج سنکر میرے نالوں کو زراہِ التفات — زیرلب اس نے بھی کھینچی ایک آہِ التفات
تری نوازشِ پیہم سے ڈر یہی ہے کہ دل — کچھ اور بھی نہ کہیں ناصبور بن کے رہے
برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے، — ہم نے اس شوخ کو مجبور حنا دیکھا ہے
اس قدر جلد جو پیمانِ وفا توڑ دیا، — آپ ہی کہئے بھلا آپ کو زیبا ہے یہی
وہ چپ ہو گئے مجھ سے کیا کہتے کہتے — کہ دل رہ گیا مدعا کہتے کہتے،

حسرت کے معاصرین کا جو نمونۂ کلام آپ دیکھ چکے ہیں وہ ولی دکنی و سراج دکنی سے لیکر امیر و داغ تک کسی شاعر کی یاد نہیں دلاتے ۔۔ ان معاصرین میں ہر ایک کا رنگ سو فی صدی انفرادی ہے نہ صرف ایک دوسرے کے مقابلے میں نہیں بلکہ پہلے کی بھی تمام غزل گوئی کے مقابلے میں۔ ہر ایک نے بالکل ذاتی محسوسات اور انفرادی وجدان کو نئے سانچے میں ڈھال کر نئے انداز سے مترنم کر دیا ہے ۔ ان معاصرین کا کلام پڑھکر کسی اور شاعر کی یاد ہی نہیں آتی ۔ کہیں کہیں اگر پہلے کے کسی شاعر کی پرچھائیں ان معاصرین کے کلام پر پڑتی ہے تو دور سے پڑتی ہے اور وہ بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی لیکن جو اقتباسات میں نے حسرت کے کلام سے پیش کئے ہیں وہ بیانِ حسن و اظہار عشق میں صاف مصحفی کی یاد دلاتے ہیں ۔ معاملہ بندی اور ادا بندی میں جرأت کی یاد دلاتے ہیں اور داخلی و نفسیاتی امور کی طرف اشارہ کرنے میں عموماً نئی فارسی ترکیبوں کے ذریعے سے مومن کی یاد دلاتے ہیں ——

——————————————— لیکن حسرت محض مصحفی، جرأت و مومن کی آواز بازگشت نہیں ہیں، وہ ان تینوں پیش روؤں کے انداز بیان وجدان اور ان کے فنِ شاعری کی انتہا و تکمیل ہیں یعنی وہ ان تینوں کے رنگ میں ان تینوں سے آگے بڑھ جاتے ہیں ۔ حسرت کے ہاتھوں اُردو غزل کی نشاۃ ثانیہ نہیں ہوئی بلکہ مصحفی، جرأت، مومن کے رنگ تغزل کی نشاۃ ثانیہ ہوئی مصحفی، جرأت، مومن ہر ایک کی شاعری میں جو رنگ دبے ہوئے تھے، ان کے دلوں میں جو جو ر تھے ان میں جو امکانات چھپے ہوئے تھے وہ سب حسرت کی غزل میں اُبھر آئے اور نکھر گئے ۔ مصحفی، جرأت، مومن کی شاعری کے وعدے جواب تک تشنۂ تکمیل تھے ۔ حسرت کی غزل میں اس طرح پورے ہو گئے کہ اب اس رنگ کی شاعری میں ترقی کی گنجایش ہی نہیں رہ گئی ۔ یہ بھی یاد رہے کہ حسرت کی کوئی غزل (سوا ان غزلوں کے جو بالاعلان جرأت و مصحفی کے رنگ میں کہی گئی ہیں) اُس رچاؤ اور سنگار اور اس کمال بیان سے کہدینا مصحفی، جرأت و مومن کے لئے فرداً فرداً ناممکن سا تھا ۔ ہر ایک کے رنگ میں یا "تقلید" میں جو غزلیں حسرت نے کہی ہیں جوں کی توں وہ غزلیں مصحفی، جرأت، مومن نہ کہہ پاتے ۔ یہ مشابہت کچھ اسی طرح کی ہے جیسے میر کے بعض ہمعصروں کے کلام کی مشابہت میر کے کلام سے ۔ اگر صبا، رند اور آتش کے استاد ہوتے تو تینوں کے کلام میں مشابہت کے باوجود آتش کے کلام کی جو امتیازی شان ہے، وہی امتیازی شان مشابہت کے باوصف حسرت کے کلام میں بمقابلۂ مصحفی، جرأت و مومن نظر آتی ہے ۔ یعنی مشابہت ہوتے ہوئے بھی ایک شان برتری ۔ حسرت نے تین چاشنیوں کو ملاکر ایک نیا قوام بنایا ہے ۔ تین رنگوں کو ملاکر ایک رنگ بنایا ہے ۔ حسرت کے یہاں ایسے اشعار بہت ہیں جن میں رنگینی اور البیلاپن اور بندش کی سلاست اور اعتدال مصحفی کی یاد دلاتے ہیں ادا بندی و معاملہ بندی یعنی خارجی نقل و حرکت جرأت کی اور فارسی ترکیبوں کے ذریعہ داخلی اشارے یا نفسیاتی تحلیل و تجزیہ مومن کی یاد دلاتے ہیں ۔ اس لحاظ سے حسرت کے متعلق یہ کہنا انصاف پر مبنی ہوگا کہ وہ اپنے اصلوں سے زیادہ اصلیت کے مالک ہیں ۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ حسرت کی غزلوں کا مرکزی رجحان اور بنیادی عنصر وہی ہے جو جرأت کے رنگ تغزل کا ہے اس کے بعد مصحفی اور مومن کے رنگوں کا اضافہ ہوتا ہے ۔ بہرحال حسرت نے ان تین استادوں سے اپنی شاگردی کو ایک الگ استادانہ رنگ دیدیا ہے ۔ اگر ان کے یہ تین معنوی استاد مطلع ہیں تو حسرت حسن مطلع ہیں ۔ حسرت کی مندرجۂ ذیل غزل پر ایک نظر ڈالئے :-

دل میں کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی — روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی
ہم رضا شیوہ ہیں تاویل ستم خود کرلیں — کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی
یہ بھی آداب محبت نے گوارا نہ کیا — ان کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی
آہ وہ آنکھ جو ہر سمت رہی و اعقب پاش — وہ جو مجھ سے کسی عنوان ملائی نہ گئی
ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی ان کا — جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی
دل کو تھا حوصلۂ عرض تمنا سو انھیں — سرگزشت شب ہجراں بھی سنائی نہ گئی
غم دوری نے کشاکش تو بہت کی لیکن — یاد ان کی دل حسرتؔ سے بھلائی نہ گئی

پہلے شعر میں جرأت کا رنگ صاف جھلک رہا ہے۔ یہ مجبوری اس شدت احساس کی مجبوری نہیں ہے جو علیہ کے مصرعہ ”وہ آئیں بزم مگر دیکھنے کی تاب نہیں“ میں ہے۔ حسرت کی مجبوری میں جرأت کی شاعری کی گدگدی ہے۔ دوسرے شعر میں ایک داخلی اور نفسیاتی اشارہ ہے جو مومن کی یاد دلاتا ہے ”حکم تاویل ستم“ کا ٹکڑا۔ تیسرے شعر میں مصحفی کا رنگ جھلک رہا ہے۔ چوتھا شعر بھی مومن ہی کی یاد دلاتا ہے نفسیاتی اشارے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی ہنگامہ خیزی، شرر باری اور گرماگرمی کی وجہ سے، پانچواں شعر جرأت کے رنگ کو بہت رچا کر پیش کرتا ہے۔ چھٹا شعر پھر مصحفی کی یاد دلاتا ہے اور مقطعے میں مصحفی و مومن کے رنگوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔

ایک بات کی طرف حسرت کی غزل کے متعلق بہت کم اشارہ کیا گیا ہے۔ مصحفی، جرأت، مومن کا ذکر تو حسرت پر تنقید کا جزو بن چکا ہے لیکن میر کے ان معاصروں کا ذکر اس سلسلہ میں نہیں کیا جاتا جن کا اعتدال بیان حسرت نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے مثلاً میر سوز یا شاہ حاتم یا قایم چاند پوری یا بیدار یا اس دور کے صف دوم کے دوسرے شعرا جو میر و سودا کے مرتبہ کو نہیں پہونچ سکے لیکن بیان کی صفائی سلاست اور روانی جن کی شاعری ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ خود مصحفی کا کلام ان صف دوم کے شعرا کی بہت حد تک ہم نوا ہے اور حسرت کو بھی ان شعرا کا انداز بیان بہت مرغوب تھا۔ ان شعرا کے یہاں غم عشق وہ بلند المیہ نہیں بن سکا ہے، جو میر کے یہاں بن گیا ہے۔ ان کے یہاں غم ایک ہلکی چٹکی یا میٹھا درد یا دبی دبی چوٹ ہے۔ ایک ہلکی خلش ہے ہلکا محسوس اور خفیف سی ٹیس یا کسک ہے۔ نشاط بھی وہ منزلیں ان کے یہاں طے نہیں کر سکا اور نہ سوز و ساز اپنے اندر پیدا کر سکا۔ جس کی جھلک سودا کے یہاں ملتی ہے اور جس کی پوری جلوہ گری آتش کے کلام میں نظر آتی ہے۔

عام طرز بیان اور طرز احساس کا جہاں تک تعلق ہے حسرت پر مصحفی، جرأت و مومن کا جتنا اثر ہے اس سے زیادہ کہیں زیادہ اور کہیں نمایاں اثر ان پر میر و سودا کے صف دوم کے شعرا کا نظر آتا ہے۔ وہی سادگی، وہی معصومی وہی آمد کا رنگ وہی بے تکلفی وہی ہلکا پھلکا پن جو جرأت و مصحفی سے پہلے کے صف دوم کے شاعروں کے یہاں ملتا ہے وہی حسرت کے یہاں بھی ہے، بلکہ اس دور کے بعد صرف حسرت کے یہاں ملتا ہے۔ حسرت کی شاعری کے یہ سرچشمے جرأت و مصحفی سے پہلے پھوٹ چکے تھے۔ سوز، حاتم، قایم، بیدار کا رنگ تو حسرت اڑا چکے تھے لیکن انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میر کا رنگ وہ نہیں اڑا سکے اور ہار مان کر کہہ دیا کہ :- ”مگر دل میں ہوائے شیوہ ہائے میر پھرتی ہے“۔ حسرت کے کلام میں جو آسان بیانی ([illegible]) کے ساتھ ساتھ ایک مستقل اور مسلسل گنگناہٹ پائی جاتی ہے وہ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ میر و سودا کے ہمعصروں کی آواز ابھی اچھی طرح نہیں کھلی وہ حسرت کی غزل کا حسب نسب یعنی اس کے خاندانی سلسلے کو میر و سودا کے نسبتاً کمتر معاصرین سے ملا دیتی ہے مثلاً بیدار کی صرف ایک غزل دیکھئے جس سے حسرت کا تغزل کس قدر مشابہ ہے :-

سبزۂ خط ترے عارض پہ نمودار ہوا — حیف اس آئینۂ صاف پہ زنگار ہوا
آج آتا ہے نظر دن مری آنکھوں میں سیاہ — رات تجھ زلف میں دل کس کا گرفتار ہوا
تجھ بن اے زہرہ جبیں رات مرے گھر کے بیچ — نغمۂ مطرب و نے نالۂ بیمار ہوا ،
غم جدا، درد جدا، نالہ جدا، داغ جدا — آہ کیا کیا نہ ترے عشق اے یار ہوا

اس کو کیا کہئے یہ ہے اپنے نصیبوں کا قصور　　جتنا چاہا میں اسے اتنا ہی بیزار ہوا
آج اس راہ سے کون ایسا پریرو گزرا　　کہ جسے دیکھتے ہی شیفتہ بیدار ہوا

یہی وہ رنگ تغزل ہے جسے خود مصحفی نے اپنایا اور جسے انھوں نے غیر معمولی ترقی دی لیکن وہ بھی میر و سودا تک نہیں پہونچ سکے۔ حسرت نے یہ رنگ تغزل بالواسطہ مصحفی سے نہیں لیا بلکہ براہ راست اس کے اصلی سرچشموں سے لیا اور مصحفی نے جو اسے ترقی دی تھی اسے بھی حسرت نے اپنی غزل کے پلیٹ میں لے لیا، پھر جرأت اور مومن کے رنگوں کو بھی اس میں ملا دیا۔ حسرت اُردو غزل کی تاریخ میں سب سے بڑے مقلد ہیں لیکن انھوں نے تقلید کو تخلیق بنا دیا ہے۔ یہاں ایک مسئلہ قابل غور ہے وہ یہ کہ حسرت نے میر و سودا، غالب و آتش کے رنگ کی تقلید کی ہوتی تو ترقی دینا تو کجا وہ ان استادوں کی غزل کی گرد کو بھی نہ پہونچتے۔ حسرت کی فطنت (genius) دوئم درجہ کی فطنت ہے۔ اسی لئے وہ دوئم درجہ کے شعراء کی طرف کھنچے جن کی شاعری میں ترقی و تکمیل کی گنجایش تھی اور حسرت نے یہ ترقی انتہا تک پہونچا دی لیکن وہ انتہا تک پہونچ کر بھی رہی دوئم درجے ہی کی شاعری۔ یہ معاملہ ایک بات بتانے سے کچھ اور صاف ہو جائے گا۔ مومن بمقابلہ میر، غالب و آتش دوئم درجے کے غزل گو ہیں لیکن ان کی دوئمیت کبھی کبھی اولیت کی منزلوں کو چھو لیتی ہے۔ مومن عموماً فارسی ترکیبوں کے ذریعہ داخلی و نفسیاتی حقایق کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں۔ ان کے اس کام میں وسعت، رنگا رنگی اور ترقی کی گنجایش تھی اور یہ ترقی حسرت کے ہاتھوں ہوئی۔ لیکن مومن نے ایسے شعر بھی تو کہے ہیں جو انھیں صف اول کے شعرا کا ہم نوا اور ہم مرتبہ بنا دیتے ہیں خواہ وہ کچھ ہی دیر کے لئے ہو:۔

خدا کی بے نیازی آہ مومن　　ہم ایمان لائے تھے جورِ بتاں سے
ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
چارۂ دل سوائے صبر نہیں　　سو تمھارے سوا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کرلے　　ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے

ایسے اشعار کے سامنے تقلید و تکرار کی دال نہیں گلتی اور حسرت نے ایسے اشعار نہ کہے نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ بھی ہے کہ مصحفی نے بڑے اشعار اور جرأت کی معاملہ بندی و ادابندی کی نادر ترین مثالیں بھی ایسے کارنامے ہیں جن میں ترقی کی گنجایش نہیں ہے اور جہاں تک حسرت پہونچ سکے۔ خیر یہ تو کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کسی کا بھی بہت اچھا شعر کہنے والے کا حصہ ہوتا ہے اور وہ مقلد کی ملکیت ہو ہی نہیں سکتا۔ حسرت ایک ایسے دور شاعری میں پیدا ہوئے جب ان کے مشہور معاصرین میں سے کسی نے تقلید اور نقالی کسی بڑے سے بڑے شاعر کی نہیں کی جب اُردو غزل تقلید یا تتبع سے بالکل پاک صاف ہو رہی تھی۔ اسی دور میں حسرت نے ایسی تقلیدی شاعری کی جس کی مثال نہ اب تک نظر آئی نہ پھر نظر آئے گی۔ لیکن یہ تقلید اتنی خلاقانہ ہے اس میں وہ جادو وہ موہنی ہے اس کے پرانے پن میں اتنا نیا پن ہے ــــــــــ کہ یہ کہنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ حسرت کی حیثیت ان کے معاصرین میں کسی سے کم ہے۔ بہ حیثیت مجموعی اور نفسِ شاعری کے لحاظ سے اگر وہ کسی سے کم ہیں تو میر، آتش اور غالب ہی سے کم ہیں۔ اور کسی سے نہیں۔

میں نے کہاں سے نفسِ شاعری کا ذکر کر دیا ؟ ۔ لیکن اب تو زبانِ قلم سے یہ بات نکل گئی۔ میں نے حسرت کے منتخب اشعار کا اقتباس دینے سے پہلے ان کے معاصرین کے منتخب اشعار دئے ہیں ان میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جو جہاں تک نفس شاعری کا تعلق ہے حسرت کے اشعار سے بہتر زیادہ حقیقی اور کہیں زیادہ پُرتاثیر ہیں۔ کچھ اور اشعار معاصرین حسرت کے لیجئے:۔

ثاقب لکھنوی:۔ چل اے ہمدم ذرا سازِ طرب کی چھیڑ بھی سن لیں　　اگر دل بیٹھ جائے گا تو اُٹھ آئیں گے محفل سے
نامعلوم:۔ اور کچھ باتیں کرو اے ہم صفیرانِ چمن　　یہ نہ پوچھو کیوں قفس میں مجھ کو آرام آ گیا
بہزاد لکھنوی:۔ آمری کائنات دل میری بہارِ زندگی　　آ، کہ میں یہ نہ کہہ سکوں مجھکو خدا نہ مل سکا
شاد عظیم آبادی:۔ اے دل مدعا طلب وقتِ سوال بھی تو ہو　　ہم کو بھی نام یاد ہے اپنے گدا نواز کا
عبرت گورکھپوری:۔ پوچھو مجھے کہ دہر میں اک کس مپرس ہوں　　دیکھو مجھے کہ ہیچ ہوں سب کی نگاہ میں

یاس :- سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے فسانۂ درد، سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

جوش ملیح آبادی :- سمجھے گا اسکا درد کون شورشِ کائنات میں تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

نامعلوم :- تری آنکھوں سے یہ آنسو کا ڈھلکنا توبہ میں نے گرتی ہوئی کونین کی قیمت دیکھی

نامعلوم :- خدا جانے یہ کیسی رہگذر ہے کس کی تربت ہے وہ جب گزرے ادھر سے گر پڑے کچھ پھول دامن سے

اختر شیرانی :- اک محبت تھی مٹ گئی یارب تیری دنیا میں اب دھرا کیا ہے

کسی خاتون کا شعر ہے :- بے تمھارے میں جی گئی اب تک تم کو کیا خود مجھے یقین نہیں

جگر بریلوی :- تم نہیں پاس کوئی پاس نہیں اب مجھے زندگی کی آس نہیں

اشرف مرحوم :- ہونٹوں پر تری تصویر جو سینے سے لگی کفر آیا ترے وحشی کو نہ اسلام آیا

اس طرح کے اشعار مزاج اور وجدان کو جس طرح متاثر کرتے ہیں حسرت کے اشعار اس طرح متاثر نہیں کر سکتے۔ لیکن حسرت کا مکمل کارنامہ اور ان کی مجموعی حیثیت اپنے کو منوا کر رہتے ہیں۔ حسرت نے دوئم درجے کی شاعری کو قدر اول کی چیز بنا دی۔ ان کی گلنار شاعری کاغذی پھول نہیں ہے بلکہ ایک سدا بہار اور سدا سہاگ چیز ہے۔

حسرت نے تین قسم کی غزلوں کا ذکر کیا ہے۔ فاسقانہ، شاعرانہ اور عاشقانہ۔ حسرت کی مراد یہ ہے کہ مثلاً داغ، امیر، ریاض کی اکثر غزلیں فاسقانہ ہیں۔ یگانہ یا جگر کی غزلیں عموماً شاعرانہ ہیں۔ میر سوز، بیدار، جرأت، مومن کی زیادہ سے زیادہ غزلیں اور خود حسرت کی سو فی صدی غزلیں عاشقانہ ہیں۔ یوں تو یہ اچھی خاصی تقسیم ہے۔ لیکن جہاں تک عاشقانہ غزل کا تعلق ہے، مندرجہ ذیل سب اشعار عاشقانہ غزل کی تحت میں آتے ہیں:-

غالباً جرأت :- جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں،

داغ :- وہ کہہ رہے ہیں مجھ سے مری مان جائیے اللہ تری شان کے قربان جائیے

نامعلوم :- ہاں ہاں تمھارے حسن کی کوئی خطا نہ تھی میں حسن اتفاق سے دیوانہ ہو گیا،

انور دہلوی :- نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے پسینا پونچھیے اپنی جبیں سے

نظام رامپوری :- انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

حسرت کا پورا کلام — اس مضمون میں انتخاب دیکھ لیجئے — حسرت کے معاصرین سے جو انتخاب اس مضمون میں دئے گئے ہیں ان کے بھی قریب قریب سب اشعار نہ فاسقانہ ہیں نہ محض شاعرانہ ہیں بلکہ سو فی صدی عشقیہ ہیں۔ مومن کے جو اشعار کچھ پہلے میں نقل کر چکا ہوں انھیں بھی دیکھیں۔ اب ذرا یہ عشقیہ اشعار بھی دیکھئے :-

میر :- جفائیں دیکھ لیاں کج ادائیاں دیکھیں بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

وجہ بیگانگی نہیں معلوم، تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ، کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

دکھلائے لے جا کے تجھے مصر کا بازار گاہک نہیں واں کوئی مگر جنس گراں کا

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں،

آتش :- آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

مرا پیام صبا کہیو میرے یوسف سے نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری

نسیم صبح سے مرجھا یا جاتا ہوں وہ غنچہ ہوں وہ گل ہوں جسے شبنم بلائے ناگہانی ہے

حسرت کی علمی و عملی زندگی

(شیخ ممتاز حسین جونپوری)

حسرت مرحوم تنہا واحد انسان نہ تھے وہ بجائے خود بہت سی خوبیوں اور کمالات کی ایک انجمن تھے اور طرح طرح کے پھولوں کے گلشن تھے کلی ہر بات ایک داستان ہے اور اس کا ذکر بہت طولانی۔ ان کے اشعار کی شرحیں لکھنے والے اور ان کے جوہر نمایاں کرنے والے اسوقت بھی اور آیندہ بھی ملیں گے اس لئے بہتر یہ ہے کہ ان کی عملی زندگی سے چن کر مختصراً دو چار واقعات اور مثالیں جو مجھے معلوم اور یاد رہ گئی ہیں پیش کر دوں۔

حسرت موہانی کی طرح کے انسان کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ حسرت مرحوم نے سیاسی اور قومی لیڈر کی حیثیت سے جیل کے باہر رہ کر اور جیل کے اندر بھی شاعری اور تخیل کا در کبھی بند نہیں کیا۔ جیل میں چکی پیستے جاتے تھے اور شعر بھی کہتے جاتے تھے۔ ان کا یہ شعر خود گواہ ہے :-

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی کیا طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

میں نے ایک بار حسرت مرحوم سے پوچھا کہ ارے بھائی ایسی مصیبت میں پسنے والے گیہوں کے ساتھ تخیل کو سنوارنے کا آپ کیسے انتظام کرتے تھے فرمایا کہ شاعری نے غم غلط کرنے اور صبر و شکر کی عادت ڈالنے اور اخلاق کے سنوارنے میں میرا ساتھ دیا۔ اگر شاعر نہ ہوتا، گاتا تو آتا نہ تھا جیل میں گیہوں کا پیسنا دوبھر ہو جاتا۔ گیہوں تو خود بخود پستا چلا جاتا تھا اور بعض لوگ شعر سننے کی لالچ میں کبھی کبھی میرے حصہ کا گیہوں پیسا دیا کرتے تھے۔

حسرت صاف باطن، ایماندار، صائب الرائے، بے تعصب اور خدا جانے کتنے صفات کا مجموعہ تھے اور ان کی عملی زندگی سے انسان کو بہت سے سبق حاصل ہوتے تھے۔ جب کہیں وہ مل جاتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بہت سے پولیٹکل جلسے، اگلے پچھلے زمانے کے مشاعرے اور علما و فقرا کے جلسے سامنے آ گئے۔ وہ ان کی سادگی، وہ ان کا تھیلا لٹکائے جلدی جلدی چلنا، کچھ میلے کچھ صاف کپڑے پہنے غریب و امیر سے یکساں ملنا، وہ بے کنگھی کی ہوئی گھنی داڑھی، وہ ان کی غیر مصنوعی اسلامی نمونے کی زندگی جب یاد آتی ہے تو دل تڑپ جاتا ہے ـــ ان کے اکثر اشعار ان کے اخلاق و سیرت کی کتاب کے منضبط ابواب ہیں۔ حسرت مرحوم اپنے بے لوث سیاسی کارناموں اور سب سے الگ قسم کی شاعری کی وجہ سے خاص شہرت اور دلوں میں اپنی عزت اور جلالت کی وجہ سے آج بھی ایک گم شدہ فرمانروا ہیں۔

خلوص عمل ـــ منشی پریم چند نے اپنے ایک فسانے میں کسی سیاسی بہروپئے کے احتجاجاً برت رکھنے یا فاقہ کرنے کا بہت مزیدار ذکر کیا ہے جس نے عہد برطانیہ میں فاقے پر فاقے کسی بات کے منوانے کے لئے کئے مگر عمل میں خلوص نہ تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی والوں نے اس کے ایک بے تکلف دوست کو اس پر مسلط کیا وہ ٹھنڈے پانی کی صراحی اور قلا قند جو اسے بہت مرغوب تھا لیکر اس کے پاس تنہائی میں گیا اور یہ تحفے پیش کئے اور کہا یہاں کوئی نہیں اسے چپکے سے کھالو۔ سیاسی بے وفا نے للچائی نظر سے پہلے تو دیکھ کر اتنا کہا کہ بھولا کی دوکان کا معلوم ہوتا ہے گر دن تصدیق کے لئے پوری ابھی ہلنے بھی نہ پائی تھی کہ قلا قند اور ٹھنڈا پانی سب حلق کے نیچے۔ سیاسی اور مذہبی زندگی ہی میں نہ صرف بلکہ مختلف دایرۂ حیات میں کتنی صورتیں ملیں گی جہاں صدق عمل اور صدق نیت کا فقدان ہے۔ اس کے مقابلے میں حسرت مرحوم کی زندگی کے ہزاروں اعمال سے اگر سب نہ سہی ایک نمونہ خلوص عمل کا پیش کر دیا جائے تو وہ حسرت کو سیرت کے پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر دیکھنے کے لئے کافی ہے۔ رات کا سناٹا ہے۔ اور وہ زمانہ جب جنگ آزادی جیتنے کے لئے بدیسی مال اور کپڑے ہر طرف جلائے جا رہے ہیں۔ ماگھ پوس کے کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے رات کے پچھلے پہر کا وقت ہے حسرت موہانی ایک گھر میں مہمان ہیں۔ ان کو اوڑھنے کے لئے ایک کمل ملا ہے۔ دفعتاً آنکھ کھلنے پر ان کو گمان ہوا کہ یہ بدیسی مال ہے۔ مولانا عبدالکافی صاحب اور شاہ نذیر احمد صاحب مرحوم مجھ سے خود ناقل تھے کہ اس وقت دیکھا گیا تو کمل الگ پڑا ہے اور خدا جانے کب سے حسرت کانپتے اور سامنے اپنے خلوص اور صدق عمل کا امتحان دے رہے تھے۔

ذوق سلیم — حسرت مرحوم کا جیسا سچا اور ایماندار نقادِ سخن اور صاحب ذوق سلیم میں نے تو اب تک نہیں دیکھا۔ دائرہ شاہ اجمل الہ آباد میں میرے عزیز دوست اور کرمفرما مولانا فاخر صاحب مرحوم نے جو خود بھی ذی علم شاعر تھے ایکبار حسرت موہانی کی فرمایش پر انتخاب کلام کے لئے کسی پُرانے استاد کا دیوان تھوڑی دیر کے لئے مرحمت فرمایا۔ حسرت مرحوم مجھے بھی ساتھ لیتے گئے تھے۔ حسرت صاحب بہت جلد جلد شعر پڑھتے جاتے تھے اور پسندیدہ شعروں پر نشان بناتے جاتے تھے۔ مجھسے فرمایا کہ ان منتخب شعروں کو لکھکر مجھے دیدینا۔ میں نے اور مولانا فاخر صاحب نے کہا کہ اگر ہم لوگ ان منتخب شعروں میں دو ایک شعر بڑھا دیں؟ فرمایا کہ مجھے پتہ لگ جائیگا۔ حسرت مرحوم کے ذوق سلیم اور شعر کی خوبیوں کا اندازہ کرکے دو بڑے اچھے شعر انکے منتخب شعروں میں ملا دئے گئے۔ حسرت مرحوم نے سب پڑھکر انھیں اضافہ شدہ دو شعروں کو بتا دیا کہ یہ میرے منتخب کردہ نہیں ہیں۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے ان کے پسندیدہ شعروں کی خوبیوں کے حوالے سے بحث کی ہے۔ موصوف نے ایسی سخن آموز اور پر از معلومات تقریر کی اور بہت سے اشعار درمیان درمیان میں سناتے گئے اور ایسے ایسے نکات بیان کئے کہ ماننا پڑا کہ ان دو شعروں میں کیا کمی رہ گئی ہے جس کی وجہ سے ان کی نقاد طبیعت نے ان دو شعروں کو چننا گوارا نہ کیا۔ وہ دن گزر گیا اور آج کا دن ہے کہ بہت سے شعر اور شاعر یاد آئے مگر آج جب حسرت مرحوم یاد آجاتے ہیں تو خدا بھی ضرور یاد آتا ہے کہ وہی پیدا کرے تو پھر حسرت جیسے نقاد اور سلیم المذاق شاعر اس دُنیا میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

اپنے آنکھ سے یہ واقعہ نہ دیکھ لیا ہوتا اور کوئی ان کے بارے میں یوں کہتا تو ایسی اعجاز نمائی کا مشکل ہی سے یقین ہوتا۔

اصابت رائے — حسرت موہانی پکے اور سچے حنفی المذہب مسلمان تھے، نہایت آزاد ضمیر کے مالک تھے، صحیح معنوں میں ایماندار اور بے لوث قسم کے باخبر اور صحیح الدماغ انسان تھے۔ وہ باوجود روزہ و نماز کے پابند ہونے اور اوامر و نواہی پر سختی سے عامل ہونے کے بہت سی رسمی باتوں میں اور معتقدات میں دوسروں کی رائے سے الگ رائے رکھتے تھے — ایک زمانہ میں مدح صحابہ اور قدح صحابہ کا جب جھگڑا زور ہوا اور اسلام کی شیرازہ بندی کی چولیں ہلنے لگیں تو حسرت مرحوم نے اس نزاع کی مصالحت میں جو حصہ لیا اور ان کی اصابت رائے نے جو کچھ کیا اس سے اخبار اور کاغذ کے صفحات معمور ہیں۔

جدید رنگ شاعری — بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ اُردو میں جدید رنگ شاعری کے موجد حسرت موہانی ہیں۔ تاریخ ادب اُردو میں اس موضوع کے ذیل میں سرور جہاں آبادی، عزیز، حسرت موہانی اور اثر لکھنوی کا جا بجا ذکر آیا ہے جس سے بہت ممکن ہے کہ ناواقف حضرات اس اہم مسئلہ کی نوعیت کو اور طرح سمجھ رہے ہوں اور ایک اہم غلطی پھیل گئی ہو۔ یہ مسئلہ ایک جداگانہ بحث اور تفصیلی گفتگو کا طالب ہے اور مصنف و مترجم تاریخ ادب اُردو اور دیگر ایسے مصنفین کے سامنے ممکن ہے کہ وہ مواد نہ رہے ہوں جن سے شاعری کے رنگ جدید پر بحث کی گئی۔ اسکی بڑی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس مسئلہ کے بہت سے اجزا اور بعض اشخاص اور انکی کوششیں اُنیسویں صدی کے آخر میں ہوئیں اور انکے نام اور کلام پردے میں رہ گئے۔ حسرت مرحوم کا سلسلۂ تلمذ دلی کی شاعری کے اسکول سے تھا۔ وہ تسلیم کے شاگرد، تسلیم نسیم کے شاگرد اور نسیم، مومن جیسے باکمال استادِ فن کے شاگرد تھے۔ دہلی کے رنگِ شاعری اور کلیۃً اُردو شاعری میں اصلاح کا خیال اور عملی سعی کی داغ بیل ۱۸۷۴ء میں آزاد نے ڈالی اور انجمن اُردو پنجاب کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کے زیر سرپرستی قایم ہوئی اور اسی میں بعد کو مولانا حالی اس سرگرمی اور انہماک سے شریک ہوئے کہ یہ سعی انھیں سے منسوب ہو گئی۔ لکھنؤ کی شاعری کا اسکول اس سعی سے قطعاً متاثر نہ ہو سکا تھا یہانتک کہ کچھ کچھ نظم و نثر کے شاعرانہ رنگ کے بدلنے میں سعی ہوتے ہوتے ۱۸۹۵ء میں انجمن پنجاب کے طرح کی ایک انجمن دائرۃ الادب کے نام سے مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم نے اسوقت کے روشن خیال صرف گنتی کے چند شعراء کے مشورے اور مدد سے لکھنؤ کے رنگ شاعری کی اصلاح کے لئے قایم کی۔ اس کا تفصیلی ذکر میں نے ظریف مرحوم کے دیوان کے مقدمہ میں کر دیا ہے اور پہلے شخص حسرت موہانی ہیں جنھوں نے اپنے مشہور رسالہ اُردوئے معلّی کے کسی سنہ میں ذکر اس طرح کیا ہے کہ لکھنؤ کے رنگ شاعری کے مصلح جناب صفی ہیں۔ صفی کی اس اصلاحی بزم کے اراکین میں جناب ناطق مرحوم، ڈاکٹر رسوا مرحوم اور دیگر حضرات تھے۔ اسی بزم کے اثرات نے لکھنؤ میں انجمن معیار پیدا کیا اور رنگ جدید کا نیا باب آغاز کیا۔ حسرت مرحوم نے رنگ شاعری بدلنے والے اکثر شعراء کے حالات اکثر خود مجھ سے دریافت کئے۔ ۱۸۹۵ء والی انجمن دائرۃ الادب کے جلسے والے تمام شعراء سے میرے مراسم رفتہ رفتہ بڑھتے گئے۔ شاید اب ان میں کا کوئی زندہ نہیں۔ لکھنؤ سے ایک رسالہ پیام یار انیسویں صدی کے آخر میں نکلتا تھا شاید اس میں اس کا ذکر ہو۔ حسرت مرحوم نے جب مسلم کالج علیگڈھ کے بعض جلسوں میں کچھ نظمیں جدید رنگ شاعری کی پڑھیں اور جب اُردوئے معلّی نکلا اور اس میں جدید رنگ کے اُبھارنے کا خیال پیدا ہوا تو اکثر مجھ سے انسے خط و کتابت رہی اور ایک بڑا طبقہ یہ اعتقاد رکھنے لگا کہ شاید حسرت موہانی ہی اس رنگ شاعری کے مصلح اور موجد ہیں مگر جب کسی نے ذکر کیا تو اللہ رے ایمانداری کہ انھوں نے لکھنؤ کے رنگ شاعری کا مصلح اور رنگ جدید کا موجد ہمیشہ جناب صفی کو نہ صرف زبانی بلکہ اُردوئے معلّی میں صفی کے نام کے ساتھ اور صفی کے ذکر کے ساتھ ظاہر فرمایا۔ حسرت موہانی کے رنگ شاعری پر بہت لوگ لکھ چکے اور لکھتے رہیں گے اسلئے میں نے صرف بعض واقعات پر کچھ لکھدیا ہے تاکہ یہ باتیں تاریخ ادب اُردو کے اضافے میں معین ہو سکیں اور چشم دید حالات و واقعات سے صحیح تاریخ مرتب ہو سکے۔

حسرت کا تغزل

(ڈاکٹر عبادت بریلوی)

حسرت زندگی کے لئے ایک معمہ تھے، لیکن زندگی حسرت کے لئے معمہ نہیں تھی۔ زندگی نے انھیں نہ سمجھا، لیکن انھوں نے زندگی کو خوب سمجھا تھا۔ دُنیا ان کو نہ برت سکی لیکن انھوں نے دُنیا کو خوب برتا۔ غالب دنیا کو نظریاتی طور پر "بازیچۂ اطفال" سمجھتے تھے لیکن حسرت اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ جو تماشا غالب کے سامنے شب و روز ہوتا رہتا تھا، حسرت اس تماشے کو پیش کرتے تھے۔ وہ زندگی پر حاوی تھے۔ انھوں نے اس پر اس طرح قابو پا لیا تھا کہ اس کی گرفت ڈھیلی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کی زندگی کامیاب زندگی نہیں تھی لیکن وہ اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے تھے۔ کیونکہ کامیابی کا تصور ان کے نزدیک مختلف تھا۔ وہ زندگی کی روایتی قدروں کے قایل نہیں تھے ان کے ذہنی و شعور کے ہاتھوں نئی قدروں کی تخلیق ہوتی تھی۔ وہ نئی دنیائیں تعمیر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تنہا تھے۔ لیکن ان کی یہ تنہائی ایک مستقل انجمن تھی۔

یہ عجیب بات ہے کہ حسرت اس دنیا کے نہ ہوتے ہوئے بھی اس دنیا کے انسان تھے۔ وہ زندگی کے بنے بنائے راستوں پر نہیں چلتے تھے بلکہ نئے راستے تعمیر کرتے تھے یا کم از کم ان کی تعمیر کا خواب ضرور دیکھتے تھے۔ ہر دم انھیں ایک نئے افق کی تلاش رہتی تھی۔ اور وہ اس نئے افق تک پہونچ بھی جاتے تھے کیونکہ ان کی پرواز محدود نہیں تھی۔ وہ فضاؤں میں بہت اونچے اُڑتے تھے۔ وادیٔ خیال کو "مستانہ" طے کرنا ان کی زندگی کا سب سے اہم پہلو تھا۔ لیکن وہ اس "وادیٔ خیال" کے ہو کر رہ جانے ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ انھیں زندگی سے مطابقت پیدا کرنی آتی تھی۔ اور یہی ان کا نصب العین تھا۔ وہ زندگی بھر تخیل اور زندگی میں مطابقت پیدا کرتے رہے۔ جو کچھ سوچتے تھے اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور دوسروں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ یہی نئی دُنیاؤں کی تعمیر و تشکیل تھی، یہی نئی قدروں کی تخلیق و تکمیل تھی جن کو حسرت کا مزاج وجود میں لاتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر فرد اس راہ میں ان کا ہمسفر ہو لیکن حسرت کی ہمسفری اختیار کرنا لوہے کے چنے چبانا تھا۔ بہت کم ان کا ساتھ دے سکتے تھے۔ کیونکہ ہر منزل کے اسباب کا راہ میں لٹ جانا یقینی تھا۔ حسرت نے اس سے مطابقت پیدا کر لی تھی۔ دوسرے اس کی تاب نہیں لاسکتے تھے۔ اس لئے ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ حسرت میں ایک انقلابی کی روح تھی۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں ایک انقلاب چاہتے تھے۔ لیکن ان کے مزاج کی انتہا پسندی ان کے ہاتھوں برپا ہونے والے انقلاب کو ایک ہنگامہ بنا دیتی تھی۔ اور وہ خود اس کا شکار ہو جاتے تھے۔ لیکن اسی میں ان کی بڑائی کا راز مضمر ہے۔ انھیں تھک کر بیٹھنا نہیں آتا تھا۔ ان کی روح بے چین تھی وہ حرکت کو زندگی سمجھتے تھے۔ چاہے یہ حرکت موت ہی سے ہم آغوش کیوں نہ کردے۔ حسرت کو حرکت میں موت بھی آتی تو وہ اُسے زندگی سمجھتے۔ کیونکہ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ہی ان کے نزدیک زندگی سے عبارت تھا۔ راستے کو وہ منزل خیال کرتے تھے۔ منزل کا کوئی اور تصور ان کے پاس نہیں تھا — یہی وجہ ہے کہ حسرت نے ناکامی کے باوجود بہت کچھ کیا۔ اور وہ زندگی کے ہر شعبہ میں آیندہ نسلوں کو کچھ نہ کچھ دے گئے۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہیں کہ انھوں نے بہت کچھ دیا۔

(۲)

حسرت کی شخصیت میں جو تنوع اور رنگا رنگی، مضبوطی اور استواری، جدت اور اپج پائی جاتی ہے اس نے ان کی زندگی کے ہر شعبے میں اپنا اثر دکھایا ہے۔ وہ ایک سیاست داں کی حیثیت سے دور رس نگاہ رکھتے تھے، نئی باتیں کہتے تھے، نئے طرز پر سوچتے تھے اور سختی سے ان باتوں پر قائم رہتے تھے۔ ہر شخص ان کی جدت و استواری کی داد دیتا تھا لیکن حالات کے تقاضے اس کو حسرت سے علٰحدگی پر مجبور کرتے تھے۔ کبھی کوئی منزل ایسی بھی آجاتی تھی جب ان کا بڑا سے بڑا مداح ان کی مخالفت کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا تھا لیکن وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھے رہتے۔ انھیں اپنے

ذریں اصولوں کے پابند رہے اس میدان میں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ لیکن انھوں نے مرتے دم تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ صحافت میں بھی جدت اور استواری کی یہ خصوصیات ان کے ساتھ رہیں۔ "اردوئے معلیٰ" برابر نکلتا رہا۔ چاہے ناسازگار حالات کے باعث سال میں ایک دو بار ہی کیوں نہ نکلا ہو اور چاہے اس میں حسرت کے ہاتھوں جو جدتیں ہوئیں وہ بھی کسی پر پوشیدہ نہیں۔ زبان اور ادب کی جو خدمات ان کے اس رسالے نے انجام دیں اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے اس میں بھی حسرت کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ "اردوئے معلیٰ" کو جن ناسازگار حالات کے سائے میں زندگی کے دن گزارنے پڑے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں۔ حسرت کے مزاج میں جو ایک قسم کا لاابالی پن تھا وہ انھیں سیاست اور صحافت کے میدانوں میں کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ یہ خصوصیات ان کی شخصیت میں شاعرانہ رنگ کو نمایاں کر سکتی تھیں۔ چنانچہ یہ رنگ ان کی شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں ہوا۔

حسرت نے اپنی شاعری کے لئے غزل کی صنف کا انتخاب کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صنف غزل کی تکنیک حسرت کے مزاج اور انکی افتادِ طبع سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔ حسرت کے مزاج میں جو ایک تلون اور انتشار ہے وہ غزل کے علاوہ کسی دوسری صنف میں نہیں سما سکتا۔ حسرت کی طبیعت میں جو بے باکی اور بے ساختگی ہے غزل میں وہ زیادہ بہتر طریقے سے نمایاں ہو سکتی ہے۔ ان کے یہاں لطیفہ سنجی کی جو خصوصیت ہے اس کے اظہار کے لئے غزل سے بہتر کوئی اور سانچہ نہیں ہو سکتا۔ پھر حسن و عشق کی مختلف کیفیات جن میں وہ ڈوبے ہوئے تھے، غزل سے زیادہ بہتر طریقے پر اس صنف میں بیان کی جا سکتی تھیں۔ حسرت کے فنکارانہ شعور نے انھیں تمام باتوں کو سامنے رکھ کر اپنے لئے غزل کی صنف کو منتخب کیا اور اس کو چار چاند لگا دئیے۔ غزل کی صنف نے اس کا اثر اسی طرح ادا کیا کہ حسرت اس نسبت سے زندۂ جاوید ہو گئے۔

شاعری کے لئے غزل کی صنف کا انتخاب حسرت کے فنکارانہ شعور پر دلالت کرتا ہے۔ خصوصاً اس ماحول میں جب بدلتے ہوئے حالات نئے اصناف کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ غزل کی بگڑی ہوئی کیفیت نے اس کی طرف سے لوگوں میں بدگمانی پیدا کر دی تھی۔ حسرت اپنے زمانے کی جدید سے جدید تحریکوں کے ساتھ وابستہ ہوتے ہوئے بھی غزل کی اہمیت کے قائل تھے۔ اس کی قدامت کے باوجود غزل کی سحرکاری کا انھیں احساس تھا۔ ابتدائی زمانے میں کچھ دنوں قیام میں انھوں نے نظمیں قصیدے اور قطعے وغیرہ بھی کہے تھے۔ چند انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے تھے لیکن بعد کو انھیں شاعری کے قابل نہیں سمجھا اور ضائع کر دیا ان کا ذکر حسرت نے خود کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حسرت نے غزل کی صنف کو صرف رسمی یا روایتی طور پر اختیار نہیں کیا، بلکہ شعوری طور پر اس طرف توجہ کی۔ دوسری اصناف میں طبع آزمائی کرنے کے بعد اس کو اپنایا۔ اس لئے کہ یہی صنف ان کی طبیعت اور مزاج سے ایک مناسبت رکھتی تھی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ غدر کے بعد سرسید کی تحریک کے زیر اثر غزل پر اعتراضات حالی کے ہاتھوں شروع ہوئے تھے اس سے وہ متاثر ہوئے، کیونکہ اس تحریک کے اثرات آفاقی تھے اور اس زمانے میں عموماً سب ہی اس کے اثرات سے متاثر ہو رہے تھے۔ چنانچہ غزل حسرت کے ہاتھوں میں ایک نیا رنگ روپ لیکر آئی۔ اور حسرت کے فن کی مشاطگی نے اسے اس طرح بنایا سنوارا اور نکھارا کہ اس پر ایک مرتبہ پھر لوگوں کا گمان ہونے لگا۔

غزل کو غزل بنانے اور اس کو تغزل کی معراج پر پہنچانے میں حسرت نے جو کام کیا ہے اس میں ان کے ماحول، ان کے نظریۂ حیات کے مطالعہ و تجربے کو بڑا دخل رہا ہے۔

(۳)

حسرت کو جو ماحول ملا وہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں ایک طرف تو پرانی روایات میں نئی جان ڈالی جا رہی تھی اور دوسری طرف نئی روایات کی عمارتیں از سرِ نو تعمیر کی جا رہی تھیں۔ سرسید کی تحریک کے آفاقی اثرات زندگی کے ہر شعبے میں اپنا اثر دکھا رہے تھے۔ ہر طرف اصلاح کا چرچا تھا۔ زندگی ایک نئے موڑ پر آ گئی تھی۔ صدیوں کا جمود حرکت سے بدل گیا تھا۔ افراد کے زنگ آلود ذہن اور تخیل پر جلا ہو گئی تھی اور وہ زندگی کو بدلتے ہوئے دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔ سیاسی شعور عام ہو رہا تھا۔ اپنے مسائل کو سمجھنے اور ان کو سلجھانے کی تمنا ہر فرد کے دل میں بیدار ہو رہی تھی۔ ... یہ سیاست متوسط طبقے کی سیاست تھی۔ اور

سیاست میں بھی کوئی انقلابی رنگ نہیں تھا۔ وہ سراسر اصلاحی تھی۔ لیکن بہرحال اس اصلاحی رجحان کے اثرات معاشرتی زندگی میں نئی روح پیدا کر رہے تھے۔ انحطاط و زوال کی آغوش میں پرورش پائی ہوئی کتافتیں چھٹنے لگی تھیں۔ گویا ایک نئے دور کا آغاز تھا سرسید کی تحریک کے ان اثرات کے ساتھ ساتھ برعظیم میں دوسری دوسری سیاسی تحریکیں بھی جنم لے رہی تھیں۔ حسرت نے کانگریس کی تحریک کا بچپن دیکھا تھا۔ قومی تصورات عام ہوتے ہوئے انھیں نظر آتے تھے۔ آگے بڑھ کر انھوں نے اس سے دلچسپی بھی لینی شروع کر دی تھی، لیکن کانگریس بھی ان دنوں متوسط طبقے کے چند تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت تھی، جس کے پیش نظر چند حقوق کا حاصل کرنا تھا۔ انقلابی کیفیت اس وقت اس جماعت میں نام کو نہیں تھی اور ایک زمانہ تک نہیں رہی لیکن وقتاً فوقتاً اس جماعت میں بعض حقیقت پسندوں کی طرف سے انقلابی خیالات کا اظہار ہوتا رہا۔ کانگریس نے جو نقشہ بنایا تھا، اس میں ان لوگوں نے انقلابی رنگ بھرنے کی کوشش کی۔ حسرت بھی ان حقیقت پسندوں میں سے ایک تھے۔ ان کے مزاج میں جو انتہا پسندی تھی وہ انھیں انقلاب اور بغاوت کے خواب دکھاتی تھی۔ چنانچہ وہ آگے بڑھنا چاہتے تھے، اور ان کی تمنا تھی کہ دوسرے بھی ان کے ساتھ اس میدان میں آگے بڑھیں۔ مصلحت کوشی کے وہ قایل نہیں تھے۔ خلوص، صاف گوئی اور بے باکی سے کام لینا ان کے نزدیک ضروری تھا۔

اس ماحول سے حسرت کو کئی چیزیں ملیں۔ تغیر کا صحیح احساس ان کے اندر پیدا ہوا۔ زندگی کو بہتر طریقے پر بدلنے کی خواہش ان کے یہاں بیدار ہوئی۔ اپنے تہذیبی ورثے کو از سر نو زندہ کرنے کا جذبہ ان کے یہاں نمودار ہوا۔ زندگی میں قول و عمل کا جو تضاد تھا اس کی حقیقت ان پر واضح ہوئی اور انھوں نے کھلم کھلا اس کی مخالفت کی۔ رفتار حیات میں شدت و تیزی پیدا کرنے کا شعور ان کے یہاں اُبھرا۔ اور انھیں تمام اثرات کے نتیجہ میں حسرت کی وہ شخصیت ہمارے سامنے آئی جو نڈر اور بے باک تھی، جو حق پسند اور صاف گو تھی، جو زندگی کا گہرا شعور رکھتی تھی، جو ایک انقلاب چاہتی تھی، جو کسی کی پروا نہیں کرتی تھی۔ جو اپنی قومی چیزوں کو از سر نو زندہ کرنا چاہتی تھی۔

حسرت کا یہ ماحول اور اس ماحول کے سائے میں تشکیل پائی ہوئی یہ شخصیت اور اس شخصیت کا یہ نظریۂ حیات اور ان سب کے اثرات حسرت کی شاعری میں پوری طرح نمایاں ہیں — بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے فن کی تشکیل و تکمیل میں ان خصوصیات نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ جو خصوصیتیں ان کی شخصیت میں ملتی ہیں ان کا عکس ان کے فن میں بھی نظر آتا ہے۔

جہاں تک حسرت کے مطالعے اور تجربے کا تعلق ہے، اس کی وسعت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ حسرت نے انسانی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ فطرت کے سارے اسرار و رموز ان پر بے نقاب تھے۔ انھوں نے زندگی کے ہر پہلو کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس کی نوعیت صرف نظریاتی نہیں تھی۔ عملی طور پر وہ اس میں شریک بھی ہوئے تھے۔ ہر شعبے کا انھیں تجربہ تھا۔ زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ساتھ مختلف علوم اور ادبیات کا مطالعہ بھی حسرت نے گہرائی کے ساتھ کیا تھا۔ اس میں بھی بڑی وسعت تھی۔ وہ ہر علم پر حاوی ہونے کی کوشش کرتے تھے اور ادب و شعر کا ذوق اور اس کے مطالعہ کا شوق تو گویا ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ مغربی ادبیات کے ساتھ ساتھ اس زمانہ میں حسرت نے اردو ادب کا مطالعہ باقاعدگی کے ساتھ کیا جب انگریزی کے تعلیم یافتہ اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کرتے تھے۔ اور نہ صرف خود مطالعہ کیا بلکہ اردو ادب سے دلچسپی لینے کی ایک فضا افراد میں پیدا کی۔ مختلف شعراء کے انتخابات کو اس سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کی غزل گوئی پر یہ تمام باتیں بھی مختلف زاویوں سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں رنگارنگی و بوقلمونی ہے، گہرائی و گیرائی ہے، حقیقت و واقعیت ہے، لیکن اُن سب باتوں کے باوجود اس میں اُن کی انفرادیت صاف جھلکتی ہے۔

حسرت کو جو ادبی ماحول ملا اس میں بھی سیاسی و سماجی ماحول کی طرح رنگارنگی تھی۔ ایک طرف تو سرسید کی تحریک کے زیر اثر ادب ایک نئی دنیا سے دوچار ہو رہا تھا۔ اس میں نئے خیالات آ رہے تھے۔ انفعالیت کی جگہ فعالیت لے رہی تھی۔ نئے سانچے بن رہے تھے۔ نئی اصناف ادب تخلیق کئے جا رہے تھے۔ ادب کو ایک پیغام کا حامل بنایا جا رہا تھا۔ اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جنھوں نے ان تبدیلیوں کی طرف مطلق توجہ نہیں کی تھی۔ اور وہ پُرانی روایات ہی میں ڈوبے اور کھوئے ہوئے تھے۔ ادب کی یہ نئی تبدیلیاں ان پر کوئی اثر نہیں کر رہی تھیں۔ وہ اس ماحول سے دور تھے، اور انھوں نے درباروں میں پناہ لی تھی۔ دربار لکھنؤ کے ختم ہو جانے کے بعد اب رام پور اور حیدر آباد کے دربار رہ گئے تھے۔ امیرالله

داغ نے یہیں اپنی محفلیں جما رکھی تھیں۔ اور یہ لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر غزل سرائی میں معروف تھے۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد لکھنؤ کی محفلوں پر اوس سی پڑ گئی تھی اور جہاں کسی زمانہ میں ہر روز عید اور ہر رات شب برات تھی، جہاں ہر لمحہ حسن و عشق کا کھیل کھیلا جاتا تھا۔ جہاں سر بازار آنکھ لڑتی اور دل کھیلتے تھے، وہاں اب ہر طرف خاموشی اور اداسی کا بسیرا تھا۔ اب عیش و عشرت کے چرچے باقی نہیں رہے تھے اب اس کا ردعمل حزن و یاس کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا اب وہاں کے شاعر بجائے عشوہ طرازیوں اور دلربائیوں کے گورستان اور لحد کا ذکر کرتے تھے۔ میت اور گور و کفن ان کے محبوب موضوعات تھے۔ تو حسرت نے گویا تین مختلف ادبی رجحانات دیکھے۔ وہ ان سب سے تھوڑا بہت متاثر ہوئے۔ سرسید کی ادبی تحریک سے انھیں واقعیت پرستی اور حقیقت پسندی ملی۔ امیر و داغ سے انھوں نے غزل کا لوچ اور اس کا بانکپن حاصل کیا۔ لکھنوی شاعری کے اس رجحان سے کوئی مثبت تاثر وہ قبول نہ کرسکے۔ بلکہ وہ ایک ردعمل کے طور پر اثر انداز ہوا۔ جس کے نتیجہ میں حسرت کی شاعری میں شگفتگی، لطافت، زندہ دلی، بے تکلفی، سادگی اور نفاست کی خصوصیات پیدا ہوئیں۔ اور اس طرح حسرت کی شاعری صحیح رنگ تغزل سے آشنا ہوئی۔

(۴)

حسرت کے تغزل کی تعمیر و تشکیل میں صرف ان کے ماحول ہی کو دخل نہیں ہے بلکہ وہ مختلف شعراء سے متاثر بھی ہوئے ہیں۔ یوں تو حسرت نے ہر اُردو شاعر کا گہرا مطالعہ کیا ہے لیکن میر، مصحفی، غالب، مومن، جرأت، تسلیم اور نسیم دہلوی خاص طور پر ان کے سامنے رہے ہیں۔ ان سب کو انھوں نے تنقیدی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے اور ان میں سے بعضوں کے اثرات ان پر بہت گہرے ہیں۔ بعضوں کی تقلید میں انھوں نے غزلیں کہی ہیں اور اس بات کا اعتراف کرنے میں جھجک محسوس نہیں کی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس تقلید میں بھی حسرت کی انفرادیت صاف جھلکتی ہے۔ وہ دوسرے رنگ کو اس طرح اپنا لیتے ہیں کہ ان کا اپنا رنگ اس پر غالب آجاتا ہے۔ اور جس کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کی خصوصیات پس منظر میں جا پڑتی ہیں۔ حسرت کی یہ خصوصیت ان کے اپنے رچے ہوئے مذاق پر دلالت کرتی ہے۔

حسرت میر کی سادگی اور سوز و گداز کے دلدادہ ہیں۔ چنانچہ اپنے تغزل کی یہ خصوصیات انھوں نے میر ہی سے لی ہیں۔ مومن کی رنگینی زندگی اور سرمستی انھیں پسند ہے، اور یہ رنگ ان کی شاعری میں اسی سرچشمے سے آیا ہے تسلیم و نسیم کی صاف گوئی اور بے باکی پر وہ فدا ہیں۔ اور یہ خصوصیات ان کی شاعری نے انھیں استادوں سے حاصل کی ہیں۔ لیکن حسرت ان تمام خصوصیات کو جمع کر کے چند قدم آگے بھی بڑھے ہیں، جرأت کی معاملہ بندی، انشا کی شوخی، غالب کی تعیش پرستی اور داغ کی ہوسناکی کے اثرات بھی ان کے تغزل میں کسی نہ کسی حد تک ضرور آئے ہیں۔ جرأت اور انشا کا تو خیر انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے:-

طرفہ حسرت یہ شوخیِ انشا ۔۔۔ رنگِ جرأت مرے بیاں میں ہے

اور داغ کا اعتراف اگرچہ انھوں نے نہیں کیا لیکن داغ کی ہوسناکی کے اثر سے وہ بچ نہیں سکے ہیں۔ البتہ اس معاملہ بندی، شوخی اور تعیش پرستی اور ہوسناکی میں انھوں نے بڑی ہی لطافت اور نفاست کی خصوصیات پیدا کی ہیں۔ ان کے بیان میں انتہا پسندی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے انھوں نے اس میں ایک اعتدال پیدا کیا ہے۔ اور ان کے ہاتھوں ان سب کو ایک ایسا پس منظر عطا ہوا ہے کہ وہ ان کو نہ صرف ایک نئے روپ میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، بلکہ ان کی تمام تر نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔ یہ پس منظر وہ معاشرتی ماحول اور انسانی فضا ہے جو حسرت کے تغزل کی بنیادی خصوصیت ہے ـــــ حسرت کا مذاق رچا ہوا ہے۔ تناسب اور توازن کا شعور ان کے اندر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مختلف رنگوں کی آمیزش سے انھیں ایک نیا رنگ پیدا کرنا خوب آتا ہے۔ چنانچہ وہ یہ رنگ پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ اور ان کے تغزل کی بڑائی کا راز اسی میں مضمر ہے۔

(۵)

حسرت کے تغزل میں حسن پرستی ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اور یہ حسن پرستی کا احساس ان کے یہاں بہت نمایاں ہے لیکن اس حسن پرستی

کی نوعیت ان کے تغزل میں روایتی نہیں ہے ۔ اردو شاعری میں حُسن پرستی کا جو تصور تھا اس کی رگوں میں حسرت نے نیا خون دوڑایا ہے ۔ چنانچہ اس کی ہیئت حسرت کے تغزل میں بدلی ہوئی نظر آتی ہے ۔ وہ اردو شاعری کے روایتی تصورِ حُسن سے مختلف ہے ۔

[اردو شاعری میں کچھ تو فارسی کے زیرِ اثر اور کچھ مخصوص حالات و واقعات کے سائے میں پرورش پانے اور پروان چڑھنے کی وجہ سے حُسن کا تصور بڑی حد تک خیالی اور تصوری نظر آتا ہے ۔ اردو شعراء عام طور پر خیالی دنیاؤں میں خیالی معشوقوں سے عشق کرتے رہے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معشوق کا دیدار تک نصیب ہونا ان کے لئے مشکل تھا ۔ پھر بھلا وہ معشوق کے حُسن کا تذکرہ کیسے کرتے ۔ اس کا احساس ان کے یہاں شدید کیسے ہوتا ۔ مخصوص معاشرتی ماحول محبوب کو سامنے تک نہیں آنے دیتا تھا ۔ شاعر کو صرف اس کی جھلک نظر آجاتی تھی ۔ اور وہ اس کے عشق میں مبتلا ہوجاتا تھا اور پھر اسکی شاعری ہجر و فراق کی ایک داستان بن جاتی تھی ۔ محبوب درمیان سے غائب ہوجاتا تھا اور شاعر ہجر و فراق کے صدمے سہتے رہتے تھے ۔ اس لئے اگر محبوب کے حُسن کا بیان ان کی شاعری میں ہوتا بھی تھا تو اس کی نوعیت خیالی ہوتی تھی ۔ احساسِ حُسن کی شدت کا اس میں پتہ نہیں چلتا ، اور اگر کہیں اس کے اثرات ملتے بھی ہیں تو وہ بہت ہی کم ہیں ۔ غالؔب کی شاعری میں البتہ خارجی حُسن کے احساس کا پتہ چلتا ہے ۔ کیونکہ غالؔب نے انسانی زاویۂ نظر سے اس کو دیکھا تھا اور ایک روایت سے بغاوت کی تھی ۔ چنانچہ وہ حُسن پرستی کے احساس کو عام کرنے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں ۔ لکھنوی شاعری میں خارجی حُسن کے احساس کا پتہ ضرور چلتا ہے لیکن اکثر جگہ ابتذال کی خصوصیت اس کی نفاست اور لطافت کا خون کردیتی ہے ۔ میرؔ ، جراؔت اور مومنؔ کے یہاں بے شک اس کی کچھ مثالیں ملتی ہیں لیکن غالؔب کی طرح ان کے یہاں اس سلسلہ میں ہمہ گیری نہیں پائی جاتی

حسرتؔ کے وقت تک آتے آتے حسن پرستی کے نئے تصورات عام ہوجاتے ہیں ۔ اس میں کچھ تو غالؔب کے اثر کو دخل تھا اور کچھ مغربی ادبیات اور خصوصاً مغربی ادبیات کی اس رومانی تحریک کا اثر تھا جس کی بڑائی کا راز اس کی حیاتی (Renaissance) انداز میں منعکس ہے ۔ شیلےؔ ، کیٹسؔ اور بائرنؔ وغیرہ کے نام اس سلسلہ میں لئے جاسکتے ہیں ۔ نئی پود ان سے بہت متاثر ہوئی ۔ اور ہماری شاعری میں جنگِ عظیم کے قریب چلنے والی رومانی تحریک میں ان کا خاصا اثر ہے ۔ حسرتؔ کے سامنے بھی یہ نمونے موجود تھے ۔ بدلتے ہوئے سماجی ماحول نے زمین طیار کر ہی دی تھی ۔ اس لئے انھیں احساسِ حسن کی بے باکانہ ترجمانی میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا ۔ ان کی افتادِ طبع اور ذہنی رجحان نے اس کو وقت کا تقاضا بنا دیا ۔ اور وہ اپنے تغزل کی بنیادیں اس پر استوار کرنے کے لئے مجبور ہوگئے ۔

حسرتؔ کے تغزل میں حُسن یا حُسن پرستی کا جو احساس ملتا ہے وہ خیالی اور تصوری نہیں بلکہ حقیقی ہے ۔ حسرتؔ نے حُسن کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کی سحر کاری کو محسوس کیا ہے ۔ ان کا تصورِ حُسن واضح اور غیر مبہم ہے ۔ اس کی نوعیت انسانی ہے ۔ انھیں گوشت پوست کے انسانوں میں حسن نظر آتا ہے ۔ اور وہ اسی انسانی حُسن کے شیدائی ہیں ـــــ اس انسانی حُسن کو وہ صنفِ لطیف کی ذات میں دیکھتے ہیں ۔ چنانچہ ان کے تغزل میں تمام تر نسوانی حُسن کا تذکرہ ہے ۔ صنفِ لطیف کی ذات ان کے یہاں اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ بے نقاب ہے ، اور وہ ان کی توجہ کا مرکز ہے ۔ چنانچہ صنفِ لطیف کے حُسن کی تمام تفصیلات کو حسرتؔ نے اپنے تغزل میں جگہ دی ہے ۔ وہ اس کی ایک ایک بات میں حُسن دیکھتے ہیں ۔ اسکے جسم میں ، جسم کے ایک ایک عضو میں ، رنگ میں روپ میں ، آواز میں ، گفتگو اور بات چیت میں ، چال ڈھال میں ، اٹھنے بیٹھنے میں ، دیکھنے بھالنے میں ، رونے دھونے میں ، ہنسنے مسکرانے میں ، خوشبو میں ، لباس میں ، غرض یہ کہ اس کی ہر بات اور ہر انداز میں حُسن کی کارفرمائی نظر آتی ہے ۔ صنفِ لطیف کی ان تمام باتوں میں وہ انداز دلبری اور طرزِ دلربائی کی خصوصیات دیکھتے ہیں اور یہی باتیں ہیں جو انھیں حسن کی طرف راغب کرتی ہیں اور وہ اس طرح اس کے شیدائی ہوجاتے ہیں کہ اُن کی ذات تک اس میں کھو جاتی ہے اور وہ اپنے حواس کو اس میں گم کردیتے ہیں ۔ اقبالؔ کو اس بات کا شکوہ تھا کہ ہند کے شاعر ، صورت گر ، اور افسانہ نویس کے اعصاب پر عورت سوار ہے ، لیکن حسرتؔ اس پر فخر کرتے ہیں کہ ان کا تغزل عورت کے بیانِ حسن سے عبارت ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ عورت اور اس کا حُسن حسرتؔ اور ان کے تغزل پر سوار ہے لیکن اس میں کسی غیر حقیقی ، غیر فطری اور غیر واقعی انداز کو دخل نہیں ہے انھوں نے اس میں عام زندگی سے مطابقت پیدا کی ہے ۔ اور انسانی کیفیات اور انسانی جذبات و احساسات کو اپنے پیشِ نظر رکھا ہے ۔ حسرتؔ اسی کے ترجمان ہیں اور ان کا تغزل اسی سے عبارت ہے ۔

لیکن حسرت اس حسن اور اس کے تمام لوازم کو صرف دیکھ اور دیکھ کر بیان نہیں کر دیتے بلکہ اس کو محسوس کر کے اس کی ترجمانی کرتے ہیں اور یہ احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ خود حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور اس طرح وہ کچھ اور بھی شباب پر آجاتا ہے۔ حسرت کے تغزل میں خارجی حسن کا بیان ہے ضرور لیکن احساس اس سے کہیں زیادہ ہے۔ غالب کی طرح وہ حسن کے خیالی پیکر تراشتے نہیں بلکہ اپنے آس پاس اس کو محسوس کرتے ہیں۔ اور یہ احساس محدود نہیں ہوتا۔ ہر طرف ان کی نظریں جاتی ہیں۔ وہ دور دور تک پہونچتے ہیں اور ان کی یہی خصوصیت ان کے تصور حسن میں بھی تنوع اور ہمہ گیری پیدا کرتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:-

محبوبی و رنگینی ہیں جزوِ بدن تیری　　سرشارِ محبت ہے خوشبوئے بدن تیری
یاد بھی دل کو نہیں صبر و سکوں کی صورت　　جب سے اس ساعدِ سیمیں کو کھلا دیکھا ہے
رونقِ پیرہن ہوئی خوبیِ جسمِ نازنیں　　اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا
رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا　　طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
اک بار سنی تھی سو مرے دل میں ہے موجود　　اے جانِ تمنا تری تقریر ابھی تک
کیا کیجیے بیاں اس تنِ نازک کی حقیقت　　خوشبو میں ہے گل بو تو لطافت میں ہے سب رنگ
اللہ ری جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود　　رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
چھیڑتی ہے مجھے بے باکیِ خواہش کیا کیا　　جب کبھی ہاتھ وہ پابندِ حنا ہوتے ہیں
کثرتِ حسن کی یہ شان نہ دیکھی نہ سنی　　برقِ لرزاں ہے کوئی گرمِ تماشا کیا ہو
جمالِ یار کی رنگینیاں ادا نہ ہوئیں　　ہزار کام لیا ہم نے خوش بیانی سے
وہ تبسم بھی قیامت ہے ترا بعدِ جفا　　تو نے دی ہے جسے خدمت نمک افشانی کی

اس قسم کے اشعار حسرت کے یہاں بہت پائے جاتے ہیں اور حسن پرستی کا یہ احساس حسرت پر اس طرح چھایا ہوا نظر آتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کبھی بھی اس سے علیحدہ نہیں کر پاتے۔ ان کی غزل کے ہر شعر میں کسی نہ کسی طرح اس کے اثرات ضرور نمایاں ہو جاتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ حسن پرستی کے سلسلہ میں احساس کی شدت حسرت کے تغزل کی امتیازی خصوصیت ہے اور اسی محور کے گرد ان کے دوسرے خیالات بھی گھومتے ہیں۔ یہ ایک ایسا سرچشمہ ہے جہاں سے ان کے تغزل کی دوسری خصوصیات کے چشمے بھی پھوٹتے ہیں۔ اس لئے ان کے تغزل کی دوسری خصوصیات کو سمجھنے کے لئے اس بنیادی خصوصیت کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

(۲)

احساس کی شدت نے حسرت کے تغزل کو حسیاتی خصوصیت (Sensuousness) کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ حسرت شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ اور اس شدید احساس کا تاثر ان پر بہت گہرا ہوتا ہے اور وہ خود اس میں کھو جاتے ہیں۔ اس لئے جب اس تاثر کا بیان ان کی غزل میں ہوتا ہے تو اس میں جزئیات، گہرائی اور واقعیت کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں اور پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ جو کچھ حسرت پیش کر رہے ہیں وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہے، جو بات حسرت کہہ رہے ہیں وہ ان کے دل میں موجود ہے۔ جو فضا اور ماحول وہ پیدا کر رہے ہیں وہ اس سے مانوس ہیں۔ جن کیفیات کا وہ اظہار کر رہے ہیں وہ اس کی زندگی کا بھی بڑا اہم حصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسرت کا ہر وار گہرا ہوتا ہے کیونکہ ان کی کوئی بات تاثر سے خالی نہیں ہوتی اور اس کا راز تمام تر ان کے تغزل کی اسی حسیاتی خصوصیت (　　　) میں مضمر ہے۔

حسرت کے تغزل کی اس حسیاتی خصوصیت کی نوعیت انفعالی نہیں ہے، بلکہ فعالی ہے۔ اگر مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو اردو شاعری اور خصوصاً اردو غزل کے مزاج میں یہ فعالیت ذرا کم ہی نظر آتی ہے۔ جرأت، غالب، مومن اور داغ نے بے شک اس طرف توجہ کی ہے، لیکن

اُردو شاعری کا عام رنگ یہ نہیں ہے ۔ میر کی شاعری میں حیاتی خصوصیت ہے لیکن اس کی نوعیت انفعالی ہے ۔ وہ ایسے جذبات و احساسات کی ترجمانی اس انداز میں کرتے ہیں کہ زندگی کے فعالی پہلو کا احساس نہیں دلاتے، بلکہ موت کو لاکر کھڑا کر دیتے ہیں ۔ جرأت، غالب، مومن اور داغ نے بھی اس خصوصیت کو پیدا کرنے میں کوئی معیار قایم نہیں کیا جرأت کی تان معاملہ بندی پر ٹوٹتی ہے داغ ہوسناکی تک جا پہونچتے ہیں ۔ مومن اور غالب کے یہاں یہ خصوصیت پیدا ضرور ہوتی ہے لیکن وہ مسلسل نہیں ہے ۔ کہیں کہیں اس کا احساس ہوتا ہے ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ذہنی کیفیت اس کو برقرار نہیں رکھ سکتی ۔ حسرت کے تغزل کا کمال یہ ہے کہ اس میں حیاتی خصوصیت ہر جگہ ملتی ہے ۔ اور اس کا فعالی پہلو کہیں بھی نظر انداز نہیں ہوپاتا یہ فعالی پہلو حسرت کے تغزل میں زندگی کا صحیح احساس پیدا کرتا ہے اور اس طرح حقیقت اور واقعیت کی خصوصیات اس کا جزو بن جاتی ہیں ۔ اسی حیاتی خصوصیت کا یہ اثر ہے کہ حسرت کے تغزل میں مختلف خیالات اور مختلف جذبات و احساسات کا بیان تصویروں کا روپ اختیار کر لیتا ہے ۔ یہ تصویریں احساس کی شدت، تاثر کی وحدت اور تخیل کی رفعت کے رنگوں سے تخلیق ہوتی ہیں ۔ حسرت کے تغزل میں ایسی تصویروں کی فراوانی ہے ان کے مزاج کی حیاتی قوت مختلف افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کو مختلف شکلوں کا روپ دیتی ہے اور ان شکلوں میں حسرت کا انداز بیان جان ڈال دیتا ہے ۔ چنانچہ ان کے تغزل میں یہ شکلیں اور یہ تصویریں منھ سے بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں ۔ حسرت کی انھیں خصوصیات نے ان کے تغزل میں مصوری کی شان بھی پیدا کی ہے ۔

حیاتی خصوصیت کے زیر اثر جو فعالی رنگ حسرت کے تغزل میں نمایاں ہوا ہے وہ چونکہ حقیقت سے بہت قریب ہے ۔ اس لئے اس کے ہاتھوں ان کے یہاں ایک مانوس انسانی فضا قایم ہوئی ہے ۔ حسرت نئی باتیں ضرور کہتے ہیں ۔ ان کے تغزل میں اُپج اور جدت کی خصوصیات سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں لیکن ان کو دیکھ کر اجنبیت کا احساس کہیں بھی پیدا نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر انسان اور انسانی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کو اپنی چیزیں معلوم ہوتی ہیں ۔

یہ حیاتی انداز حسرت کے تغزل میں مختلف اور متنوع موضوعات کو پیش کرنے کے سلسلہ میں نمایاں ہوتا ہے ۔ اور اس طرح ان کے سارے کلام میں اس کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ؎

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا ۔۔۔ کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

چھیڑا ہے دست شوق نے مجھ سے خفا ہیں وہ ۔۔۔ گویا کہ اپنے دل پہ مجھے اختیار ہے

ان کی نگاہِ مست کا جاتا نہیں خیال ۔۔۔ آنکھوں میں لطف شب کا ابھی تک خمار ہے

شکوۂ جور و جفا کو چھوڑ کر شکر ستم ۔۔۔ کیجئے اور خوب سا اُن کو پشیماں کیجئے

سب سے شوخی ہے اک ہمیں سے حیا ۔۔۔ اے فریب نگاہ یار یہ کیا

بے زبانی ترجمان شوق بے حد ہو تو ہو ۔۔۔ ورنہ پیش یار کام آتی ہیں تقریریں کہاں

اضطراب عاشقی پھر کار فرما ہو گیا ۔۔۔ صبر میرا ناشکیبائی سراپا ہو گیا

سادگیہائے تمنا کے ترے جاتے رہے ۔۔۔ ہو گئے مشتاق ہم اور وہ خود آرا ہو گیا

حسرت کے تغزل میں یہ حیاتی خصوصیات کچھ تو ان کی افتاد طبیعت اور ذہنی رجحان نے پیدا کی ہے اور کسی حد تک یہ رومانی شاعر خصوصاً شیلے، کیٹس اور بائرن کے اثر کا نتیجہ بھی ہیں ۔ ہر چند تغزل میں وہ تفصیل نہیں پیدا ہو سکتی جو ان شاعروں کی منظومات میں ملتی ہیں لیکن تغزل کے حدود کا خیال رکھتے ہوئے حسرت نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اس خصوصیت کو نباہا ہے اور اس طرح اُردو شاعری کو ایک نئے طرز سے آشنا کیا ہے ۔ اس میں خارجیت ضرور ہے، لیکن اس خارجیت کو انھوں نے تغزل کے لئے گوارا بنایا ہے ۔ اور اس خارجیت کو احساس میں سمو کر ایک نئے رنگ کی تشکیل کی ہے ۔ یہ رنگ اُردو شاعری میں ایک نئے باب کا افتتاح ہے ۔ اس نے تغزل کو معراج کمال پر پہونچا دیا ہے ۔

(۷)

احساس کے سانچے میں ڈھلی ہوئی اس خارجیت نے حسرت کے تغزل میں سموئی ہوئی ہر چیز کے نقوش کو بہت واضح کرکے پیش کیا ہے۔ خصوصاً محبوب کا تصور جس پر ان کے تغزل کی ساری عمارت کھڑی ہوئی ہے، بہت نمایاں طور پر اُبھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ حسرت کا محبوب ایک واضح شخصیت کا مالک ہے۔ اُردو شاعری کی روایات میں محبوب کے کردار کی وضاحت کو کوئی خاص حیثیت حاصل نہیں۔ گنتی کے چند شاعروں کے یہاں محبوب کی شخصیت اُبھرتی ہے، ورنہ عام طور پر محبوب کی شخصیت اور اس کا کردار مبہم رہتا ہے۔ اسے پوری طرح پہچانا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ بعض کو اُردو کے شاعروں سے یہ شکایت بھی رہی ہے کہ ان کی شاعری میں محبوب کے کردار کے خد و خال نمایاں نہیں ہوتے۔ اس کے کردار میں کوئی ارتقائی کیفیت نظر نہیں آتی۔ وہ ایک بے جان سی مخلوق معلوم ہوتا ہے۔ اور عام طور پر اس کی ذات نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ اس کے ہاتھوں دنیا جہان کے ہنگامے ظہور میں آتے ہیں لیکن وہ خود سامنے نہیں آتا۔ جیسے وہ کوئی ان جانی اور ان دیکھی طاقت ہو۔ اور اگر کہیں اس کی شخصیت کے نقوش اُبھرتے بھی ہیں تو وہ حقیقت سے دور ہوتے ہیں۔

حسرت نے اپنے تغزل میں جہاں اور روایت سے بغاوت کی ہے وہاں یہ موضوع بھی ان کے پیش نظر رہا ہے، ان کے یہاں محبوب کا تصور بہت واضح ہے۔ اس کی شخصیت ان کی شاعری میں پوری طرح اُبھرتی ہے۔ اس کے خد و خال اس آئینے میں پوری طرح نظر آتے ہیں۔ اسکے اقوال و افعال کی تصویریں بھی اس نگارخانے میں پوری طرح بے نقاب ہوتی ہیں اور حسرت کی حسیاتی خصوصیت نے ان سب میں ایک جان ڈال دی ہے۔ اور ان خصوصیات سے محبوب کی ایک ایسی تصویر بنتی ہے جو خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ جس کو دیکھا جا سکتا ہے، جس کو محسوس کیا جا سکتا ہے جس کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جس سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ حسرت صنف لطیف کے شیدائی ہیں۔ انھوں نے اپنے محبوب کے روپ میں اسی صنف لطیف کو پیش کیا ہے۔ اس میں انھیں تمام خصوصیات کی وضاحت کی ہے جن کو وہ صنفِ لطیف کی ذات کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ حسرت نے اپنے محبوب کو پیش کرنے کے سلسلے میں صنف لطیف کی عمومی خصوصیات کو پیش کیا ہے۔ ایسی خصوصیات جن کی طرف عام لوگوں کی نظریں نہیں جاتیں لیکن غیر شعوری طور پر ہر فرد حُسن کا شیدائی ہوتا ہے۔ اس طرح حسرت کے تغزل کا یہ پہلو آفاقی حیثیت بھی حاصل کر لیتا ہے۔

(۸)

حسرت کو اپنے محبوب سے اس والہانہ وابستگی میں بیسیوں منزلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ "کارِ محبت" میں وہ نہ جانے کتنے راستوں کی خاک چھانتے ہیں۔ اور یہ سب منزلیں، یہ تمام راستے انھیں ایسی فضاؤں میں لے جاتے ہیں جہاں ہر چیز حسین ہوتی ہے۔ جہاں رنگینیوں اور رعنائیوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ جہاں فضاؤں میں دلکشی ہوتی ہے، جہاں ماحول پُرکیف ہوتا ہے۔ اور اس پس منظر میں حسرت آسمانوں پر پرواز کرتے اور ستاروں سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ ان سب باتوں کی تحریک ان کے محبوب کی ذات ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے یہ دنیا بسائی نہیں جا سکتی۔ اور اس دنیا میں 'کارِ محبت' کی مختلف منزلیں طے نہیں کی جا سکتیں۔ حسرت کے تغزل کی بڑائی محبوب کے حُسن صورت اور حُسن سیرت کے بیان میں نہیں ہے۔ بلکہ ان کیفیات کے اظہار اور ان جذبات و احساسات کی ترجمانی میں ہے جو محبوب سے وابستگی کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں حسرت کے تغزل میں رنگینی اور رعنائی کی خصوصیات اپنے شباب پر پہونچ جاتی ہیں۔ گہرا نفسیاتی شعور اپنی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ زندگی کے حقایق کا گہرا احساس خلوص اور صداقت کو آنکھوں کے سامنے مجسم کر دیتا ہے۔ حسرت کے تغزل کا یہ پہلو بہت ہی اہم ہے۔

حسرت کا محبوب جس کا مفصل تذکرہ کیا جا چکا ہے وہ بہت ہی سادہ اور معصوم ہے۔ جب وہ خواہش کی حقیقت دریافت کرتا ہے تو حسرت سے کچھ بن نہیں پڑتا اور ان سے اس خواہش کی وضاحت نہیں ہوتی کیونکہ دل کی بات کا ہونٹوں تک آنا اور وہ بھی محبوب کے سامنے بہت مشکل ہوتا ہے۔ محبوب کا پاس محبت کا لحاظ اور اس خواہش کی نوعیت اسے اظہار سے باز رکھتی ہے ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ ہم سے تیری خواہش ہے سو کیا　　دل میں جو جو کچھ ہے میرے اب میں اُنسے کیا کہوں

کبھی یہ شوق کی بات حسرت کے یہاں کشمکش التماس میں پڑ جاتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ محبوب کو یہ بات کس طرح سنائی جائے ؎

کیونکر کوئی سنائے انھیں شوق کی وہ بات　　جو بڑھ گئی ہے کشمکش التماس میں

حسرت محبوب کے ساتھ بڑی روا داری برتتے ہیں ۔ وہ اسے رسوا کرنا نہیں چاہتے ۔ دور سے دیکھنا اپنا شعار بنا لیتے ہیں کیونکہ حسن کو رسوا کرنا ان کے خیال میں شیوۂ عشق نہیں ؎

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا　　شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

وہ محبوب سے ملتے ہیں لیکن اظہار تمنا نہیں کر پاتے ۔ اور یہ انداز ان کی سمجھ میں مطلق نہیں آتا ۔ یوں وہ مضطرب رہتے ہیں لیکن محبوب کے ملنے اور اظہار تمنا کرنے کے لئے جب یہ منزل آتی ہے تو وہ دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہے ؎

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت　　ان سے ملکر بھی نہ اظہار تمنا کرنا

البتہ کبھی کبھی وہ اپنے محبوب کو چھیڑتے ضرور رہیں ؎

کیا ہو یہ آج پوچھیں گے اس نازنیں سے ہم　　تجھ سا جو کوئی ڈھونڈھ نکالیں کہیں سے ہم

ظاہر ہے ایسی صورت میں اس کا جذبۂ رشک بیدار ہوگا ۔ اور پھر جو صورت حال پیدا ہوگی اس کو بخوبی تصور کیا جا سکتا ہے ۔ حسرت نے اس میں معنویت کی دنیا سمو دی ہے ۔

حسرت کا محبوب جفائیں کرتا ہے ، اور اس کی یہ خصوصیت عام ہے لیکن جب وہ اظہار التفات کرتا ہے تو ظاہر ہے اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہونی چاہئے ۔ حسرت اس کا اظہار نہیں کرتے لیکن یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بے سبب نہیں ہے ؎

حسرت جفائے یار تو اک عام ہے ادا　　اظہار التفات مگر بے سبب نہیں

حسرت اپنے محبوب سے ملنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اس سے ملتے ہیں ۔ اس لئے ملتے ہیں کہ شاید اس طرح بے تابیاں کم ہو جائیں گی لیکن ملنے کے بعد اضطراب شوق اور بھی بڑھ جاتا ہے ؎

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں　　ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

وہ محبوب کی خدمت میں سرگرم نیاز رہنا ضروری سمجھتے ہیں لیکن یہ نیاز ناز حسن میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے بلکہ اس کو "آشنائے ناز بے جا" کر دیتا ہے:

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرم نیاز　　تجھ کو آخر آشنائے ناز بے جا کر دیا

وہ محبوب کے عام ہتھکنڈوں سے واقف ہیں ۔ جب محبوب جفا کرتا ہے تو اس کا مطلب بھی بخوبی سمجھتے ہیں اس لئے اظہار التفات محبوب ان کے لئے ضروری نہیں بلکہ وہ محبوب سے کہتے ہیں اس زحمت سے کوئی نتیجہ نہیں اصل حقیقت عالم آشکارا ہے ؎

واقف ہیں خوب آپ کی طرز جفا سے ہم　　اظہار التفات کی زحمت نہ کیجئے

انھیں پہلے محبوب کی بے اعتنائی ستم معلوم ہوتی تھی لیکن جب اسے غور سے دیکھتے ہیں تو محبوب کی یہی بے اعتنائی ایک لطف نہاں کا روپ اختیار کر لیتی ہے ؎

ستم سمجھے ہوئے تھے ہم تری بے اعتنائی کو　　مگر جب غور سے دیکھا تو اک لطف نہاں پایا

حسرت ضبط کے قایل ہیں ۔ وہ ضبط کرتے بھی ہیں ۔ لیکن ضبط سے محبت کے راز کا چھپانا ان کے لئے مشکل ہوتا ہے کیونکہ کسی نہ کسی صورت سے انکی ذہنی اور جذباتی کیفیت ظاہر ضرور ہو جاتی ہے ۔ اگر خواہش شوق کو چھپاتے ہیں تو غم کا اظہار ہوتا ہے ۔

ضبط سے راز محبت کا چھپانا تھا محال　　شوق گر پنہاں ہوا غم آشکارا ہو گیا

حسرت کا محبوب شوخ ضرور ہے لیکن حسرت کی نگاہ محبت کے سامنے وہ اپنی شوخی بھی بھول جاتا ہے اور اسے شرارت کی جرأت نہیں ہوتی ۔ حسرت اس کی شوخی کے شیدائی ہیں اس لئے اپنی نگاہ محبت کو سرزنش کرتے ہیں ؎

حسرت تری نگاہ محبت کو کیا کہوں　　محفل میں رات ان سے شرارت نہ ہو سکی

لیکن حسرت کی گستاخ دستیاں اور عشق کی بے باکیاں اس بات کا یقین رکھتی ہیں کہ وہ محبوب کو شوخی اور شرارت سب کچھ سکھا لیں گی ؎

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا لے گی　　　اے حسنِ حیا پرور شوخی بھی شرارت بھی

حسرت کے یہاں خواہش کا جذبہ بہت استوار ہے۔ شوق ان پر غالب رہتا ہے۔ اور وہ اظہار خواہش بھی کرتے ہیں لیکن محبوب اس پر سیماب پا ہو جاتا ہے، اسے غصہ بھی آتا ہے حیرت بھی ہوتی ہے اور وہ انکار بھی کر دیتا ہے۔ لیکن حسرت اس سے لطف لیتے ہیں ؎

اے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی　　　جس پر انھیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی

ان کے خیال میں محبوب کا التفات سے انکار اقرار محبت ہے ؎

صاف اقرار ہے محبت کا　　　آپ کا التفات سے انکار

حسرت خواہش یا آرزو کے مفہوم رنگیں کو الفاظ میں واضح کرنا نہیں چاہتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ محبوب کے طبع نازک پر گزرے گا ؎

گراں گزرے گا حرفِ آرزو اس طبع نازک پر　　　نگاہِ شوق اس مفہوم رنگیں کو ادا کر دے

حسرت کا محبوب آرایش کا مشتاق ہے۔ اسے حنابندی کا شوق بھی ہے لیکن یہ حنابندی حسرت کو بے قرار کر دیتی ہے اور اس عالم میں انھیں بے باکیٔ خواہش کچھ زیادہ ہی ستاتی ہے ؎

چھیڑتی ہے مجھے بے باکیٔ خواہش کیا کیا　　　جب کبھی ہاتھ وہ پابندِ حنا ہوتے ہیں

حسرت محبوب کی نفسیات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ محبوب کے دل کی بات انھیں معلوم ہو جاتی ہے — اور یہ سب ان کی شدت شوق کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے:-

معلوم ہو گئی مرے دل کو زراہِ شوق　　　وہ بات پیار کی جو ہنوز اُس دہن میں تھی

حسرت کو محبوب کی یاد برابر ستاتی رہتی ہے۔ اور ان کی زندگی میں ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب محبوب کی یاد اضطراب کو بڑھانے کے بجائے ان پر خاموشی طاری کر دیتی ہے۔ یہ خاموشی بہت معنی خیز ہے ؎

سُن کے ذکرِ عشق رہ جاتے ہیں ہم اکثر خموش　　　اب تلک اتنا اثر باقی ہے ان کی یاد کا

حسرت عشق میں جان دے دینے کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کے بعد بھی انھیں پچھتانا پڑتا ہے، کیونکہ محبوب کی شخصیت ان کی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اور وہ اپنے جان دینے پر نادم ہو جاتے ہیں ؎

نادم ہوں جان دے کے آنکھوں کو تو نے ظالم　　　رو رو کے بعد میرے کیوں لال کر لیا ہے

محبت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب چھپنے لگے اور سامنے نہ آئے لیکن حسرت اس کے اس انداز پر یہ کہکر اسے چھیڑتے ہیں کہ اگر آنکھوں کے بجائے دیدۂ دل سے اُسے دیکھا جانے لگا تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ شرم سے کچھ اور بھی لجائے گا۔ حسرت کا مدعا یہی ہوتا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں ؎

مجھ سے تم چھپنے لگے اچھا کیا یوں ہی سہی　　　اور جو میں اب دیدۂ دل سے تمھیں دیکھا کروں

حسرت کو محبوب کی نگاہِ ناز دیوانہ بنا دیتی ہے۔ آتشِ شوق اور بھڑکتی ہے۔ اور وہ بیگانۂ ادب ہو کر گستاخی دستی پر اُتر آتے ہیں:-

بیگانۂ ادب کئے دیتی ہے کیا کروں　　　اُس محوِ ناز کی نگہِ آشنا مجھے

ان کی گستاخی محبوب کو ناراض بھی کر دیتی ہے۔ لیکن اس ناراضگی میں بھی ایک لطف ہوتا ہے — جب محبوب انھیں گستاخ پاتا ہے تو اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اس کی مہربانی انھیں کبھی نصیب نہیں ہو گی۔ لیکن اس میں جو چیز چھپی ہوئی ہے وہ کچھ اور ہے ؎

گستاخ وہ پا کے مجھکو بولے　　　اب پھر جو کبھی ہوں مہرباں ہم

یہ اور اسی طرح کی کیفیات سے حسرت کا کلام بھرا پڑا ہے۔ یہی جذبات و احساسات یہی راز و نیاز ان کے تغزل میں قدم قدم پر ملتے ہیں۔ اسمیں بھی کہیں کہیں خارجیت کا اثر ضرور آ جاتا ہے لیکن حسرت نے اس کا تذکرہ ردعمل کے طور پر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ موضوعات حسرت کے تغزل

میں محسوسات کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ ان محسوسات میں تنوع ہوتا ہے، بلندی ہوتی ہے، رنگینی ہوتی ہے، رعنائی ہوتی ہے، ایک والہانہ انداز ان میں ملتا ہے۔ شوخی اور بے باکی بھی اپنا اثر دکھاتی ہے، لذت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ کسی حد تک سرمستی بھی نظر آتی ہے، فکر کی گہرائی اسمیں نہیں ہے، لیکن محسوسات کی شدت اس میں ایک دوسری نوعیت کی گہرائی پیدا کرتی ہے، جس سے حسرت کے گہرے انسانی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

(۹)

یہ تمام جذبات و احساسات اور یہ ساری کیفیات جو حسرت کے تغزل کا نماں حصہ ہیں، ظاہر ہے، محبت اور عشق و عاشقی کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ حسرت نے محبت کی ہے۔ وہ عشق کی راہوں سے گزرے ہیں۔ اس لئے انھیں اس کی اہمیت کا احساس ہے۔ ان کے یہاں عشق کا ایک واضح تصور بھی ملتا ہے۔ اس تصور کی نوعیت مابعد الطبیعیاتی یا فلسفیانہ نہیں ہے۔ وہ انھیں جذبات و احساسات سے مترتب ہوتا ہے۔ اسکی نوعیت انسانی اور مادی ہے۔ اس کی بنیادیں حقیقت و واقعیت پر استوار ہیں۔ انھوں نے عشق کا ایک عمومی تصور پیش کیا ہے۔ وہ خیالی عشق کے قائل نہیں ہیں عشق کے افلاطونی تصور سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔

حسرت کے تغزل میں عشق کا جنسی تصور ملتا ہے۔ حسن پرستی ان کے تصور عشق کا لازمی جزو ہیں۔ اور یہ حسن پرستی ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر لذت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ لذتیت حسرت کے یہاں ہوسناکی کا روپ اختیار نہیں کرتی۔ ان کے خیال میں عشق کرنا، انسانی فطرت میں داخل ہے اور اس کے بغیر انسانی زندگی کی تکمیل ناممکن ہے۔ لیکن اس سے ان کی مراد عشق کا وہی جنسی اور مادی تصور ہے، جس کو بڑی انسانی اہمیت دیتا ہے۔ حسرت نے اس تصور کے تمام لوازم اور عناصر کی بہت تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ ان کی ساری شاعری اسی سے عبارت ہے۔ لیکن اس کو دیکھنے سے اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ باوجود جنسیت اور مادیت کے وہ عشق میں پاکیزگی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ خلوص و صداقت اس کی تکمیل کے لئے لازمی ہے۔ اس کی کسوٹی پر پورا اترنے کے لئے ہجر و فراق کے مرحلے بھی کاٹنے ہوتے ہیں۔ جنون اور دیوانگی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ صحراؤں اور ویرانوں کی خاک بھی چھاننی ہوتی ہے۔ محبوب کے کوچے میں بھی جانا ہوتا ہے۔ رسوائی بھی سہنی پڑتی ہے۔ رقیب سے مقابلہ بھی کرنا ہوتا ہے۔ نامہ و پیام کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ وصل کے لئے منصوبے بھی باندھنے پڑتے ہیں۔ چوری چھپے ملنے کی کوشش بھی جاری رکھنی ضروری ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ ان تمام منزلوں سے گزرنا ہوتا ہے جو روایتی عشق کے لئے ضروری ہوتی ہیں لیکن ان سب کے باوجود حسرت نے اپنے تصور عشق کی بنیاد اچھوتے مبادیوں پر قائم کی ہے۔ اسی وجہ سے اس میں جدت اور اپج کا احساس ہوتا ہے۔

تصور عشق کی تشکیل میں حسرت کا زاویۂ نظر نفسیاتی رہا ہے۔ وہ عشق کو انسانی فطرت کے آئینے میں دیکھتے ہیں اور وہ انسانی فطرت میں انھیں عشق نظر آتا ہے۔ اس لئے وہ عشق کے معاملہ میں زندگی کی بنیادی حقیقتوں تک پہونچتے ہیں۔ اور اس کے سارے اسرار و رموز ان کے سامنے بےنقاب ہو جاتے ہیں۔ حسرت نے عشق کے تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا ہے لیکن ان کو دیکھا اور محسوس ضرور کیا ہے۔ اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا تصور عشق انسانی نفسیات سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔

حسن پرستی ایک انسانی جذبہ ہے اور نفسیاتی اعتبار سے انسانی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ حسرت اس حسن پرستی کو عشق کا مذہب قرار دیتے ہیں اور ثواب و عذاب سے کوئی غرض و مطلب نہیں رکھتے ؎

مذہب عشق ہے پرستش حسن ہم نہیں جانتے ثواب و عذاب

ہر چند ان کے تصور عشق میں لذتیت غالب ہے لیکن عشق کے راستے میں انھیں کہیں کہیں رنج و غم و الم سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن حسرت کے نزدیک ان دشواریوں کے باوجود استقامت لازمی ہے۔ عاشق کو ان کے نزدیک "وفا نہاد" ہونا چاہئے ورنہ اس کو بندۂ عشق کہا ہی نہیں جا سکتا ؎

جان کو محو غم بنا دل کو وفا نہاد کر بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہ مراد کر

وہ عاشق کے لئے مرمٹنے اور جان دے دینے کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں عاشق کا انتہائی سخت روداد ہوتی ہے۔ وہ عشق کی

بارگاہ میں اپنی جان نذر کر دیتا ہے ؎

عاشق ہوئے اور مر مٹے ہم   اپنی تو یہ مختصر ہے روداد

موت سے پہلے عشق میں فنا ہو جانے کو بھی وہ مستحسن خیال کرتے ہیں ؎

کیوں عشق میں ابھی سے نہ ہو جائیں ہم فنا   کیا جانئے کہ موت کب آتی ہے کب نہیں

لیکن وہ ان خیالات پر جمتے نہیں۔ ان کے عشق کی تان پرستشِ حسن پر جا کر ٹوٹتی ہے جس میں ان کی نگاہ شباب کو بھی دخل ہوتا ہے۔ وہ ایسے عشق کو صادق ہی نہیں سمجھتے جس کو نازِ حسن کا پاس ادب نہ ہو۔ ان کے خیال میں عشق کے لئے نیازمندی لازمی اور ضروری ہے ؎

صادق نہیں وہ عشق جسے از رہِ نیاز   منظور نازِ حسن کا پاس ادب نہیں

وہ عشق خوباں کو فریب حسن و نیرنگ نظر کے سوا اور کچھ سمجھتے ہی نہیں ؎

نہیں کچھ کائنات عشق خوباں   فریب حسن و نیرنگ نظر ہے

غرض یہ کہ حسرت عشق میں انسان کے بنیادی ایمانی جذبات کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تصورِ عشق کی بنیادیں نفسیات پر استوار نظر آتی ہیں۔

انسانی زندگی میں خواہش سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ حسرت کے تصورِ عشق میں بھی اس خواہش اور خواہش پرستی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ وہ اس کا لازمی جزو اور بنیادی عنصر ہے۔ اسی خیال نے حسرت کو شاعرِ شوق بنایا ہے۔ شوق کا تذکرہ ان کے تغزل میں بار بار آتا ہے اس شوق سے مراد وہی خواہش ہے جس کی تکمیل کے لئے انسان عشق کی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ اور عشق کی دنیا میں ساری رنگینی اور ساری رعنائی اسی شوق کے ہاتھوں پیدا ہوتی ہے۔ چند اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا ؎

محفل میں دل کا حال چھپے کیا کہ شوق کو   اُس نازنیں سے رخصتِ بے گانگی نہیں

شوق بے حد کے ارادوں سے ہے واقف نازِ حسن   شرمِ خوباں سب سمجھتی ہے زبانِ اضطراب

شوق کو ان سے عقیدت دیکھنا اکثر ہوا   تیری بے پروائیوں پر اشتباہِ التفات

شوق کی بے تابیاں حد سے گزر جانے لگیں   وصل کی شب وا جو وہ بندِ قبا ہونے لگا

شوق کو اتقا سے کیا نسبت   رند ہوتے نہ ہم تو کیا ہوتے

اب آرزوئے شوق کی بے تابیاں کہاں   یعنی وہ سب لوازمِ عہدِ شباب تھا

اے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی   جس پر انہیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی

یہ شوق حسرت کو وصل کی منزل تک پہونچاتا ہے۔ اور یہی گویا ان کے عشق کا مقصد ہے۔ وصل کو عشق میں اہمیت دینے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے وہ 'خوئے عوام' ہے ؎

وصل بتاں کی خواہش خوئے عوام ٹھہری   حسرت خیال خوباں سودائے خام نکلا

چنانچہ حسرت اپنے عشق کو صرف خیالِ خوباں تک محدود نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے وصل کی منزل تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انکے تغزل میں قدم قدم پر اس کا احساس ہوتا ہے۔

حسرت نے عشق کا جو تصور پیش کیا ہے وہ فعالی ہے۔ انفعالی نہیں۔ اس لئے وہ اُردو شاعری کے روایتی تصورِ عشق سے مختلف ہے۔ غالب تصورِ عشق کے اثرات اس میں کسی حد تک ضرور نظر آتے ہیں لیکن مجموعی اعتبار سے حسرت کا عشق غالب سے بھی مختلف نظر آتا ہے۔ غالب عشق کے رستے میں کہیں کہیں گہرائی کے ساتھ سوچنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ حسرت سوچتے نہیں۔ فعالیت اور لذتیت دونوں میں مشترک ہے لیکن غالب کے مقابلہ میں حسرت کے یہاں زیادہ اعتدال ہے۔ شاید یہ اعتدال اور دھیماپن ان سماجی حالات کا پیدا کردہ ہے جس میں حسرت کے عشق کی نشوونما

ہوئی۔ حسرت کے یہاں یہ اعتدال حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسرت کے تصورِ عشق میں ان کی انفرادیت صاف جھلکتی ہے۔

(۱۰)

حسرت کے تغزل میں عشق کا جو تصور ملتا ہے، اُس کی تصویر ایک مخصوص سماجی پس منظر میں اُبھرتی ہے۔ وہ ایک مخصوص فضا میں پرورش پاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی نشوونما ایک مخصوص ماحول میں ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ پس منظر یہ فضا اور یہ ماحول متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور حسرت نے اس متوسط طبقے کے عشق کی زندگی سے بڑی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ اس میں ایک مقامی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ایک مانوس فضا وجود میں آگئی ہے۔ کیونکہ پڑھنے والے کو اس میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ ماحول اسے اپنا ماحول معلوم ہوتا ہے۔ یہ فضا اسے اپنی فضا محسوس ہوتی ہے۔ حسرت کے تغزل کی اس خصوصیت نے اس کو حقیقت و واقعیت سے کچھ اور بھی قریب کر دیا ہے۔

اُردو شاعری میں عام طور پر عشق کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اس کی فضا روایتی رہی ہے۔ اکثر شاعروں نے روایتی پس منظر ہی کو اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔ چنانچہ زیادہ اُردو شاعروں کے عشق کی فضا ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نظر نہیں آتی۔ جس پس منظر میں وہ اپنے عشقیہ واقعات کو بیان کرتے ہیں اور عشقیہ کیفیات کی تصویریں کھینچتے ہیں وہ ایک دوسرے سے نمایاں طور پر مختلف نہیں۔ اس میں یکرنگی اور یکسانی کا احساس ہوتا ہے بعض دوروں میں ان کے اپنے حصوں میں اثرات ضرور جھلکتے ہیں۔ لیکن ویسے مجموعی طور پر ان کی نوعیت ایک جیسی ہے۔ یہ ایک بات یہ بھی ہے کہ عام طور پر اُردو شاعروں کے عشق میں اونچے طبقے کا پس منظر ملتا ہے۔ جو شاعر اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، ان کا یہ انداز تو خیر سمجھ میں آسکتا ہے اور وہ اس کا جواز بھی پیش کر سکتے ہیں، لیکن جو شاعر اس طبقے کے نہ ہوتے ہوئے بھی اس طبقے کے پس منظر کو سامنے رکھ کر شاعری کرتے تھے، انھیں سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ وہ لکیر کے فقیر ہیں اور ان کے اندر حقیقت و واقعیت کا کوئی شعور نہیں۔ اس کے علاوہ اُردو شاعری میں یا تو ایک طرف ایسے ماحول میں عشق کی ترجمانی ملتی ہے جس میں محبوب سامنے نہیں آتا اور عشقیہ کیفیات کی پوری طرح وضاحت نہیں ہوتی یا پھر دوسری طرف اس فضا میں عشقیہ خیالات کو پیش کیا جاتا ہے جو ہوسناکی کی فضا ہوتی ہے۔ جس میں محبوب بازاری ہوتا ہے۔ اس لئے صحیح عشقیہ پس منظر اپنی لطیف صورت میں ان دونوں پہلوؤں کے اندر نہیں اُبھرتا۔ پہلی صورت میں وہ گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ اور دوسری صورت حد سے زیادہ آگے بڑھ جاتا ہے۔

حسرت کے سامنے اُردو شاعری کی یہ تمام خصوصیات تھیں۔ انھوں نے ان کو ایک تنقیدی زاویۂ نظر سے دیکھا تھا اور ان پر غور کیا تھا۔ انھیں اپنی ذات، اپنے ماحول اور اپنی فضا سے گہری دلچسپی تھی۔ اور انھیں ان کی اہمیت کا احساس تھا۔ اس لئے انھوں نے اپنے تغزل میں اس فضا، اس ماحول اور اس پس منظر کو سمویا جس کے خود وہ ایک فرد تھے۔ حسرت کی طبیعت کا یہ خاصہ تھا کہ وہ کوئی ایسی بات نہیں کر سکتے تھے جو ان کی طبیعت سے مناسبت نہ رکھتی ہو۔ ان کی طبیعت کو اس ماحول اور اس سماجی پس منظر سے مناسبت تھی۔ اس لئے وہ اپنے تغزل کی بنیاد اس پس منظر میں رکھنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ان کی ساری شاعری میں یہ پس منظر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

ان کا تغزل اور اس میں سموئے ہوئے تمام واقعات ان کے محبوب کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ محبوب متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اس طبقے کے ماحول میں عام ہیں۔ وہ پردہ کرتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس کی نقاب اُٹھ جاتی ہے۔ وہ عام طور پر سامنے نہیں آتا لیکن کبھی کبھی بام پر آجاتا ہے تو سامنا ہونے لگتا ہے۔ اس میں سادگی اور معصومیت ہے۔ وہ غرفے سے آنکھیں لڑاتا ہے۔ کیونکہ ماحول بے باکی کے ساتھ سامنے آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ محفل میں بیٹھتا ہے تو عاشق کی طرف نہیں دیکھتا کیونکہ اس طرح رازِ عشق کے افشا ہو جانے کے امکانات ہیں۔ وہ راستے میں کہیں مل جاتا ہے تو اپنا ہونٹ کاٹ کر جدا ہو جاتا ہے کیونکہ اس طرح رسوائی کے امکانات ہیں اور رسوائی کو سماجی ماحول گوارا نہیں کرتا۔ وہ باعصمت اور حیا پرور ہے لیکن وصل کی شب بے حجابی بھی کرتا ہے۔ شوق کی بے باکی پر اسے غصہ بھی آتا ہے۔ حیرت بھی ہوتی ہے اور وہ انکار بھی کرتا ہے۔ غرضکہ اس کی تفصیل کہاں تک بیان کی جائے۔ حسرت کے تغزل میں ہر جگہ پوری طرح اس کی ترجمانی ملتی ہے ہر خیال اور ہر جذبے کو پیش کرنے میں اس سے کام لیا جاتا ہے۔ ان کے تغزل میں اس کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

(۱۱)

حسرت کے تغزل کا تجزیہ مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ان کے تغزل کے فنی اور جمالیاتی پہلو کی مختلف خصوصیات ظاہر کیجائے کیونکہ ان کے تغزل کو تغزل کے صحیح مفہوم سے ہمکنار کرنے اور اس کے اندر ان خصوصیات کا رنگ بھرنے میں اس فنی اور جمالیاتی پہلو کو بڑا دخل ہے وہ ان کے سارے تغزل پر حاوی نظر آتا ہے۔ ہر طرف اس کی حکمرانی معلوم ہوتی ہے۔

یہ فنی اور جمالیاتی پہلو حسرت کے طرز ادا، لہجے، انداز اور رنگ سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ حسرت کے فن کارانہ شعور نے ان سب میں ایک اچھوتا پن پیدا کرکے جمالیاتی پہلو کو بڑی چابک دستی سے برتا ہے۔ ان سب کی آمیزش سے حسرت نے ایک نئے رنگ کو وجود میں لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ رنگ ان کا اپنا رنگ ہے۔ اس میں ان کی انفرادیت صاف جھلکتی ہے۔ انفرادی طور پر اس رنگ کے مختلف اجزاء کی خصوصیات دوسرے شاعروں کے یہاں بھی مل سکتی ہیں لیکن ان سب کے مجموعے سے ایک کیمیائی تاثر پیدا کرکے اس کو برتنا صرف حسرت کا حصہ ہے اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ چنانچہ ساری اردو شاعری میں ان کے تغزل کا رنگ منفرد نظر آتا ہے۔ اس کو بڑی آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اسکی جدت اور اپچ، بے ساختگی اور برجستگی، رنگینی اور رعنائی، خلوص اور صداقت، شوخی اور طرحداری، سادگی اور پرکاری کے باعث حسرت کا رنگ چھپتا نہیں۔

حسرت کے فن پر مختلف شعراء کا فن اثر انداز ہوا ہے۔ سب سے زیادہ اثر ان پر مومن اور نسیم کا ہے۔ اس کا انھوں نے کئی جگہ اعتراف بھی کیا ہے، لیکن ویسے وہ میر، جرأت اور غالب سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ البتہ مومن اور نسیم کے مقابلہ میں ان شعراء کے اثرات اُن کے فن پر نسبتاً کم ہیں "ترکیب مومن" کی نیرنگیاں اور "طرز مومن" کی رنگیں نگاریاں، ان کے فن میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ کہیں کہیں "شیرینی نسیم" کا احساس بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میر کی سادگی، جرأت کی بے باکی اور غالب کی پرکاری بھی ان کے فن میں نمایاں ہو جاتی ہے "زبان لکھنؤ" میں "رنگ دہلی" کی نمود بھی ان کی شاعری کے نام کو روشن کرتی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ دہلوی اور لکھنوی رنگوں کو انھوں نے بڑی خوبی سے یکجا کیا ہے۔ ان کے فن کی بڑائی ان دونوں رنگوں کو آپس میں اعتدال کے ساتھ سمونے میں ہے انھوں نے دونوں سے اچھی چیزیں لے لی ہیں اور اس طرح اپنے فن میں سحرکاری کا انداز پیدا کیا ہے۔ ان کی "رنگینیٔ تحریر" اور "نیرنگیٔ گفتار" ان کے فن میں دامن دل کو اپنی طرف سب سے زیادہ کھینچتی ہے۔

حسرت کے خلوص اور ان کی صداقت نے ان کے فن میں بڑا رچا ہوا انداز پیدا کیا ہے۔ انھوں نے مختلف عشقیہ کیفیات کو ان میں ڈوب کر اور کھو کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بے باکی اور راست گوئی کی خصوصیات سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ وہ کوئی چیز چھپاتے نہیں۔ سچائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ البتہ اس کو پیش کرنے کے انداز میں تغزل کی روایتی رمزیت اور ایمائیت سے انھیں کام لینا پڑتا ہے۔ اور یہ اُن کے فن کی ایک اور نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کی رمزیت، مومن کی رمزیت سے بہت ملتی ہے۔ ان کی اشاریت نئی نہیں ہے لیکن اس میں ان کے فن کارانہ شعور نے نیا خون زندگی ضرور دوڑایا ہے۔ انھوں نے اظہار کے نئے پیرائے بھی اختیار کئے ہیں لیکن اس سے ان کے تغزل کو ٹھیس نہیں لگنی۔ کیونکہ وہ تغزل کی بنیادی روایات کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں۔ ان روایات کی حدود میں رہ کر اپنے فن میں اظہار کے نئے طریقوں کو اختیار کرنے کے خیال ہی نے ان کے تغزل میں یہ رچی ہوئی کیفیت پیدا کی ہے۔

اس رچے ہوئے انداز نے حسرت کے فن میں ہر خیال کو ایک شکل کی صورت دی ہے۔ اس شکل سازی یا صورت گری (Imagery) میں حسرت کو کمال حاصل ہے۔ اور واقعی ان کی شکل سازی یا صورت گری (Imagery) ان کے فن میں سب سے زیادہ قابل داد ہے۔ حسرت کا فن درحقیقت شکل سازی یا صورت گری سے عبارت ہے۔ یہ شکلیں حسرت مختلف طریقوں سے تیار کرتے ہیں، اور ان میں مختلف طرح کے رنگ بھرتے ہیں۔ جس کے باعث ان کا فن ایک اچھا خاصہ نگار خانہ معلوم ہوتا ہے۔ کہیں تو یہ شکلیں ان کے محاکاتی انداز کے سہارے پیدا ہوتی ہیں۔ کہیں ان کی تشبیہیں اور استعارے ان کی تخلیق کرتے ہیں کہیں ہیرے کی طرح ترشی ہوئی ترکیبوں کے سہارے ان کا وجود ہوتا ہے۔ محاکاتی انداز ان کے فن میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ تشبیہیں ان کے یہاں کم ہیں، لیکن جہاں تشبیہوں سے انھوں نے کام لیا ہے وہاں شاعری کو مصوری بنا دیا ہے۔

بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ شاعری میں مصوری کی خصوصیات پیدا کرنے ہی کے لئے انھوں نے تشبیہوں کا استعمال کیا ہے ؎

برق کو ابر کے دامن میں چھپا رکھا ہے — ہم نے اُس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ہے
پیراہن اس کا سادہ رنگیں — یا عکس مے سے شیشہ گلابی
اک برق تپاں ہے کہ تکلم ہے تمھارا — اک سحر ہے لرزاں کہ تبسم ہے تمھارا
تیری نزاکتوں کی اے نازکی سراپا — تشبیہ گل میں پائی ہم نے نہ یاسمن میں

تشبیہوں کے علاوہ الفاظ کی ترکیبوں سے بھی انھوں نے یہ خصوصیت پیدا کی ہے۔ ان کے فن میں "شیوۂ حیا نانگی"، "حسن گلابی"، "عشق شیریں کار"، "شفق جمالی"، "گستاخ دستی"، "گستاخ نگاری"، "سرمایہ زار انتظار"، "آبشار آرزو"، "جور لطف آمیز"، "ناز بردار الم"، "تغافلہائے پیدا"، "نوازش ہائے پنہاں"، "کشاکش ہائے شوق"، "خلش نار تمنا"، "جفا ہائے وفا خیز" اور اس طرح کی اور بیسیوں ترکیبیں صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں ہیں۔ ان کے ہاتھوں بھی مختلف شکلیں بنتی ہیں جس سے اس کے فن میں مصوری کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ بہرحال ان کے ضمن میں شکل سازی اور صورت گری کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ جس سے ان کی شاعری کو چار چاند لگ جاتے ہیں ؎

شوق کو مجبور ہو کر چھوڑ دینا ہی پڑا — جب کلائی نازکی سے تھرتھرائی آپ کی
بے باک تھا زبس کہ مرا اضطراب شوق — شرما کے وہ کبھی کبھی جھنجلا کے رہ گئے
نگاہ ناز بھی کس کس ادا سے لطف کرتی ہے — تغافلہائے پیدا میں نوازش ہائے پنہاں میں
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں — کیفیت ان کی وہ نیم خوابی
محفل میں دیکھنے کو کسی کے نہ دیکھنا — اب تک وہ ان کی یاد ہے شان حیا مجھے
بھولی نہیں دل کو تری دزدیدہ نگاہی — پہلو میں ہے اب تک خلش تیر ابھی تک
بسی ہوئی ہے جن آنکھوں میں شوخیوں کی بہار — ادائے شرم انھیں کیوں سکھائی جاتی ہے
وہ تبسم بھی قیامت تھا ترا بعد جفا — تو نے دی ہو جسے خدمت نمک افشانی کی
نادم ہوں جان دیکر آنکھوں کو تو نے ظالم — رو رو کے بعد میرے کیوں لال کر لیا ہے
چھپے وہ مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی — وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری

اس طرح کی تصویریں حسرت کے فن میں سیکڑوں کی تعداد میں ملتی ہیں۔ خیال کو صورت کی شکل دے دینا تاثر کی کیفیت میں اضافہ کرتا ہے۔ اس میں اور زیادہ گہرائی آجاتی ہے۔

حسرت کے فن میں لہجے کی بڑی رنگا رنگی اور بوقلمونی ملتی ہے وہ مختلف انداز میں باتیں کرتے ہیں۔ مختلف خیالات کو پیش کرتے ہوئے ان کی لے بھی مختلف ہو جاتی ہے۔ لیکن اس میں ایک قسم کا لوچ اور بانکپن ہر جگہ نظر آتا ہے۔ حسرت بہت دھیمے سروں میں راگنی چھیڑنے کے قایل ہیں لیکن اس میں ایک رعنائی ضرور ہوتی ہے۔ حسرت کے لہجے کی بڑی نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ اپنے آپ کو رعنائی سے کبھی بھی جدا نہیں ہونے دیتا۔ رعنائی کے ساتھ طرح داری بھی اس کے ساتھ رہتی ہے ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ ہم سے تیری خواہش ہے کیا — دل میں جو جو کچھ ہے میرے اب میں اُن سے کیا کہوں
شاید جہاں سے حسرت دیوانہ چل بسا — ہاں ہاں جبھی تو چشم جنوں اشکبار ہے
کیا ہو یہ آج پوچھیں گے اس نازنیں سے ہم — تجھ سا جو کوئی ڈھونڈھ نکالیں کہیں سے ہم
اندھیرے میں وہ آلیتے تھے پہلے کس کے دھوکے میں — کہ جب آخر مجھے تو شرما کر کہا تم سکو؟
توڑ کر عہد کرم نا آشنا ہو جائیے — بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

اس لوچ رعنائی اور بانکپن کے ساتھ ساتھ حسرت کے فن میں بڑی نغمگی، اور ترنم کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی ہر بات ایک آہنگ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس نغمگی اور آہنگ و ترنم میں کوئی پرشور کیفیت نہیں ہے کیونکہ خود حسرت کی لے میں ایک دھیماپن ہے۔ ایک آہستہ خرامی ہے۔ انھوں نے بحریں بھی مترنم اور رواں استعمال کی ہیں۔ شاید یہ موضوع سے ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔

حسرت کے فن میں زبان کی شیرینی اور گھلاوٹ کا بھی بڑا اثر ہے۔ اس زبان میں حلاوت اور سادگی بھی پائی جاتی ہے۔ زبان کے معاملہ میں حسرت کے یہاں مشکل پسندی کہیں بھی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ روزمرہ کی گفتگو کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے تکلف اور بناوٹ کا ان کے یہاں نام کو بھی پیدا نہیں ہوتا۔ حسرت پر فارسی کا اثر بے شک بہت گہرا ہے۔ شاید یہ اثر غالب اور مومن کے توسط سے ان تک پہونچا ہے لیکن انھوں نے فارسی کے زیر اثر اپنی زبان کو کہیں بھی بوجھل اور نامانوس نہیں ہونے دیا ہے۔ سادگی اور سلاست انھیں پسند ہے۔ اس لئے ان کے یہاں مشکل پسندی نہیں ملتی۔ لکھنوی انداز کے وہ شیدائی ہیں۔ اور التزاماً لکھنو کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر ؎

مرمٹا آپ پہ کون آپ نے یہ بھی نہ سنا آپ کی جان سے دور آپ سے شکوہ ہے مجھے

لیکن ان کا یہ انداز بھی دلوں کو بھاتا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس انداز میں موانست پائی جاتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے اس انداز اور طرز ادا میں ابتذال کبھی کہیں پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ حسرت کی زبان جادو کا اثر رکھتی ہے۔ اور ان کے فن کی سحر کاری میں ان کی زبان نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔

ان تمام عناصر سے تشکیل پایا ہوا حسرت کا فن اور اس کا جمالیاتی پہلو حسرت کے تغزل کی جان ہے۔ کیونکہ انھیں عناصر نے مل کر اس کے اندر شاعرانہ خیالات کی بجلیاں بھری ہیں اور اس کو شعریت سے ہمکنار کیا ہے۔

(۱۲)

حسرت کے تغزل کی یہی نمایاں خصوصیات ہیں۔ جنھوں نے ان کی زندگی ہی میں انھیں قابل رشک بنا دیا۔ سوائے دو ایک کے شاید ہی اردو کے کسی غزل گو شاعر کو اپنی زندگی میں صرف اپنے تغزل کی وہ اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہو، جتنی حسرت کو حاصل ہوئی ہے۔ حسرت کے تغزل کے اثرات عوام پر بھی گہرے ہیں اور اردو غزل پر بھی اس کا خاصا گہرا اثر پڑا ہے۔ جدید اردو شاعری میں جو شگفتگی اور لطافت، رعنائی اور نفاست آج نظر آتی ہے وہ بڑی حد تک حسرت کے تغزل کا نتیجہ ہے۔ حسرت نے اپنے تغزل کی فسوں کاری اور جادو اثری سے اردو غزل کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ اور اس نے نئے نئے راستے اختیار کئے۔ نئے نئے میدان اور نئی نئی جولانگاہیں اپنے لئے تلاش کیں اور اس طرح اردو غزل کوئی فن کی نئی دنیاؤں سے روشناس ہوئی — جس زمانہ میں حسرت کے تغزل نے آنکھ کھولی اور جس دور میں اس کی نشو و نما ہوئی وہ اردو غزل کے لئے کوئی بہت سازگار دور نہیں تھا۔ لکھنوی تغزل پر سوگواری کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ تکلف اور تصنع ایک نیا روپ دھار کر اب اس منزل میں پہونچا تھا۔ ہر طرف موت کے چرچے تھے۔ گور و لحد کے تذکرے تھے۔ اداسی اور سوگواری کی تاریکی نے اردو تغزل کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ شگفتگی اور رنگینی اس میں نام کو بھی نظر نہیں آتی تھی۔ لکھنوی شاعری کی خارجیت کا ردعمل اسی صورت میں ظاہر ہو سکتا تھا۔ حسرت نے اس صورت حال کو سنبھالا۔ اردو تغزل کی اس سوگوارانہ کیفیت کو ختم کر کے اس میں رنگینی، رعنائی اور شگفتگی کی مسکراہٹیں سموئیں۔ اس کو زندگی کے احساس سے آشنا کیا اور اس میں زندگی کی تڑپ اور جولانی جوان خون کی گرمی اور روانی پیدا کی۔ حسرت کا تعلق لکھنؤ سے تھا لیکن وہ ماحول کی غیر صحت مندانہ کیفیت کے اثر میں نہیں آئے۔ انھوں نے اس غیر صحت مند ماحول کو پوری طرح سمجھ کر اسے صحت سے ہمکنار کیا۔ دلی اس وقت تک اجڑ چکی تھی۔ داغ دہلوی تھے لیکن انھوں نے ایک نیا طرز اردو غزل میں نکالا تھا۔ حسرت پر داغ کا اثر ہوا، لیکن اس اثر کو انھوں نے بڑے متوازن انداز میں قبول کیا۔ اور اس طرح انھوں نے داغ کے انداز میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں جن سے ان کے تغزل کا مخصوص رنگ پیدا ہوا۔ یہ رنگ تغزل اگر اس وقت وجود میں نہ آتا تو اردو غزل اس زمانے میں؛ بلکہ ایک زمانے تک تغزل کے اعلیٰ معیار سے شاید واقف نہ ہو سکتی۔ حسرت کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل کو اس زمانے میں جب وہ صحیح رنگ تغزل کے راستے سے ہٹ رہی تھی ایک نئی راہ دکھائی اور خود رہبر منزل بن کر اس کو اس راستے پر گامزن کیا۔

حسرت موہانی کی شخصیت

(پنڈت کشن پرشاد کول)

مجھے اس مضمون میں نہ تو مولانا کی شاعری پر تبصرہ کرنا یا اس کا جایزہ لینا منظور ہے نہ ان کی سیاسی زندگی کے معرکوں پر بحث کرنا مقصود، مولانا کی شاعری پر بحث کی نہ یہاں گنجایش ہے نہ وہ میرے خراج تحسین کی محتاج۔ مانی ہوئی بات ہے کہ حسرت موہانی اپنے دور شاعری کے بادشاہ تھے اور سب سے بڑے غزل گو، بقول معارف کے آخری دور کے بگڑے ہوئے مذاق شاعری کی اصلاح انہی نے کی اور بے لطف سمی تغزل کو صحیح معنوں میں دل کی واردات بنادیا۔ جس میں حقیقی تغزل کی ساری لطافتیں اور رعنائیاں موجود تھیں۔ ان کی سیاسی زندگی طوفانی انقلاب کا پیش خیمہ تھی اور اس کا تذکرہ کسی مجاہد انقلاب ہی کے قلم سے بھلا معلوم ہوگا۔ یہاں تو صرف حسرت موہانی کی اولوالعزم ہستی اور غیر معمولی شخصیت کی یاد کا تازہ کرنا مقصود ہے کہ جس کا میں اول روز سے دل سے قدر دان رہا۔ اس طرح سے پرانے ذاتی مراسم کی یاد تازہ ہو جائے گی اور رہی سہی حسرتیں بھی پوری ہو جائیں گی۔

تقریباً نصف صدی کا زمانہ گزرا میں کالج میں پڑھتا تھا۔ مجھے اردو ادب و صحافت سے شوق تھا اس وقت کے اردو رسالوں میں مخزن، زمانہ، دکن ریویو اور کشمیر درپن ممتاز سمجھے جاتے تھے کہ سید فضل الحسن حسرت موہانی نے علی گڈھ سے اردوئے معلّیٰ نکالنا شروع کیا۔ ادبی رنگ تو اسکا جو کچھ ہوتا تھا اسکے ماسوا سیاسی چاشنی کی لذت بھی ہوتی تھی اور مضامین سنجیدہ اسلوب کا نمونہ تھے۔ میں اس کا خریدار ہوا اور دو ایک مضمون بھی اس میں لکھے۔ اس طرح سے حسرت موہانی سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ میری ان کی پہلی ملاقات اچھی طرح یاد نہیں یا تو سورت کانگرس کے ہنگامہ کے موقع پر ۱۹۰۷ء میں سورت میں ہوئی یا ۱۹۰۸ء میں علی گڈھ میں اور اس دوستانہ مراسم کا سلسلہ تقریباً ۴۰ برس قایم رہا۔ مجھے ان کی ذات سے ایک قسم کا اُنس تھا کیونکہ میں ان کے خلوص اور سچائی، کسر نفس اور ایثار، دلیری اور جاں بازی، آزادی و بیباکی اور ان کی اولوالعزمی اور وطن پرستی کا دل سے قدردان تھا میرے دل میں ان کی شخصیت کے لئے جگہ تھی اور طرفہ مضمون یہ کہ میرے ان کے سیاسی خیالات اور مسلک میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شروع سے ہی وہ تلک کے پیرو تھے اور میں گوکھلے کا معتقد۔ خود کہہ گئے ہیں ؎

مغموم نہ ہو خاطر حسرت کہ تلک تک　　　پیغام وفا یاد ستمگر کے تئیں ہے،

ایک جگہ اور کہا ہے :-

ناز تیری پر دلی پر حسرت آزاد کو　　　اے تجھے قایم رکھے تا دیر رب ذوالمنن

تلک کی موت کے ماتم میں بھی دو شعر ان کے کلام سے یادگار رہیں گے :-

ماتم نہ ہو کیوں بھارت میں دنیا سے سدھارے آج تلک　　　بلونت تلک، مہاراج تلک، آزادوں کے سرتاج تلک،

جب تک وہ رہے دنیا میں رہا ہم سب کے دلوں میں زور اس کا　　　اب رہ کے بہشت میں نزد خدا حوروں پہ کریں گے راج تلک

آج جبکہ زبانوں کے قفل ٹوٹ گئے ہیں، حکومت کا جا و بیجا بدنام و مطعون کرنا بلکہ اس کے خلاف زہر اُگلنا بھی بچوں کا کھیل ہوگیا ہے، انقلاب زندہ باد کے نعرے گلی کوچوں میں ہر کہ و مہ کی زبان پر ہیں۔ سیاسی مظاہرے، ہنگامے، ہڑتالیں اور مرن برت بھی زندگی کا روزمرہ ہو رہا ہے، جیل جانا تو معمولی سی بات ہے۔ جس پر یہ ٹھپا نہیں لگا اس کے لئے تو پبلک لایف میں کوئی جگہ ہی نہیں۔ جن لوگوں نے اس ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں اور ان فضا میں پرورش

پائی ہے ان کے لئے اس کیفیت کا اندازہ کرنا جو اب سے تقریباً پچاس برس پہلے ملک پر چھائی ہوئی تھی اور ان لوگوں کی اولوالعزمی اور جانبازی کا اندازہ لگانا کہ جنھوں نے سوتی ہوئی قوم کو جگایا آسان بات نہ ہوگی۔ میں اسی بات کا ذکر کر رہا ہوں کہ جب کانگرس کچھوے کی چال سے سوراج کی منزل کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ نرم دل والے کانگرس میں برسراقتدار تھے۔ گرم دل کا شیرازہ اس وقت تک بندھا نہیں تھا۔ تقسیم بنگالہ نے بنگال میں البتہ شورش و ہنگامہ برپا کر دیا تھا اور وہاں قوم بدحواس ہو رہی تھی۔ بڑے بڑے جانبازی کے کرشمے دیکھنے بس آئے۔ مہاراشٹر میں تلک کی ذات سے گرم پارٹی کا بول بالا رہا تھا اور لالہ لاجپت رائے کی شخصیت نے پنجاب میں کچھ ایسی ہل چل مچائی کہ انگریزی سرکار بدحواس ہونے لگی۔ مگر یو۔پی کے صوبہ میں امن و امان اور سکون تھا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ۔ گنگا پرشاد ورما، بشن نراین در اور آخر میں موتی لال نہرو کانگرس کے لیڈر تھے اور کانگرس اپنی پرانی چال سے خفتہ بیدار چلی جا رہی تھی۔ بالخصوص مسلمانوں میں کانگرس کے نام لیوا خال خال تھے جن کے نام انگلیوں پر گنائے جا سکتے تھے۔ لکھنؤ میں حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم مرزا سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ، نواب صادق علی خاں تعلقہ دار شیش محل اور بعد میں خواجہ عبدالمجید بیرسٹر علی گڈھ اور مرزا سمیع اللہ بیگ ایڈوکیٹ لکھنؤ کانگرس کے سربرآوردہ حامی تھے ہاں ایک نام اور رہ گیا یعنی حافظ عبدالرحیم وکیل علی گڈھ کا، جو بڑے پرانے کانگرسی تھے اور آخر دم تک انھوں نے اپنی وضع کو نبھایا۔ یہ معدودے چند مسلمان تھے جو کانگرس کے نام لیوا تھے ورنہ تمام ملت علی گڈھ کی تحریک کی شریک تھی اور کانگرس کی مخالفت اس کا سیاسی عقیدہ و ایمان، اس گدلی فضا میں حسرت موہانی نے آزادی کا پرچم دلیری و بیباکی سے شروع کیا اور کس طرح ؟

رسمِ جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے — حبِ وطن مستِ خواب دیکھئے کب تک رہے
دل پہ رہا مدتوں غلبۂ یاس و ہراس — قبضۂ شرم و حجاب دیکھئے کب تک رہے
تا بہ کجا ہو دراز سلسلہ ہائے فریب — ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھئے کب تک رہے
پردۂ اصلاح میں کوششِ تخریب کا — خلقِ خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے
نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم — جبر بہ زیرِ نقاب دیکھئے کب تک رہے
دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں — بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے
ہے تو کچھ اکھڑا ہوا بزمِ حریفاں کا رنگ — اب یہ شراب و کباب دیکھئے کب تک رہے
حسرتِ آزاد پر جورِ غلامانِ وقت — از رہِ بغض و عتاب دیکھئے کب تک رہے

اور یہ آواز اس صوبہ میں اٹھی علی گڈھ سے۔ لازم تھا کہ سرسید کی امت سراسیمہ اور پریشان ہو۔ اور ٹھیک بھی تھا۔

چو کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی

انگریزی سرکار نے موقع کی اہمیت اور نزاکت کو محسوس کیا اور حسرت کو جیل بھیجدیا۔ پبلک کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ مجھ پر اس حادثہ کا پائدار اثر ہوا اور میں حسرتِ موہانی کے دین اور عقیدے اولوالعزمی اور وطن پرستی کا قائل ہوگیا۔ اس وقت جیل میں جانا اور وہاں رہنا کوئی کھیل نہ تھا۔ خود کہتے ہیں

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی — اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

دوسری بات جس نے حسرت کے کیرکٹر و شخصیت کا قدردان بنایا، ان کی آزادیٔ نسواں کی حمایت تھی وہ پردے کی رسم کے مخالف اور اس کے توڑنے کے حامی تھے۔ آج اس ترقی و آزادی کے زمانہ میں بھی ہم میں سے سیکڑوں ایسے ہیں کہ جب مجمع عام میں آزادیٔ نسواں کا ذکر آتا ہے تو بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہیں اور جب کوئی رزولیوشن پاس ہوتا ہے تو اونچے اونچے ہاتھ اٹھاتے ہیں لیکن ع

چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

زبان سے کہنے اور عمل کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوا کرتا ہے۔ میں اس زمانہ کا ذکر کر رہا ہوں جسے تقریباً ۴۵ سال ہوئے، نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں میں بھی پردے کی رسم شرافت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے یہاں بیویوں، بہوؤں اور بیٹیوں کو بالاخانوں پر جب ہی ہوا اور دھوپ دکھائی تھی جب پڑوس کے مرد پردے میں ہو جاتے تھے۔ پردے کی رسم کا توڑنا اور آزادیٔ نسواں کی علانیہ حمایت کرنا تو در کنار اس وقت تک تعلیم نسواں کا چرچا

بھی اس صوبہ میں اسی حد تک پھیلا تھا کہ مسلمانوں میں شیخ عبد اللہ نے علی گڑھ سے "رسالہ خاتون" نکالنا شروع کیا تھا اور زنانہ مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی یا جسٹس سید کرامت حسین مرحوم نے نئی تعلیم کی حمایت میں کراس ویٹ کالج الہ آباد کو بنایا اور سنوارا تھا۔ میں نے آگرہ میں متوسط شریف مسلمان خاندان کے صرف ایک ہی شخص کو شام کے اندھیرے میں کھلی فٹن پر اپنے یہاں کی خاتونوں کو ساتھ لے کر سیر و تفریح کی غرض سے کھلے پارکوں اور باغوں میں نکلتے دیکھا تھا اور ان کے چہرے بھی زیر نقاب ہوتے تھے یعنی صاحبزادہ ڈاکٹر سید الظفر خاں۔ ممکن ہے کہ اس وقت اور بھی ایسے دو چار ہوں جو میری واقفیت میں نہیں۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ان لوگوں کے لئے جو بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور جن کو فٹن اور موٹر میسر ہیں پردہ توڑنا نسبتاً آسان نہیں ہے لیکن گنجان شہر کے رہنے والے کے لئے جس کی زندگی عسرت سے گزرتی ہو ایسا قدم آگے بڑھانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ حسرت پہلے شخص تھے جنھوں نے آج سے چالیس سال پیشتر ایسا قدم آگے بڑھایا تھا۔ انھیں کا ایک شعر ان کے انداز طبیعت و خصلت کا پتہ دیتا ہے، کہہ گئے ہیں کہ:-

ہر چند کہ ہیں خلاف جمہور نہیں   تقلید عوام دل کو منظور نہیں

ان کے سلامتی عقیدہ و ایمان کا یہ بہت بڑا ثبوت تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو بیگم حسرت کی سی رفیق زندگی میسر آئی کہ حقیقی معنوں میں ان کی دمساز اور ساتھی تھیں۔ ان کی قید و مجبوری، مصیبت و عسرت میں انھوں نے نہایت حوصلہ اور خودداری سے زندگی بھر خندہ پیشانی سے ان کا ساتھ دیا۔

غالباً سنہ ۱۶ء یا سنہ ۱۷ء کا ذکر ہے کہ حسرت جیل میں بند تھے۔ کانگریس کے کام سے مجھے علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا وہاں اپنے احباب سے میں نے سنا کہ حسرت کے گھر والوں کی زندگی بڑی مصیبت اور عسرت سے گزر رہی ہے۔ میں نے کوشش کی کہ میں بیگم حسرت موہانی سے ملوں۔ وہ میرے نام اور حسرت سے میرے مراسم سے یقیناً واقف تھیں۔ میں ان سے ملنے گیا۔ کچے مکانوں کے ایک احاطہ میں نیم کے درخت تلے ایک کچا پکا چھوٹا سا مکان تھا۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنا نام بتایا۔ بیگم حسرت نے دروازہ کھولا اور مجھے ایک کمرے میں جس میں ایک پرانی دری بچھی ہوئی تھی لے جا کر بٹھایا۔ اس زمانہ میں بیگم حسرت اپنی بوڑھی اور بیمار ماں اور اپنی بچی کو ساتھ لے کر اس مکان میں رہتی تھیں۔ حسرت کے متعلق بات چیت ہوئی وہ جیل میں حسرت کا حال اور کیفیت مجھے بتاتی رہیں۔ حسرت تو جیل میں تھے لیکن ان کے گھر کے در و دیوار سے عسرت ٹپک رہی تھی۔ آخر میں میں نے جھجکتے ہوئے دبی زبان سے کہا کہ اگر آپ منظور کریں تو کچھ مالی امداد کا انتظام کیا جائے انھوں نے جواب میں کہا کہ مجھے یہ گوارا نہیں کہ میرے لئے پبلک سے چندہ کیا جائے۔ میں جس حالت میں ہوں خوش ہوں۔ آپ اس کی زحمت نہ گوارا کریں۔ لمحہ بھر کے سکوت کے بعد پھر بولیں کہ حسرت نے شعرا کے کئی دیوان چھپوائے تھے ان کا یہ ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اردوئے معلیٰ بند ہو چکا۔ یہ کاروبار ہی ابتر ہو گیا اب یہ ڈھیر یہاں پڑا بیکار جگہ گھیر رہا ہے اگر آپ ان دواوین کے فروخت کرانے کا کوئی انتظام کر سکیں تو البتہ کچھ سہولت ہو جائے گی۔ میں یہ کہہ کر کہ کوشش کروں گا، ان سے رخصت ہوا۔ لکھنؤ واپس آکر میں نے اپنے دوست بابو شیو پرشاد گپتا کو جو راجہ موتی چند مرحوم کے بھتیجے اور بنارس کے نامی رئیس تھے۔ اس سب حال کی اطلاع کی۔ بابو شیو پرشاد گپتا علاوہ رئیس ہونے کے بڑے مخیر تھے۔ کئی لاکھ روپیہ انھوں نے کاشی ودیا پیٹھ کے قائم کرنے میں صرف کیا تھا۔ کانگریس کے بڑے حامی تھے۔ اس کے لئے صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔ حسرت کے مزاج اور طبیعت سے ان کو بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے مجھے پانچ سو روپیہ کا چیک فوراً بھیج دیا جو میں نے بیگم حسرت کو روانہ کر دیا انھوں نے کتابوں کا پارسل مجھے بھیج دیا۔ یہ دواوین اور کتابیں عرصہ تک "ہندستانی" اخبار کے دفتر میں پڑی رہیں۔ یاد نہیں کہ پھر کیا ہوئیں۔ ایک اور مرتبہ جب حسرت موہانی اپنے وطن موہان میں نظربند کر دئے گئے تھے میں ان سے وہاں ملنے گیا۔ تجویز یہ تھی کہ ایک میموریل گورنمنٹ کو بھیجا جائے جس پر صوبہ کے تمام سربرآوردہ ہندو و مسلمان لیڈروں کے دستخط ہوں اس غرض سے کہ حسرت موہانی کو نظربندی سے رہا کر دیا جائے۔ دستخط تو ہو گئے اور میموریل طیار ہو گیا۔ لیکن یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں حسرت اس طرز عمل کو پسند نہ کریں تو یہ سب کوشش رائگاں جائے۔ چنانچہ میں لکھنؤ سے موہان ان سے ملنے گیا اور گفتگو کی۔ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ جب تک میموریل میری طرف سے نہیں جاتا اور گورنمنٹ میری رہائی کے لئے کوئی شرطیں نہیں لگاتی مجھے آزاد ہونے میں انکار نہیں۔ اس موقع پر دوبارہ بیگم حسرت سے ملنے کا موقع ہوا۔ مجھے بیگم حسرت سے ملنے کے یہی دو موقعے ہوئے کہ جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے ذاتی اوصاف ان کے بشرہ سے عیاں ہوتے تھے۔ میں نے جو ان کے اوصاف فضائل اور کیرکٹر کا اندازہ لگایا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ صحیح تھا، یہ تھا کہ ان میں خصائل کے وہ تمام جوہر جو حسرت کی شخصیت کا خمیر تھے موجود تھے، ویسی ہی سادگی، پاکیزگی، سچائی، کسرنفسی، ایثار، ہمت و دلیری اور وطن پرستی ان میں بھی تھی کہ جیسے حسرت میں، ان کی خلقی رجحان کے علاوہ غالباً حسرت کی صحبت نے ان میں چار چاند لگائے تھے۔ لیکن میرے خیال میں

ان کو ایک بات میں حسرت پر فوقیت حاصل تھی۔ وہ دماغ والی عورت تھیں اور ان کا دماغ حسرت کے مقابلہ میں زیادہ سلجھا ہوا تھا۔ اور میرا اندازہ یہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہیں، حسرت پر کچھ نہ کچھ اثر ان کے اس وصف کا ضرور پڑتا رہا۔ تقریباً ۲۰ برس حسرت کے اور میرے مراسم قایم رہے، کبھی ایسا اتفاق نہ ہوا ہوگا کہ وہ لکھنؤ آئے ہوں اور بغیر مجھ سے ملے چلے گئے ہوں لیکن ۱۹۲۵ء کے بعد سے یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ سیاسی فضا جب مکدر ہوئی اور فرقہ وارانہ جوش نے زور پکڑا تو حسرت نے بھی پولیٹکل کروٹ بدلی اور مسلم لیگ میں شریک ہوگئے۔ غالباً اسی زمانہ سے ان میں مذہبیت کا جوش بھی بڑھنے لگا تھا۔ میں یقیناً تو نہیں کہہ سکتا مگر شاید یہی زمانہ تھا کہ جب بیگم حسرت علیل ہوکر قضا کر گئیں۔ میرے اور حسرت کے تعلقات کبھی ناگوار نہ ہوئے لیکن وہ ملنے جلنے میں پہلو تہی کرنے لگے تھے۔ بس راہ چلتے میں صاحب سلامت ہوجاتی تھی۔ پانچ سات برس ہوئے کہ گنگا پرشاد میموریل ہال میں کسی جلسے کی شرکت کی غرض سے آئے تھے۔ برآمدے میں کھڑے مل گئے میں انھیں اپنے دفتر میں لے آیا اور بات چیت ہونے لگی۔ وہ مجھے یہ سمجھانے لگے کہ مسلم لیگ اور سوشلزم دونوں میں موافقت ہے اور فرقہ وارانہ سیاسیات کو کمیونزم کے ساتھ نباہا جا سکتا ہے۔ یہ میرے کسی طرح سمجھ میں نہ آیا۔ انھوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ کچھ عرصہ ہوا انھوں نے دوسری شادی کرلی ہے مجھے یہ سن کر تعجب اور افسوس ہوا۔ یہ میری ان کی آخری ملاقات تھی۔

حسرت کے کیرکٹر کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے عقیدے اور ایمان کے سچے تھے، جو کچھ یقین کرتے تھے اس پر عمل کرنے سے دریغ نہ تھا۔ دنیا کی بڑی سے بڑی کوئی قوت بھی ان کے قدم راہِ عمل سے ڈگمگا نہیں سکتی، یہ بڑے آدمیوں کا جوہر ہوتا ہے۔ البتہ ان میں دو اوصاف کی کمی تھی اول تو دماغی توازن اور عملی تدبر ان میں بالکل نہ تھا اسکے علاوہ بڑے آدمیوں میں جو دوسروں کو اپنے طرف کھینچنے کی ایک کیفیت ہوتی ہے وہ بھی ان میں نہ تھی اگر یہ دونوں وصف ان میں ہوتے تو یقیناً ان کا شمار ہندوستان کے بہت بڑے آدمیوں میں ہوتا۔ حسرت نے اپنی زندگی کا نصف حصہ وطن کی خدمت میں جاں نثاری سے گزارا اور نصف حصہ اپنی ملت کی پرجوش حمایت و خدمت میں، مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جو قدر ملک و ملت کو ان کی کرنی چاہئے تھی دونوں میں سے کسی نے نہ کی۔ غالباً وجہ یہ تھی کہ حسرت اپنا ڈھنڈورا آپ پیٹنا نہیں چاہتے تھے کہ جو آج کل کے زمانہ کا رنگ اور خاصہ ہے۔ خیر اب تو وہ یادگار ہستی اس دنیا سے اٹھ گئی۔ کچھ باتیں اس ذات سے منسوب دھیان میں رہ گئی ہیں، ان کے دہرانے سے بھی کیا ہوتا ہے۔ البتہ حسرت کا نام ہماری اردو کی ادبی دنیا میں ایک درخشندہ ستارہ کی طرح مدت تک چمکتا رہے گا۔ رہا ان کی موت کا ماتم سو انھیں کے شعر کو بار بار دہرائیے اور دل ہلکا کر لیجئے ؎

شاید جہاں سے حسرت دیوانہ چل بسا	ہاں ہاں ابھی تو چشم جنوں اشکبار ہے

(قومی آواز)

انتخاب بیاض حسرت موہانی

صیدی طہرانی:- از باغ رفتی و دلِ بلبل ز نالہ ریخت	گل با شرابِ رنگ تمام از پیالہ ریخت

حکیم شفائی: ہلاک نرگس مخمور دست ناز توام	ز پا فتادۂ شمشاد سرفراز تمام

اہلی شیرازی:- خوش آنکہ مست شوی تا بہانہ برخیزد	تو باشی و من و شرم از میانہ برخیزد

آفرین لاہوری:- دیوانگی و مستی از بوئے تو می خیزد	ہر فتنہ کہ میخیزد از کوئے تو میخیزد

آزاد بلگرامی:- چشم بیباک تو بسیار سیہ کار افتاد	آنقدر بادہ کشی کرد کہ بیمار افتاد

حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ:- مارا ہمہ رہ بکوئے بدنامی باد	از سوختگان نصیب ما خامی باد

ناکامیِ ما چو ہست کامِ دل دوست	کامِ دل ما ہمیشہ ناکامی باد

خاقانی:- جاں بخشمت آں ساعت کز لب شکرم بخشی	دانی کہ تو زاں بہا جانِ دگرم بخشی

مرزا قتیل:- دیدم نشستہ بر سر راہِ قتیل را	او در دلش کرچہ دیدو چرا نشست

حسرت کا رنگِ سخن

برائی حرف کی لاشعر مری ادا ہم

(پروفیسر سید احتشام حسین رضوی)

تنقیدِ شعر میں موضوع اور انداز بیان سے تعلق اور اُن کی اضافی اہمیت کے تعین کے مسایل بہت پیچیدہ ہیں، شاعری سے لطف اندوز ہونے اور مبہم طور پر اس سے اثر لینے کے لئے ان پہلوؤں پر نگاہ ڈالنا ضروری نہ ہو تو نہ ہو لیکن اثر انگیزی اور لطف پذیری کے وجوہ کو سمجھنے کے لئے ان اُلجھے ہوئے تاروں کو سلجھانے کی کوشش کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ شعر فہمی کے عام عمل میں پسندیدگی اور اثر پذیری یا ناپسندیدگی اور بے کیفی کے تاثرات تحلیل اور تجزیہ کی منزل سے نہیں گزرتے بلکہ مجموعی طور پر مضمون، موضوع، ہیئت اور اسلوب کے مختلف پہلو ایک ہو کر دل و دماغ کو متاثر کرتے ہیں لیکن نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے معنوی، فنی اور ادبی خصوصیات کو الگ الگ کر کے دیکھنا مفید ہوتا ہے حالانکہ نقد و نظر کی ہی یہ بات نہیں ہے کہ ان پہلوؤں کو یکسر الگ الگ کر کے دکھا سکے کیونکہ موضوع اور انداز بیان کے مکمل فنی امتزاج کے بغیر اعلیٰ شاعری وجود میں نہیں آ سکتی بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت کے شاعرانہ انظہار میں اسلوب اور انداز بیان ایک لازمی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے، گو یہ دونوں ایک حقیقت میں معین ہوتے ہیں۔ ادراک حقیقت ہی پر غور کرتے ہوئے شاعر کی شخصیت اور شعور پر نگاہ جاتی ہے اور طرز اظہار کی شخصی اور روایتی نوعیت کے پیچ سامنے آتے ہیں، بہت سے لوگ جسے انداز بیان کی انفرادیت کہکر سراہتے ہیں وہ درحقیقت شاعر کے شعور کی ظہور ہوتی ہے اور شعور کی وسعت میں خیالات، محسوسات، فن اور جمالیات کے تصورات، عقاید اور تجربات، انفرادی میلانات اور سماجی افکار سبھی سما جاتے ہیں۔ اس لئے اگر کسی شاعر کے رنگِ سخن سے بحث ہو تو اس میں بھی ان حقایق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا جن کے بغیر فن کا تصور اور رنگِ سخن کی انفرادیت کا مطالعہ بالکل ناقص ہوگا۔

حسرت موجودہ دور کے سب سے بڑے غزل گو شاعر تسلیم کئے گئے ہیں اور اُردو شاعری کے مسلسل ارتقا میں اُن کی ایک اہم جگہ ہے۔ اُن کے خیال اور انداز بیان دونوں میں شخصی اور روایتی عناصر کی آمیزش ہے لیکن جس طرح خیالات کی دُنیا فرد کے مادی روابط اور سماجی ارتقا کے اثر سے بدلتی ہے اُسی طرح انداز بیان بھی بدلتا ہے کیونکہ ایک زندہ اور حساس انسان کے خیالات جامد نہیں ہو سکتے۔ پھر حسرت موہانی تو قومی اور بین الاقوامی تغیرات کے محض تماشائی نہیں تھے بلکہ اپنے مخصوص مذہبی، سیاسی اور ادبی نظریات کے ساتھ اُن تغیرات کی رو کو تیز کرنے، اُنھیں مخصوص راہ پر لگانے اور اُن سے نتائج نکالنے کی مہم میں عملاً شریک تھے۔ اُن کے خیالات کی مکمل روایتی حیثیت نہیں ہو سکتی، اُن کا شعور روایتی شعور نہیں ہو سکتا تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے بعض حیثیتوں سے اپنے باغیانہ سیاسی خیالات کے باوجود زندگی کے ہر شعبے میں تغیر اور انقلاب کا نعرہ بلند کیا ہو۔ اُن کے خیالات کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اُن کے فنی شعور کے مطالعہ میں بھی ان باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا اُسی وقت یہ معلوم ہو سکے گا کہ حسرت کے اسلوب بیان اور رنگِ سخن کی تشکیل دینے میں کن کن عناصر کی کارفرمائی ہے اور انھوں نے شعوری طور پر کن کن چشموں سے اپنے فن کی آبیاری کی ہے۔ ان کے اشعار میں لطافت، تازگی اور شگفتگی کے رنگ کہاں سے آئے ہیں اور اُن کی حقیقت نگاری کے سوتے کہاں ہیں۔

یہ ایک عام حقیقت ہے کہ شعر و ادب کی روایات تاریخی اور تہذیبی تقاضوں سے صورت پذیر ہوتی ہیں اور سماجی ارتقا کا عام معیار اُسے مقبول بناتا ہے۔ لوگ انھیں سانچوں میں اپنے دکھ سکھ کے گیت ڈھالنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور انھیں مانوس شکلوں میں جذباتی تصویروں سے لطف حاصل کرنے اور زندگی کے مسایل کو سمجھنے لگتے ہیں اس لئے اُن میں بہت جلد جلد تبدیلی نہیں ہو سکتی پھر بھی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شاعر اپنے موضوع کی مناسبت سے اور اپنے جذبات کی گرمی اور خلوص و صداقت کے بھروسے پر ہیئت میں بڑی تبدیلی بھی کر سکتا ہے اور پرانی ہی شکل کو نیا لب و لہجہ، نیا آب و رنگ اور نیا حسن و جمال

بھی عطا کر سکتا ہے۔ اس طرح اچھے شاعر اپنے اسلوبِ بیان کو اپنے خیالوں کی جدت اور تازگی سے ہم آہنگ بنا لیتا ہے۔ حسرت غزل کے شاعر ہیں اور غزل کا انتخاب انھوں نے سوچ سمجھ کر اپنے موضوع اور طرزِ اظہار کی مناسبت سے کیا تھا، اس کی روایات کو سمجھا تھا، مختلف اسالیب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور غزل ہی کو اپنے مزاج کے مطابق پایا تھا چنانچہ انھوں نے خود ہی اپنے دیوان کے حصۂ اول (طبع ثانی) متعلق بہ ضمیمہ الف ۱۹۱۶ء میں یہ الفاظ لکھے تھے:-

> "۱۸۹۳ء سے ۱۹۰۳ء تک کی شاعری کا ایک بڑا مجموعہ نظموں، قصیدوں، قطعوں، غزلوں اور نظم انگریزی کے ترجموں کی شکل میں راقم حروف کے پاس موجود ہے جس کی نسبت گمان یہ تھا کہ نظرِ ثانی کے بعد قابلِ اشاعت ہو جائے گا لیکن بعد میں کچھ تو اس خیال سے کہ ابتدائی کلام کی اصلاح و ترقی کی یہ کوشش کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مصداق قرار پائے گی اور کچھ (اس) لحاظ سے کہ رفتہ رفتہ راقم حروف کی طبیعت نے اپنے لئے اصنافِ سخن میں غزل کو اپنے حسبِ حال پاکر منتخب کر لیا ہے، اس کل مجموعۂ خرافات کو یکقلم نظر انداز کر دیا البتہ چند غزلیں نذر رہنے دیں لیکن ان کو بھی اپنے ابتدائی لباس میں بلا اصلاح چھوڑ دیا تاکہ اہلِ نظر کو ان کے مطالعہ سے راقم حروف کے مذاقِ سخن کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہو سکے۔"

غزل سے حسرت کی طبیعت کی مناسبت بھی ایک معنی خیز اور غور طلب بات ہے۔ آٹھ نو سو سال سے ایک مخصوص قسم کے شاہانہ اور جاگیردارانہ نظام میں، مخصوص اخلاقی، صوفیانہ، مذہبی، انسان دوست اور آزادی پسند قدروں کے ماننے والے غزل کو اظہارِ خیال کے لئے آزماتے رہے تھے، کیونکہ اس لچکدار صنف میں خارجی اور داخلی دونوں قسم کے تجربوں کا جذباتی اور تخیلی، سادہ اور تمثیلی بیان بیک وقت ممکن ہے۔ تشبیہ، استعارہ اور کنایہ کے پردے میں حقائق اور احساسات کی وسیع کائنات غنائی اور پُرجذبات رنگ میں پیش کی جا سکتی ہے۔ دورِ جدید کی مبہم روحانی کشمکش اور بے نام داخلی کیفیات کا اظہار بھی اسکے ذریعہ سے ہو سکتا ہے، اس لئے غزل کا انتخاب حسرت کے کردار کے بعض پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ایسے پہلو جو قدیم تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی خصوصیات کے بھی حامل تھے اور تغزل کے لئے جس پُرکیف، مبہم آزادی اور بے چین زندگی کی ضرورت ہے اُس سے بھی بھرے ہوئے تھے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو حسرت کی شخصیت اور شاعری میں یہ ہم آہنگی نظر نہ آتی اور نہ وہ ایک کامیاب شاعر ہوتے۔ بہرحال تمام اصنافِ سخن میں غزل کا انتخاب حسرت کے رنگِ طبیعت کا غماز ہے اور اُن کا رشتہ کلاسکی شاعری کی سب سے مقبول اور ہر دلعزیز صنف سے جوڑ دیتا ہے۔

حسرت نے اپنے مذاقِ سخن کی تدریجی ترقی" کے سمجھنے میں مدد دینے کے لئے اپنا ابتدائی کلام بھی شایع کر دیا تھا اور تقریباً ہر غزل پر تاریخ ڈال دی تھی یقیناً اس سے ایک شاعر کے ذہنی ارتقا کا اندازہ لگانے، اس کے جذباتی تموّج کے مدوجزر معلوم کرنے اور اس کی قادر الکلامی کے پرکھنے میں آسانی ہوتی ہے لیکن غزل کی شاعری میں اس کی واضح شکلیں مشکل سے ملتی ہیں کیونکہ داخلیت، ایمائی طرزِ اظہار اور رمزیت کی وجہ سے اس ارتقا کا ٹھیک سے پتہ نہیں چلتا، پھر حسرت کی شاعری فلسفیانہ اور فکری شاعری ہے بھی نہیں اس لئے ارتقائے خیال کا پتہ اور نہیں چلتا۔ اُن کی شاعری کا اصل موضوع محبت ہے اس لئے جذباتی ارتقاء کے نشانات ضرور ملتے ہیں، کہیں کہیں زندگی کے واقعاتی پہلو بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ فکری ارتقاء اگر ہے تو اتنا ہی کہ ابتدا میں محبت، ماورائیت اور صوفیانہ داخلیت کے جھمیلوں سے بچی ہوئی تھی، آگے بڑھتے بڑھتے ان کا رنگ گہرا ہونے لگا یہاں تک کہ بعض اوقات عشق کی نوعیت محض صوفیانہ رہ جاتی ہے، یہ چیز اُن کے رنگِ سخن پر اثر انداز ہوتی ہے، استعاروں، کنایوں اور اشاروں کی معنویت بدل جاتی ہے اور مجاز حقیقت کا زینہ بن جاتا ہے اور ایسے شعر ملتے ہیں ؎

حسرت کا دل آئینہ ہے اک صورتِ حق کا گو اُس کی نظر شیفتۂ حسنِ بتاں ہے

عقدہ وصال یار کا حل ہو تو جانیے خوبی خلوص و علم و عمل ہو تو جانیے

اس مختصر مضمون میں اُن کے ذہنی ارتقا کا اُسی حد تک تذکرہ کیا جا سکتا ہے جتنا اُن کے رنگِ سخن کے سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے، یہاں اُن کے فنی ارتقا ہی کو پیشِ نظر رکھنا مقصود ہے جس کی تربیت اور تہذیب کی انھوں نے شعوری کوشش کی اور اپنے اس سفر کی مختلف منزلوں کا پتہ بھی دیا۔ انھوں نے اپنے خیالات اور جذبات کے لئے غزل کو چن لیا تھا اور غزل اُن کے طرزِ فکر کے لئے ایک ایسا سانچہ بن گئی تھی کہ ہر جذبہ اور ہر خیال اس میں ڈھل جاتا تھا، غزل ان کے ذہن میں اس طرح رس بس گئی تھی کہ دوسرے اصناف کی ضرورت بھی اس سے پوری ہو جاتی تھی۔ اسی لئے تو کہا تھا:-

عشقِ حسرت کو ہے غزل کے سوا نہ قصیدے نہ مثنوی کی ہوس

لکھتا ہوں مرثیہ، نہ قصیدہ، نہ مثنوی — حسرت غزل ہے صرف مری جانِ عاشقاں

سوئیت آپ کا مقصد، بغاوت آپ کا مسلک — مگر اس پر بھی حسرت کی غزلخوانی نہیں جاتی

اصنافِ سخن میں سے غزل کے انتخاب کے بعد رہنما کی تلاش کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ حسرت اگرچہ شعر و سخن کے معاملہ میں طویل مشق اور تجربہ کو بہت اہم سمجھتے تھے، لیکن استادی اور شاگردی کے رشتہ کو بھی ضروری سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے مشہور رسالہ نکات سخن کے دیباچہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اچھے استاد کی مدد سے محاسن اور معائبِ سخن کے سمجھنے کی منزلیں تیزی سے طے ہو جاتی ہیں، حسرت نے بھی اپنے غیر معمولی ذوق اور زبردست شاعرانہ صلاحیت کے باوجود اپنے لئے منشی امیر اللہ تسلیم کو اپنا استاد منتخب کر لیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے خاتمہ پر جب حسرت موہانی نے شاعری شروع کی اُس وقت ہندوستان پر امیر مینائی اور داغ چھائے ہوئے تھے، اکثر نومشق اور نوجوان شعراء انھیں کی طرف جھکتے تھے۔ لیکن حسرت نے نسیم دہلوی کے انداز میں وہ کچھ دیکھا جس نے انھیں گرویدہ کر لیا اور ان کے خیال میں اُس رنگ کی نمود تسلیم لکھنوی کے کلام میں ہوتی تھی، جنھوں نے لکھنوی ہونے کے باوجود یہ اعلان کیا تھا کہ

میں ہوں اے تسلیم شاگردِ نسیم دہلوی — مجھ کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

حسرت نے بھی اپنے کئی اشعار میں انھیں خیالات کو دہرایا ہے ؎

حسرت مجھے پسند نہیں طرزِ لکھنؤ — پیرو ہوں شاعری میں جنابِ نسیم کا

پیروِ تسلیم ہوں، شیدائے اندازِ نسیم — شوق ہے حسرت مجھے اشعارِ حسرت خیز کا

حسرت ہیں وقفِ پیروی مومن و نسیم — کیوں سلسلہ ملائیں کسی لکھنوی سے ہم

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسرت شعوری طور پر اُس رنگ کو اپنانا چاہتے تھے جسے نسیم دہلوی نے چمکایا تھا اور جنھیں نازک خیالی اور لطافت بیانی حکیم مومن خاں مومن سے ملی تھی۔ اس طرح حسرت کا سلسلہ تسلیم اور نسیم سے ہوتا ہوا مومن تک پہونچتا تھا۔ مومن کا ذکر بھی حسرت نے اپنے اشعار میں بار بار کیا ہے

حسرت مرے کلام میں مومن کا رنگ ہے — ملکِ سخن میں مجھ سا کوئی دوسرا نہیں

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سُن کے سب کہیں — مومن سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تمام اشعار بالکل ابتدائی دور کے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ حسرت نے شروع ہی میں اپنا ایک رنگ بنانے کی کوشش کی تھی اور انداز غزل گوئی کے ان پہلوؤں سے دلچسپی لی تھی جن کا مظہر دبستانِ مومن تھا۔ یہ تو ایک طویل بحث ہوگی کہ مومن، نسیم اور تسلیم کے رنگِ سخن کی خصوصیتیں کیا تھیں، ان میں کتنی مماثلت اور کتنا اختلاف تھا، ذہنی اور جذباتی حیثیت سے کتنا فرق تھا، لیکن مختصر طور پر اس کا جائزہ لئے بغیر حسرت کے اندازِ بیان کا سمجھنا بھی آسان نہ ہوگا۔

حسرت نے "اردوئے معلیٰ" میں جہاں مختلف شعراء کا تذکرہ کیا ہے اور اکثر کے انتخابات پیش کئے ہیں وہاں مومن، نسیم دہلوی اور امیر اللہ تسلیم پر بھی مضامین لکھے ہیں۔ تنقیدی حیثیت سے یہ مضامین ہلکے پھلکے ہیں لیکن ان سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ حسرت کو ان کے کلام کی کون سی خصوصیتیں اہم معلوم ہوتی تھیں اور وہ چونکہ انھیں اساتذہ کی پیروی کا دم بھرتے تھے اس لئے یقیناً انھوں نے اُن سے اپنے ایوانِ شاعری کے در و بام سجائے ہوں گے۔ مومن کے تذکرے میں حسرت نے دو بار اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ مجموعی حیثیت سے ذوق کا درجہ غالب سے اور غالب کا درجہ مومن سے بلند ہے۔ اس ترجیح کے تفصیلی وجوہ حسرت نے نہیں بیان کئے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت محض زبان کی صحت اور محاورات وغیرہ کا استعمال حسرت کے پیشِ نظر تھا کیونکہ انھوں نے اس مضمون میں مومن کے یہاں زبان و بیان کی غلطیوں سے کافی بحث کی ہے۔ مومن کی استادی حسرت کے نقطۂ نظر سے دو وجہوں سے مسلم ہے۔ اندازِ بیان کی خصوصیات اور فارسی مذاق کی پیروی میں ترکیبوں کی آمیزش۔ اگر اس تبصرہ میں اُن کی وہ رائیں بھی شامل کر لی جائیں جن کا اظہار اشعار میں ہوا ہے تو ایک آدھ پہلوؤں کا اور اضافہ ہو جائے گا جیسے "رنگین نگاری" ؎

طرزِ مومن میں مرحبا حسرت — تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

”ترکیب کی نیرنگیاں“ جن کا تذکرہ ”اردوئے معلّٰی“ والے مضمون میں بھی ہے ؎

کہاں سے آئیں گی نیرنگیاں ترکیبِ مومن کی — یہ لطفِ خوش بیانی حسرتِ رنگیں بیاں تک ہے

مومن کی بعض اور خصوصیات جن کا تعلق موضوع سے ہے اور جن کا ذکر حسرت نے نہیں کیا ہے، ان کی جلوہ گری بھی کبھی کبھی حسرت کے یہاں ہوجاتی ہے اور وہ بھی مومن کی طرح اسرارِ محبت کی پردہ دری کرنے لگتے ہیں ؎

شعرِ حسرت نے سارے کھول دئے — عشق بازی کے عقدہ ہائے ادق

بہرحال حسرت، مومن کے اندازِ بیان پر فریفتہ ہیں، اُن کی ترکیبوں کے قائل اور اُن کی رنگیں نگاری کے گھایل ہیں۔ حسرت کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی کلیاتِ حسرت کے ہر صفحے پر یہ خصوصیتیں تلاش کر لے گا۔

اسی طرح حسرت نے ”اردوئے معلّٰی“ میں نسیم دہلوی پر ایک مضمون لکھا ہے اور اس سلسلہ میں اُن کے رنگِ سخن کی کئی خصوصیتوں کا ذکر کیا ہے نسیم اور مومن کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نسیم نے دلفریبیٔ خیال اور رنگینیٔ بیان کی خصوصیتیں مومن سے حاصل کیں، اس سرمایہ میں ”تجدیدِ زبان“ کا اضافہ کیا، لکھنؤ کی زبان اور دہلی کے بیان کی پیوندکاری اور معتدل ترکیب کا جلوہ دکھایا اور سادگیٔ الفاظ، تازگیٔ خیال اور رنگینیٔ ترکیب سے غزل میں خوشگوار مستی پیدا کی۔ ان کا معلوم ہوتا ہے کہ خالص غزل گو کی حیثیت سے حسرت، نسیم دہلوی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ اپنے اشعار میں بھی انھوں نے پیرویٔ نسیم کا جس قدر چرچا کیا ہے اتنا کسی اور کا نہیں ؎

مرحبا حسرت زہے اندازِ نسیم — لطف ہر ہر شعر میں ہے بندشِ استاد کا

حسرت رد اور بھی ہیں اتنا رہے خیال — اشعار میں نسیم کا رنگِ بیاں رہے

نسیمِ دہلوی کی پیروی آساں نہیں حسرت — تجھی سے ہے کہ یہ نیرنگیٔ گفتار پیدا ہے

اور پھر وہی مومن کی رنگیں نگاری جو نسیم اور تسلیم سے ہوتی ہوئی حسرت تک پہونچی ہے ؎

حسرت تری شگفتہ کلامی پہ کیوں نہ ہو — یاد آگئیں نسیم کی رنگیں نگاریاں

یہ فنی رشتہ منشی تسلیم کے ذریعہ سے قایم ہوا تھا اور حسرت نے ”اردوئے معلّٰی“ میں اُن پر بھی ایک مضمون کئی قسطوں میں لکھا ہے جس میں اُن کے ابتدائی کلام کے لکھنوی رنگ، اور رابعہ کے دہلوی رنگ [illegible] اُن کا اندازِ بیان [illegible] خصوصیات کی جستجو کی ہے جن کا تذکرہ مومن اور نسیم دہلوی کے سلسلہ میں ہوا۔ اس طرح حسرت نے [illegible] اور ذوق کی [illegible] کا پتہ دیدیا ہے۔ لیکن جب ہم حسرت کی غزل گوئی کا مطالعہ کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ حسرت کا رنگ [illegible] مومن، نسیم اور تسلیم کے [illegible] کا عکس نہیں ہے بلکہ بعض اور اثرات سے مل کر اس کی خود ایک انفرادی حیثیت ہوگئی ہے۔ حسرت کا مطالعہ اور خاص کر اردو غزل کا مطالعہ بہت وسیع بھی تھا اور تنقیدی بھی [illegible] جتنا بڑھتا گیا اسی قدر ان کا اندازِ بیان نکھرتا اور لوچ دار ہوتا گیا۔ ابتدا میں [illegible] مومن، نسیم اور تسلیم کا ذکر ہوتا تھا [illegible] سعدی، شمس تبریز (مولانا روم)، فغانی، حافظ، جامی، نظیری، میر، قایم، مصحفی، انشا، جرأت اور غالب کے نام بھی شامل ہوگئے [illegible] کوئی صاحب جو فارسی اور اردو غزل کی تاریخ سے واقف ہے، اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ انھیں کے دم سے غزل [illegible] ایک انوکھا رنگ [illegible] منفرد ہے اور حسرت ان کے اندازِ بیان، رعنائی اور کیفیت کو نچوڑ لینے کے آرزومند ہیں کیونکہ انھیں [illegible] سادگی [illegible] سرشاری، سحر انگیزی، شگفتہ بیانی، جدت طرازی اور شوخیٔ گفتار سے غزل کو سدا بہار شباب نصیب ہوا ہے۔ حسرت ان کی جن ادا کو سراہتے ہیں وہ یہ ہیں ؎

گزرے بہت استاد مگر رنگِ اثر میں — بے مثل ہے حسرت سخنِ میر ابھی تک

شعر میرے بھی ہیں پُر درد ولیکن حسرت — میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

شعر میرے ہوئی مصحفی و میر کے بعد — تازہ حسرت اثر و حسنِ بیاں کی رونق

شعر [illegible] اندازِ [illegible] — حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

قایم ہے ترے دم سے طرزِ سخن قایم ‏— پھر ورنہ کہاں حسرت یہ رنگِ غزلخوانی
غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن ‏— طبعِ حسرت نے اُٹھایا ہے ہر استاد سے فیض
حسرت اُردو میں ہے غزل تیری ‏— پر تو نقش سعدی و جامی
اُردو میں کہاں ہے اور حسرت ‏— یہ طرز نظیری و فغانی
مجھے فیض سخن پہونچا ہے حسرت ‏— ز روح پاک شمس الدین تبریز
ہم جامی و حافظ کے بھی قایل ہیں یہ حسرت ‏— خوبی میں نہ پہونچا کوئی سعدی کی غزل تک
حسرت بہ غزل چو شمس تبریز ‏— باشد سخن تو نغز و مرغوب
طرفہ حسرت بہ شوخی انشا ‏— رنگِ جرأت مرے بیان میں ہے

حسرت کی طرفگی سخن کا راز اُن کے اس ادا شعور میں ہے جس نے اُن کو بہترین رہنماؤں سے فیض اُٹھانے پر آمادہ کیا۔ اُن کی قوتِ انتخاب اور صحیح شاعرانہ شعور نے، زمانے کی روش اور حقیقت پسندی کے مطالبات سے مل کر ان شعراء کی روایات میں سے وہی عناصر لئے جو ان کے تصورِ حیات کو سادہ لیکن پر اثر طریقہ پر پیش کرنے میں مدد دے سکتے تھے۔ انھوں نے میر کی غم کوشی اور یاس پسندی سے پرہیز کیا، مومن کے رقیب و اسوخت کے انداز اور رعایت لفظی سے بچنے کی کوشش کی، جرأت اور انشاء کی شوخی کو عامیانہ پن اور ابتذال سے بچا کر اپنایا اور ان کی معاملہ بندی کو بیسویں صدی کے ذوق کے سانچے میں ڈھالا۔ اس طرح انھوں نے اپنے آسمان شاعری کے لئے نئی قوس قزح تیار کی۔

ایسا انتخابی ناقدانہ شعور دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حسرت کا کوئی نظریۂ فن بھی تھا؟ نظریۂ فن میں درحقیقت فن اور زندگی کے تعلق کا سوال بھی پوشیدہ ہوتا ہے کیونکہ کوئی اچھا شاعر اس پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ حسرت نے اُردوئے معلّٰی میں متعدد مضامین لکھے لیکن انھوں نے عام طور سے اصولِ شاعری اور نفسِ شاعری سے بحث نہیں کی ہے، مختلف مضامین کے درمیان میں سرسری اشارے آتے ہیں اور مجموعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نفسِ شاعری کے متعلق اُسی قدیم یونانی نظریہ کو تسلیم کر لیا تھا کہ شاعری اور مصوری دونوں میں حقیقت کی ہو بہو نقل اُتاری جاتی ہے چنانچہ نکاتِ سخن میں ایک جگہ انھوں نے اس کا ذکر کیا ہے:-

"اربابِ نظر نے شاعری اور مصوری کو ایک ہی قبیل سے قرار دیا ہے، اس کی بنیاد یہ ہے کہ جس طرح کامیاب مصوری کے لئے لازم ہے کہ جس چیز کی نقل اتاری جائے، وہی ہو بہو تصویر میں نظر آئے۔ اسی طرح سے حقیقی شاعری کے لئے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ واقعات محبت، کے بیان میں تصنع سے کام نہ لیا گیا ہو اور جذبات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہو، عام اس سے کہ وہ جذبات علوی ہوں یا سفلی۔ اگر جذبات عالی ہوں گے تو شاعری جذبہ نگاری اور واقعہ نگاری کی شکل اختیار کرے گی ورنہ معاملہ بندی ہو جائے گی اور ہمارے نزدیک یہی تینوں چیزیں شاعری کا بہترین نمونہ ہیں"

اس سے کچھ اور معلوم ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو اس کا اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ حسرت ایک خاص قسم کی واقعیت اور حقیقت کو شاعری کے لئے ضروری سمجھتے تھے ایک حیثیت سے تصورِ فن کی یہ ایک اہم بنیاد ہے اور اس کی مدد سے بھی ہم حسرت کے مذاقِ سخن کو پرکھ سکتے ہیں کیونکہ حقیقت پسندی موضوع کے انتخاب کے ساتھ ساتھ تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور اندازِ بیان کو بھی متاثر کرتی ہے، ابہام سے بچاتی اور الفاظ کے مناسب اور برمحل استعمال پر مایل کرتی ہے۔ اسی حقیقت پسندی کی وجہ سے روایتی خیالات اور موضوعات سے بغاوت کا خیال بھی پیدا ہوتا ہے اور نظر کی تنقیدی صلاحیت بڑھ کر اندھی تقلید سے بچاتی ہے۔ متروکات، معائب اور محاسنِ سخن کے بیان میں حسرت نے جگہ جگہ پر روایتی نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے بلکہ ایک جگہ تو اپنے استاد امیر اللہ تسلیم کی ایک اصلاح کے ماننے سے صرف اسلئے انکار کر دیا ہے کہ وہ ان سے متفق نہ ہو سکے (ملاحظہ ہو نکاتِ سخن از حسرت موہانی ص۹۹ مطبوعہ انتظامی پریس حیدر آباد دکن) اسی طرح ابتذال کے حدود معین کرتے ہوئے انھوں نے بڑی آزادانہ رائے دی ہے:-

" فاسقانہ شاعری (یعنی کمتر درجے کے جذبات ہوس کی مصوری لیکن صحیح مصوری) کو بدمذاقی پر محمول کرنا، سوقیانہ و مبتذل قرار دینا" انصاف کا

خون کرنا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ جب شاعری کا مقصد صحیح جذبات کی مصوری ہو تو پھر اس کے دایرہ کو پاک جذبۂ عشق و محبت تک محدود کر دینے اور عامہ خلایق کے مانوس و فیصدی جذبات ہوس کو اس سے خارج کر دینے کی کوشش اور وہ بھی محض اس بنیاد پر کہ ان کا اظہار واعلان بعض فقیہانہ و ملّایانہ طبایع کی مصنوعی پالیسی کی خیال کے لئے ناگوار ثابت ہوگا، خود مخالفین ہوس نگاری کی انتہائی بد مذاقی اور بے شعوری کے سوا اور کسی چیز پر دلالت نہیں کرتا۔۔۔۔۔ البتہ اس ضمن میں حدِ اعتدال سے گزر جانا۔۔۔۔۔ بیشک قابل اعتراض ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

یہ عبارت حسرت کے ایک غیر مطبوعہ مقالہ سے اخذ کی گئی ہے۔ حسرت موہانی مصنفہ عبدالشکور میں جس کے کچھ حصے نقل کئے گئے ہیں[1] تو اد راک حقیقت کے اسی نقطۂ نظر سے حسرت کی شاعری، شخصیت اور کردار کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ نکاتِ سخن کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خیالات کے مقابلہ میں حسرت زبان و بیان کی لطافتوں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ معائب اور محاسن دونوں میں انھیں پر زور دیا گیا ہے۔ مثلاً محاسنِ سخن میں انھوں نے جو سترہ نکتے بیان کئے ہیں، محض اُن کے عنوان لکھ دینا ہی اس خیال کی وضاحت کر دے گا۔ (۱) تکرار الفاظ - (۲) صدقِ محاورہ، صفائی زبان و سادگی بیان - (۳) ترجمہ محاورہ فارسی - (۴) شوخیِ کلام و رندیِ مضامین - (۵) تازگیِ بیان و ندرتِ مضمون - (۶) حُسنِ ترکیب، خوبیِ استعارہ و لطفِ تشبیہ - (۷) حسنِ استعمال الفاظ جمع مخصوص بہ خاندان مومنؔ و نسیمؔ - (۸) معاملہ بندی، واقعہ گزاری و جذبہ نگاری - (۹) متانتِ مضمون، بلندیِ جذبات و مذاق تصوف (۱۰) مطابقت الفاظ مضمون - (۱۱) نقلِ قول کی تازگی - (۱۲) کنایہ - (۱۳) سوز و گداز - (۱۴) مصرعوں کا تقابل اور الفاظ کا الٹ پھیر - (۱۵) پسندیدگی جملہ خبریہ بہ مقابلہ جملہ انشائیہ - (۱۶) تعدد الفاظ و فقرات موزوں اور - (۱۷) سہلِ ممتنع - تفصیل سے بحث کرنے کا موقع ہوتا تو ان عنوانات کے تحت بھی حسرت کے نظریۂ شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی جاتی اُس وقت یہ بات اور زیادہ نمایاں ہو جاتی کہ حسرت کی شاعری فکری نہیں ہے بلکہ جس دبستان سے اُن کا تعلق تھا اُس میں خود فکری شاعری کا فقدان تھا، مومنؔ، نسیمؔ دہلوی اور تسلیمؔ سبھی حُسن و عشق کی دنیا کے مبصر اور مصوّر تھے، ان کے یہاں کسی قسم کی گہرائی کی جستجو فضول ہے، حسرت سیدھی باتوں کو پیچیدہ بنا کر پیش کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ محض نغز گوئی کے لئے نغز گوئی بھی اُن کا شعار نہیں ہے

غزل گوئی رہی یکتا میان عاشقاں میری — کہاں سے پھر کوئی لاتا بیاں میرا زباں میری

سہل کہتا ہوں ممتنع حسرت — نغز گوئی مرا شعار نہیں

پسند آیا طریق شاعری تیرا ہمیں حسرت — کہ جب کہنا کبھی کچھ نغز کہنا بے بدل کہنا

دامنِ شعرِ عشق پر حسرت — داغِ اہمال و ابتذال نہیں

شعر حسرت نے سارے کھول دئے — عشق بازی کے عقدہ ہائے ادق

حسرت نے ساری عمر غزل ہی پر ریاض کیا اور اس میں شک نہیں کہ غزل میں جس قسم کے اندرونی تجربوں کا اظہار ہوتا ہے اُس میں زبان و بیان کی لطافت کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ وہاں منطقی استدلال کے بجائے دل میں اُتر جانے والے کنایوں اور استعاروں سے مناسب اور مترنم الفاظ سے اور حسین ذہنی خیز تراکیب سے کام لینا ہوتا ہے۔ انھیں سے وہ جذباتی تصویریں بنتی ہیں جو دل میں گھر کر لیتی ہیں۔ یہاں پھر یہ یاد دلا دینا ضروری ہے کہ اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ چیزیں خود اپنی جگہ پر کافی ہیں کیونکہ یہ تو لباس ہیں اور جب تک لباس کے لئے خوبصورت اور توانا جسم نہ ہو تنہا اس کا حُسن کوئی جادو نہیں جگا سکتا۔

حسرت کے یہاں اچھے شعر کی پہچان کیا تھی ؟ اس کا جواب مختصراً انھوں نے یہ دیا تھا ؎

---

[1] اس ضمن میں راقم الحروف کو ایک اور واقعہ یاد آیا۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا سالانہ اجلاس حیدر آباد دکن میں منعقد ہوا۔ مولانا حسرت موہانی مرحوم بھی اس میں شریک ہوئے۔ ایک اجلاس میں جس کی صدارت راقم الحروف ہی کر رہا تھا یہ تجویز پیش ہوئی فحاشی و عریانی وغیرہ سے ترقی پسندی کا تعلق نہیں اور جو ادیب اسے اپنا مطمح نظر بناتا ہے وہ ترقی پسند نہیں۔ تجویز کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز جو بلند ہوئی وہ مولانا مرحوم کی تھی حقیقت نگاری اور لطافتِ بیان کے نام پر انھوں نے اس تجویز کی ایسی مخالفت کی کہ اس وقت اس بحث کو ملتوی کرنا پڑا اور طے ہوا کہ مولانا کے مشورہ سے تجویز کے بجائے ایک بیان اس سلسلہ میں شایع کیا جائے۔

شعر دراصل ہیں وہی حسرت　　سنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں

دل میں اُترنے والے شعر معنی اور صورت دونوں کی ترازو پر پورے اُترتے ہیں بلکہ انھیں پر غور کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعری میں معنی اور صورت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، اعلیٰ ترین شاعری میں یہ دونوں چیزیں ایک ہی حقیقت کے دو پہلو معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ حسرت کے منتخب اشعار میں یہ کیفیت دیکھی جاسکتی ہے۔

ادب اور شعر کے مطالعہ کے سلسلہ میں زبان کو جتنی اہمیت دی جائے کم ہے۔ زبان کے صحیح استعمال سے واقفیت، الفاظ کی قوت اور رنگ روپ کی پہچان کے بغیر شاعر اپنے فن سے واقف نہیں کہا جاسکتا۔ زبان کا یہ علم محض روایتی زباندانی تک محدود نہیں ہونا چاہئے بلکہ زبان کے تخلیقی عمل کا علم بھی ضروری ہے۔ حسرت کے وسیع مطالعہ نے انھیں زبان اور الفاظ کے استعمال اور لفظوں کے نازک اختلافات کو سمجھنے اور پرکھنے پر قادر بنا دیا تھا۔ نکاتِ سخن کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے۔ انھیں اس بات کا احساس بھی تھا کہ زبان کو مانجھنے، سنوارنے، اظہار خیال کے زیادہ سے زیادہ قابل بنانے میں لکھنؤ کا بڑا ہاتھ ہے اور وہ شعر کا حُسن بڑھانے میں اس سے کام لینا چاہتے تھے۔ اس لئے چاہے وہ "طرزِ لکھنؤ" کو پسند نہ کرتے ہوں لیکن زبانِ لکھنؤ کو نظرانداز نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں :-

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود　　تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہوگیا

لکھنؤ کی زبان کا دہلی کے اندازِ بیان میں پیوند لگانے ہی کی وجہ سے حسرت نے نسیم دہلوی کے رنگِ سخن کو سراہا تھا اور شاید یہی بات منشی امیراللہ تسلیم کے یہاں بھی ملی تھی لیکن جب انھیں زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل ہوگئی تو اُن کے ذہن سے وہ مکانی فرق ختم ہوگیا جو ارتقائے لسان کے اصولوں کو سامنے رکھے بغیر ذہنوں میں جمود کی کیفیت پیدا کردیتا ہے، چنانچہ آگے بڑھ کر انھوں نے کہا ؎

رکھتے ہیں عاشقانِ حُسنِ سخن　　لکھنوی سے نہ دہلوی سے غرض

یہ فنا فی الشعر ہونے کی منزل ہے جہاں اپنا انداز خود متعین ہوجاتا ہے۔ مشہور انگریز صاحبِ قلم اسٹیونسن نے کہا ہے کہ میں نے بہت سے اساتذہ کی نقل کی یہاں تک کہ خود میرا ایک رنگ بن گیا، حسرت کے لئے بھی یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے مختلف شعراء کی تقلید میں غزلیں لکھیں لیکن آگے بڑھتے بڑھتے خود اُن کا ایک رنگ نکھر آیا جو روایتی انداز کا تسلسل بھی رکھتا ہے اور نیا پن بھی، فارسی اور غزل گوئی کے آہنگ سے ہٹا ہوا بھی نہیں ہے اور صرف اسی کا پرتو بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اگر حسرت کا رنگِ سخن محض چند رنگوں کا مجموعہ ہوتا تو وہ کبھی اتنے بڑے فن کار نہ ہوتے لیکن اُن کے یہاں جو تازگی، لطافت، شگفتگی، واقعیت اور سادگی ہے وہ اُن کے انفرادی اور روایتی شعور کا نتیجہ ہے اسی لئے تو وہ تعلّی آمیز انداز میں یہ دعویٰ کرسکے ؎

تونے حسرت یہ نکالا ہے عجب رنگ غزل　　اب بھی کیا ہم تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں

اثر جو نغمۂ حسرت میں ہے وہ اور کہاں　　کلام دیکھ لیا سُن لیا ہزاروں کا

اے وہ کہ تجھے شوق ہے تحسینِ غزل کا　　میرا جو کہا مان تو حسرت کی غزل دیکھ

بخشا ہے پسندیدگی خلق نے یکسر　　درجہ مرے اشعار کو ضرب المثلی کا

حسرت کے نگار خانۂ غزل میں کئی اساتذہ کی تصویریں نظر آتی ہیں لیکن اس نقار خانہ کی مجموعی بہار اور رونق اپنا ایک الگ حُسن رکھتی ہے۔ اُن کے رنگِ سخن میں جو آراستگی اور شائستگی ہے اُس کی مشاطگی صدیوں کے تہذیبی ارتقا نے کی ہے۔ ان کی غزلوں میں مشرقی تصورِ محبت کے ڈھانچے میں خود اُن کی کامیاب محبت کی تصویریں ہیں، روایتی محبوب کے پردے میں خود اُن کا اپنا محبوب ہے جس کا حُسن الفاظ کی چلمن سے بڑا اچھا لگتا ہے، اُن کے تجرباتِ عشق میں سُنی سنائی یا کتابی باتوں کی جگہ ذاتی تجربات کے نقوش ہیں۔ چند اشعار سے یہ ساری باتیں آئینہ ہوجائیں گی ؎

حُسنِ بے پرواہ کو خودبین و خودآرا کر دیا　　کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

بدلِ لذتِ آزار کہاں سے لاؤں　　تجھ کو اب اے ستم یار کہاں سے لاؤں

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی　　مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد — ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں — جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

آج سُن کر میرے نالوں کو ز راہِ التفات — زیرِ لب اُس نے بھی کھینچی ایک آہِ التفات

اہلِ دل سنتے ہیں اک سازِ محبت کی نوا — جب تری یاد میں ہم نغمہ سرا ہوتے ہیں

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن — آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

میں بے خبرِ غم تھا مگر وہ دمِ رخصت — دیکھا کئے مُڑ مُڑ کے مجھے حدِ نظر تک

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت — ان سے مل کر بھی نہ اظہارِ تمنا کرنا

یہ بھی اک چھیڑ ہے کہ قدرت نے — تم کو خود بیں ہمیں غیور کیا

کیا کیا نہ یادِ یار سے ہوں شرمسار ہم — فرصت کبھی جو کشمکشِ روزگار دے

تجھ سے اب مل کے تعجب ہے کہ عرصہ اتنا — آج تک تیری جدائی میں یہ کیونکر گزرا

لاکھوں ہیں تری دید کے مشتاق مگر ہم — محروم تجھے دل سے بھلانے میں لگے ہیں

تری یاد بے اختیار آرہی ہے — تمنا کی فصلِ بہار آرہی ہے

آجاتی ہے ناگاہ جدائی کی مصیبت — ہوتی ہے خبر کس کو ترے عزمِ سفر کی

یہ کس کے عجزِ تمنا کا پاس ہے کہ وہ شوخ — بہ زعمِ ناز بھی دامن چھڑا نہیں سکتا

طلبِ لذتِ آزار سے کچھ بھی نہ ہوا — اُس جفا پیشہ ستمگار سے کچھ بھی نہ ہوا

جورِ پیہم نہ کرے شانِ توجہ پیدا — دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

ایک ہی بار ہوئیں وجہِ گرفتاریِ دل — التفات اُن کی نگاہوں نے دوبارا نہ کیا

برسرِ ناز وہ از راہِ کرم پہونچا تھا — شبِ عجب لطف کا سامان بہم پہونچا تھا

دل کچھ اس ڈھب سے لئے اُٹھے کہ برسوں کوئی — حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پایا

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے — ہم نے اُس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

کوئی کسوٹی ایسی نہیں ہے جو ان اشعار کی کامیابی کو اس طرح پرکھ سکے کہ مضمون، نفسیاتی کیفیت، محاکات، اسلوب، ترنم، لطفِ زبان اور شگفتہ بیانی کے تناسب کا پتہ الگ الگ چل جائے، یہاں تمام پہلو ایک ہوکر شعور پر اثرانداز ہوتے ہیں اور شاعر کے شعور اور کمالِ فن کی طرف اشارہ کرتے ہیں ان اشعار سے حسرت کی شخصیت اور شاعری کی ہم آہنگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح کے اشعار میں جو مضبوطی اور چُستی ہے وہ حسرت کے کردار کی مضبوطی بھی ظاہر کرتی ہے، ان کی سادگی اور پُرکاری، محبت، انسان دوستی کا گداز اور پُرنشاط کیف انگیزی دورِ جدید کے وجدان سے رنگ حاصل کرتی ہے اس لئے اثرانگیز ہے۔ مختصر یہ کہ حسرت کی شاعری میں صداقت، توانائی، جذبات نگاری اور سادگیِ مزاج کی وجہ سے اندازِ بیان کی جو خصوصیتیں پیدا ہوئی ہیں وہ فلسفہ و فکر کی گہرائیوں سے محروم ہونے کے باوجود زندہ، پائندہ اور حسین ہیں اور چند موضوعات میں محدود ہوتے ہوئے بھی تغزل سے مالامال ہیں۔

شہاب کی سرگزشت

حسرتؒ موہانی مرحوم کی شاعری پر ایک سرسری نظر

(مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی)

حالی نے اُردو شاعری کی جن بُرائیوں اور خامیوں کی طرف توجہ دلائی تھی اُن کی اصلاح کا بیڑا سب سے پہلے حسرت موہانی اور صفی لکھنوی نے اُٹھایا۔ صفی کی خدمات کا اعتراف خود حسرت نے کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ صفی کی زندگی کا کارنامہ ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں ترمیم اور اصلاح کی ہمت کی اور اپنے کلام کو نئی تخیل، جدید مضامین اور ندرت سے مزین کیا۔ یہ مضمون اُردوئے معلّیٰ کے کسی پرچے میں شایع ہوا تھا جو میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس کے راوی شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری ہیں جن کی راست گفتاری میں شبہ کی گنجایش نہیں۔ ایک زمانہ کے بعد صفی زیادہ تر نظم نگاری کی طرف متوجہ ہو گئے مگر حسرت نے از ابتدا تا انتہا غزل اور صرف غزل کو اپنی فکرِ سخن کا مرکز بنا کر اس کی بگڑی ہوئی اداؤں کو ایسا سنوارا اور بنک ٹک سے درست کیا کہ بجا طور پر دُنیائے ادب میں رئیس المتغزلین مشہور ہوئے۔

حسرت کی غزل میں جو چیز سب سے پہلے دامنِ دل کھینچتی ہے وہ شدت احساس کے ساتھ صداقت و خلوص اظہار ہے۔ تُکے بندوں اور زمین و آسمان کے قلابے ملانے والوں نے غزل کو اسی خوبی و لطافت سے محروم کر دیا تھا۔

حسرت کے کلام کا ایک حصّہ ایسا بھی ہے جو بے لطف و بے کیف ہے۔ اس کا تعلق بیشتر سیاسیات سے ہے یا پیشوایان مذہب کی مدح سرائی سے یا پھر وہ اشعار ہیں جن کا مذاق عامیانہ و مبتذل ہے مگر حسرت نے اُن کو "فاسقانہ" قسم کا قرار دیکر جواز کی صورت نکالنا چاہی ہے۔ مثلاً ؎

مٹ گئے رہے دونوں بتقریب وصل   درد مرے دل کا زکام آپ کا

حیرت ہوتی ہے کہ حسرت سا شاعر ایسا شعر کہے اور کہنے کے بعد اپنے کلیات میں شامل بھی کرے۔ جس غزل کا یہ شعر ہے رسالۂ زمانہ میں شایع ہوئی تھی اور مجھے خوب یاد ہے کہ اُس وقت "درد مرے دل" کی جگہ "درد مرے سر" کا تھا۔ دردِ سر اور زکام میں ایک ربط بھی تھا۔ درد دل کہنے سے سوقیت میں تصنع کا اضافہ ہو گیا، مذاق بدستور پست رہا۔ ایسے نمونے خال خال ہیں۔ معقول حصّہ کلام حالات و واردات حُسن و عشق کا دلکش مرقع ہے۔ مجازی عشق میں بھی وہی کیف و سرخوشی، وہی محویت و سپردگی، وہی خلش اور خلش میں لذت ہے، وہی پاکیزگی و نفاست ہے، وہی نفس کی آلودگی سے اجتناب ہے جو میر کا طرۂ امتیاز ہے ؎

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرت کا   وہ وضع پارسا اُسکی، وہ عشق پاکباز اُس کا

حسرت کی متصوفانہ شاعری بھی مقامات حسن و عشق و حیرت عشق سے بہت کم آگے بڑھتی ہے ؎

ہر لحظہ وظیفہ ہے جان و دل آگہ کا   الحسن ہو الحق کا، والعشق ہو اللہ کا

اس کے علاوہ جو کچھ تصوف میں ہے وہ پیرانِ طریقت سے اظہارِ عقیدت ہے جس میں خلوص تو ہے۔ چند مستثنیات کو چھوڑ کر شعریت کا فقدان ہے خواجہ درد و میر کی طرح مسایل تصوف شعر کے سانچے میں نہیں ڈھلتے۔

حسرت کی شاعری میں لکھنؤ کی زبان اور متقدمین و متوسطین شعرائے دہلی (کیونکہ بعد کو دہلی کے شاعر ہوں یا لکھنؤ کے ایک حمام میں سبھی ننگے تھے) کی تخیل کا بہترین امتزاج ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود   تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

زبان و بیان کے اس قران السعدین نے اُن کے کلام میں غضب کی شیرینی، روانی اور دلکشی بھر دی ہے۔ اُن کی غزل ایسی محبوبہ ہے جس کی روح بھی اُس کے جسم کی طرح حسین ہے۔ اگر میرا قیاس غلط نہیں تو اس گھلاوٹ، اس شگفتگی، گلاب کی آمیزش کا خیال نسیم دہلوی کے کلام کے مطالعہ نے پیدا کیا جو دہلوی ہونے کے باوجود لکھنؤ میں عرصے تک مقیم رہے تھے اور لکھنؤ کی زبان کو اپنا لیا تھا۔ یہ حسرت کے اُستاد تسلیم کے بھی استاد تھے۔ یہ بھی ایک وجہ ارادت ہو سکتی ہے۔ حسرت کے کلام میں جتنے اشارے نسیم دہلوی کی طرف ہیں کسی دوسرے شاعر کی طرف نہیں۔ یوں تو انھوں نے اکثر اساتذہ کا ذکر کیا ہے۔ اُن کی پیروی کا دم بھرا ہے۔ غالب کے شارح ہونے کے باوصف اس کی شاعری کے معترف نہیں معلوم ہوتے۔ یہ مقطع دعوت غور دیتا ہے ؎

ہو کے بے خود کلام حسرت سے ۔۔۔ "آج غالب غزل سرا نہ ہوا

اس میں وہ فریفتگی اور کسب فیض کی نوعیت کا اعلان کہاں جو ان اشعار میں ہے:۔

شعر سے تیرے ہوئی مصحفی و میر کے بعد ۔۔۔ تازہ حسرت اثر و حسن بیاں کی رونق

شیرینیِ نسیم ہے سوز و گداز میر ۔۔۔ حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

گزرے بہت استاد مگر رنگ اثر میں ۔۔۔ بے مثل ہے حسرت سخن میر ابھی تک

شعر میرے بھی ہیں پُر درد ولیکن حسرت ۔۔۔ میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

گو ایک جگہ غالب کا نام بھی دیگر اساتذہ کے زمرے میں آگیا ہے ؎

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن ۔۔۔ طبع حسرت نے اُٹھایا ہے، اساتذہ سے فیض

سادگی اور صفائی کے ساتھ حسرت کے کلام میں خوشنما و خوش رنگ فارسی ترکیبیں بھی حسن بیان میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کے استعمال میں اعتدال حسرت کے صحیح وجدان کا شاہد ہے۔ یہ بھی غالب نہیں بلکہ میر کے گہرے مطالعہ اور اُسی طرح موقع و محل کے مناسب انتخاب الفاظ کا نتیجہ ہے۔

حسرت نے کمال کیا ہے کہ مروجہ تلمیحات میں سے کسی کو بھی اپنے کلام میں جگہ نہیں دی ہے۔ لیلیٰ و مجنوں، فرہاد و شیریں، خضر و موسیٰ وغیرہ کسی کا ذکر نہیں۔ کم سے کم سرسری مطالعہ میں یہی اندازہ ہوا۔ داخلی شاعری میں یہاں تک انفرادیت برتی ہے۔ یوں تو دعویٰ ہے "بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست" مگر حسرت کے کلام کی سب سے نمایاں خوبی اس کی معصومیت اور ادائے خیال میں اُپج کے ساتھ بانکپن ہے۔ دراصل یہی حسرت کی کامیاب شاعری کا راز ہے کیونکہ یہی اوصاف اُن کے کردار کے آئینہ دار ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔ ؎

بیتابیوں سے چھپ نہ سکا ماجرائے دل ۔۔۔ آخر حضور یار بھی مذکور کر دیا

خود بیتابیوں کو حضور یار ماجرائے دل بیان کرنے کا مجرم قرار دیا ہے۔ اس انداز میں تخیل کی جولانیوں کے لئے کس قدر سامان مہیا ہے:۔

بیتابیاں ہیں، عام کہ اس حسن شوخ نے ۔۔۔ دنیا سے محو صبر کا مضمون کر دیا

دوسرے مصرع میں اسلوب کی بداعت قابل دید ہے۔ دنیا سے سب ایسا اُٹھا کہ صبر کرنا کیسا کوئی صبر کو یاد نہیں کرتا، یاد کرنا کیسا نام بھی نہیں لیتا۔

حسرتیں دل کی ہوئی جاتی ہیں پامال نشاط ۔۔۔ ہے جو وہ جان تمنا رونق کاشانہ آج

پامال نشاط کی وضاحت کو سمجھنے کے صفحے ناکافی ہیں۔

یہی خوبی کہیں کہیں تشبیہ و استعارہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

دل مایوس میں ہے نقش امید ۔۔۔ یا مسافر کوئی غریب دیار

دل مایوس میں نقش امید کو "مسافر غریب دیار" کہنا جدید ہوتے بھی حقیقت سے ہمکنار ہے۔ مگر میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ غریب الدیار کا بدل "غریب دیار" محل نظر ہے۔ ممکن ہے کہ قدما کے کلام میں ہو:۔

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام ۔۔۔ دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام

حقیقت سمجھئے یا مجاز۔ جو انجمن ہے وہی چمن ہے اور وہی جمال یار روشنیِ انجمن و بہار چمن ہے اور یہ تخیل کا کرشمہ ہے کہ نور و نار کو متحد کر دیا:۔

ہے ہیں طلبگار شوقِ گونا گوں   حسن کے جلوہائے رنگا رنگ

جلوہائے رنگا رنگ سے مکیف ہونے کو شوق (صفت واحد) میں نیرنگی کی خواہش تاکہ ہر جلوے کو اُس کے شایان انداز سے دیکھے کس قدر لطیف اور اُسی کے ساتھ اچھوتا خیال ہے۔ شوق گونا گوں کا تقابل جلوہائے رنگا رنگ سے غیر شاعر کر ہی نہیں سکتا۔

بڑھ چلا تھا حد سے جورِ شیوۂ بیگانگی،   ورنہ میں اور اُس سراپا ناز کا شکوا کروں!

مومنؔ کا رنگ نمایاں ہے۔ شکوہ خلاف شانِ محبت ہے مگر اُس وقت جائز ہے جب معشوق کا شیوۂ بیگانگی بر بنائے جور نہ رہے بلکہ حد سے گزر کر تغافل یا بے تعلقی کا غماز ہونے لگے۔ شکوہ معشوق کے ناز پر گراں گزرے گا اور شیوۂ بیگانگی سے دھیان کو ہٹا کر عاشق سے باز پرس پر آمادہ کریگا۔ یہی عاشق کا مقصود ہے۔ ہے

ہم پر بھی قتلِ غیر ہیں کیوں مہربانیاں   اے بدگماں یہ خوب نہیں بدگمانیاں

یہ بھی مومنؔ کا رنگ ہے۔ محبوب آزمایش کے لئے غیر پر مہربان ہوا، غیر بوالہوس تھا آپے سے باہر ہو گیا۔ معشوق کو وہم ہوا کہ حسرتؔ بھی تو اسی قماش کا ہوس کار عاشق نہیں ان پر بھی مہربان ہوا۔ یہ فوراً تاڑ گئے اور خلوص سے خالی آزمایشی مہربانی کے شکوہ سنج ہوئے (ع) "اے بدگماں یہ خوب نہیں بدگمانیاں"۔ کہیں خالص حقیقت نگاری بے پناہ شعر بنجاتی ہے ہے

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی   مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

ہے   شب وہی شب ہے دن وہی دن ہیں   جو تری یاد میں گزر جائیں

فطرت نسوانی کی ایک سادہ و پُرکار تصویر:۔

خود ہے اقرار اُنھیں اپنی ستمگاری کا   پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ میں ایسا نہ کہوں

ردیف سے مجبور ہو گئے ورنہ مجھے یقین ہے کہ حسرتؔ "میں ایسا نہ کہوں" کے بجائے "تم ایسا نہ کہو" کہتے اور شعر کی رعنائیوں میں چار چاند لگ جاتے:۔ "پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ تم ایسا نہ کہو"۔ حسرتؔ کے یہاں تخیل انداز بیان اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اُس کے دوسرے معاصرین ٹاپتے پھرتے اور مانگے تانگے کا سامان فراہم کرنے میں دوڑ دھوپ کیا کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔ تسکینِ اضطراب کو آئے تھے وہ مگر   بیتابیوں کی روح کو بالیدہ کر چلے

اس شعر کا سوز و گداز و درد و خستگی تعریف سے مستغنی ہے اور لطف یہ ہے کہ لکھنؤ کی زبان ہی نہیں بلکہ بظاہر لکھنوی رنگ بھی ہے۔

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے   بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

معشوق کی عہدِ کرم سے روگردانی، بعد ازاں بیگانگی برتنے کا تہیہ۔ ان سب امور کو "خفا ہو جائیے" میں بند کر دیا اور اس کا اطلاق گزشتہ و حال و پیوستہ زمانے پر یکساں ہونا اور ضمناً یہ پہلو نکلنا کہ "ہماری جان کشمکش پر جو کچھ گزرے گی گزرے" غزل کے پیمانے کی تنگی کے باوصف وسعت کا شاندار نمونہ ہے۔ اس شعر میں کیلا الفاظ نے کیا کیا مزا ابھرا ہے:۔   اک میں ہوں سو میں کیا ہوں محرومِ فراغت ہوں   اک دل ہے سو کیا دل ہے مجبورِ پریشانی

اسی غزل کا دوسرا شعر ہے:۔   یاں صبر میں پنہاں ہے کیفیت بیتابی   واں لطف سے پیدا ہے انداز ستمرانی

دونوں اشعار میں متعدد صنائع و بدائع ہیں ایک ان میں جلد ترصیع ہے یہ ایسی صنعت ہے جو آورد سے زیادہ آمد کی ضامن ہوتی ہے۔

کسی اچھی چیز کا بھی حد سے زیادہ ہونا اُس کی قدر و منزلت کو گھٹا دیتا ہے۔ اس حقیقت کو زبان شعر و نغمہ میں یوں بیان کیا ہے۔

کثرتِ مئے التفات آموزِ مینوشی نہ تھی   ورنہ خمخانے میں ساقی مجھکو بیہوشی نہ تھی

"التفات آموز مینوشی" کی ترکیب زبان میں اضافہ ہے۔

کسی شاعر کا کلام اغلاط سے یک لخت پاک نہیں ہوتا۔ حسرتؔ بھی مستثنیٰ نہیں۔ لیکن من حیث المجموع اُن کا کلام اُردو غزل کے ارتقا (بلکہ احیاء) کا ایک مہتم بالشان کارنامہ ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ اُردو غزل بلا تخصیص دہلی یا لکھنؤ مسخ ہو چکی تھی حسرتؔ نے اُسے قعرِ مذلت و گمنامی سے نکال کر صحیح جادے پر لگا دیا اور وہ توانائی بھر دی کہ خود ساختہ ترقی پسندی نے اُس کے مٹانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر بال بیکا نہ کر سکی۔ جب تک اُردو زبان کا وجود ہے حسرتؔ کا نام بھی محسنینِ اُردو میں لیا جائے گا اور اُن کا کلام اہلِ ذوق کے لئے سامان نشاط ہی فراہم نہ کرتا رہے گا بلکہ ذوق کی تربیت و پرداخت میں بھی معین ہوگا۔

حسرت کی انفرادیت

(پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ایم۔ اے)

حسرت موہانی کی شاعری نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی جب غزل کو ایک فرسودہ پیکر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کے اسالیب پژمردہ ہو چکے تھے۔ اور ارباب ذوق، نظم کے خد و خال پر فریفتہ تھے۔ حسرت نے "خوان گفتگو" پر "دل و جان کی مہمانی" کی اور "راز گفتن بہ معشوق" کا حق ادا کر دیا۔ اس نے غزل کے فرسودہ پیکر میں نئی جان ڈال دی اور شمع سخن کو اس شان سے فروزاں کیا کہ اس کی انفرادیت اور استادی کا سکہ زبان پر بیٹھ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو امام المتغزلین کے لقب سے یاد کیا۔

حسرت نے اپنی نغمہ سرائی اُس وقت شروع کی جب فضا، حالیؔ کے اُن اعتراضات سے گونج رہی تھی جو انھوں نے لکھنوی غزل پر کئے تھے۔ اس نکتہ چینی نے دو مختلف ردِّ عمل پیدا کئے۔ عظمت اللہ خاں نے غزل کی گردن بے تکلف مار دینے کا حکم صادر کیا اور حسرت نے غزل کی قوتِ حیات کا اعلان کیا اور لکھنؤ کی زبان میں دہلی کے رنگ کو پیش کر کے اُس کے پامال مضامین کو بھی پہلے سے زیادہ اونچی کرسیوں پر بٹھایا۔

حسرت کی شاعری کی نشو و نما فتحپور میں ہوئی تھی جب وہ اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان کے احباب کا بیان ہے کہ وہ یہاں ایسی پُر شور شاعرانہ طبیعت لے کر آئے تھے کہ اب تک فضا اُن کے نغموں سے تھرتھرا رہی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ کی شاعری پر ناسخی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ امیرؔ نے اسے خوشنما بنانے کی کوشش کی لیکن جذبات کی نازک تحلیل ان کے بس کی نہیں تھی۔ جلالؔ نے البتہ لکھنوی لباس میں دہلی کے حُسنِ معنی کو پیش کیا اور اس طرح غزلِ جدید کے لئے راہ کھول دی۔ لیکن دہلی میں داغؔ نے بالکل نیا تغزل شروع کیا جو نہ صحیح معنوں میں لکھنوی ہی ہے اور نہ دہلوی، اسمیں دہلی کا سوز و گداز نہیں لیکن جذبات ہیں۔ لکھنؤ کا سا تصنع نہیں لیکن ابتذال ہے ——————

ٹھیک اسی زمانہ میں اصلاحی محرکات اور جدید ضروریات کی بدولت حالیؔ نے جدید اُردو غزل کا سنگ بنیاد رکھا۔ حسرت نہ حالیؔ کے اعتراضات سے خوش تھے اور نہ ان کے تنقیدی انداز کے قایل تھے —— لیکن یہ خوب سمجھتے تھے کہ غزل کا رس نچڑ چکا ہے۔ اب اس میں رنگینی صرف خونِ جگر ہی سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ماضی و حال کا صحیح جائزہ لیا اور اپنے رنگ و آہنگ سے بالکل ایک نیا راستہ نکالا جس میں ماضی کی توانائی، حال کا شعور اور مستقبل کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ اِس اعتبار سے ان کی آواز، اُردو غزل میں بالکل نئی آواز ہے۔

حالیؔ عشق و عاشقی کے بجائے جو گئے کی الاپ کے قایل تھے۔ اور کاہش انتظار اور رشک اغیار کے بجائے جس سے متاخرین کا کلام بھرا ہوا تھا وہ غزل کی اخلاقی اور سماجی اہمیت پر زور دینا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ اسوقت روایتیں مردہ ہو چکی تھیں اور شاعری صرف چند بے پردہ مضامین اور انگیا چوٹی کے ذکر کا نام رہ گیا تھا —— حسرت تمام عمر باغی رہے۔ ادب میں، سیاست میں، صحافت میں، معاشرت میں، انھوں نے جو قدم بھی اُٹھایا تھا وہ باغیانہ —— لیکن فن سے انھوں نے بغاوت نہیں کی بلکہ قدیم فنی روایتوں کو اپنے اندر جذب کر کے اس کو جلا بخشی اور اس کو اپنی ضروریات کے مطابق بنا دیا۔ یہ ان کی فن کارانہ عظمت کا ثبوت ہے۔ انسان اور فن کار دونوں میں دراصل یہی مسئلہ اہم ہے کہ وہ (یعنی انسان یا فن کار) روایات کے تسلسل سے کیا کام لیتا ہے۔ اگر ماضی سے تعلق منقطع کر لیا جائے تو فن کی شمع ایسا معلوم ہوگا کہ گل ہو گئی ہے۔ حسرت نے قدیم اساتذہ سخن سے فیض اُٹھایا ہے اور اس کی شاعری وہی آشیاں و قفس اور موج و ساحل والی شاعری ہے لیکن اُس کا لب و لہجہ، اُس کے تیور، اور اُسکی کشش جہت بالکل نئی ہے۔

حسرت کی حیثیت ماضی کو حال سے ملانے والی ایک کڑی کی ہے اور اس کی شاعری، مادی اور روحانی دُنیا کے درمیان ایک پُل ہے جو ناہمواری اور سختی اس کی زندگی میں ہے وہ اس کی شاعری میں نہیں ہے۔ جو توازن اس کو زندگی میں نہ مل سکا، اس کو اس نے غزل میں ڈھونڈھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے کلام کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی صعوبتیں بغیر غزل خوانی کے طے نہیں ہو سکتیں۔ اُس کی زندگی خود ایک غزل ہے اور جو اچھی غزل ہے وہی زندگی کے اعلیٰ ترین رخ کی ترجمان ہے۔

حسرت کے کلام میں درد کی لَو اور انسانیت کی شبنم کا پرتو ہے۔ اس کے یہاں زبان کے ساتھ جذبات بھی ہیں جو شاعری کی جان ہیں اور جن کے متعلق ارسطو کہتا ہے کہ جس میں سوز والفت نہیں وہ انسان، لازمۂ انسانیت سے خارج ہے۔ اسی کو میر نے "دردمندی" سے تعبیر کیا ہے۔ حسرت کا درد بنی نوع انسان کا درد ہے اور اُس کا غم دوراں، غم جاناں ہے۔ اس نے زندگی کے حقایق کو اس کے ہنگاموں میں شریک ہو کر سمجھا ہے۔ لیکن اعلیٰ فن کار کی طرح اُس کے یہاں خارجی اور داخلی پہلوؤں کا بہت ہی مناسب امتزاج اور اتحاد ہے۔

حسرت نے جب غزل سرائی شروع کی ہے اس وقت انگریزی سامراج کی گرفت بہت مضبوط ہو چکی تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا ردّعمل بھی شروع ہو گیا تھا اور خود حسرت نے بڑھ کر کھلے میدان میں بغاوت کا جھنڈا گاڑ دیا تھا۔ اس وقت تمام اجتماعی اور معاشرتی نظام بوسیدہ ہو چکا تھا اور زندگی میں دوبارہ تنظیم اور نظریات میں تبدیلی کی ضرورت تھی۔ جس میں یہ نیا زاویۂ نگاہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں تھی یا جو پُرانی دنیا کو چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ وہ ریاستوں میں چلے گئے تھے۔ مثلاً امیر و داغ۔ حالی زمانہ شناس تھے۔ انھوں نے زمانہ کی ہوا کو دیکھ کر چلنا شروع کیا لیکن حسرت نے قوس قزح کی ساری رنگینیاں اور فضا کے سارے نغمے اپنے اندر جذب کر کے دار و رسن کی نئے سرے سے جلوہ طرازی کی ــــ اور یہ اُن کا احسان، معمولی احسان نہیں ہے۔

حسرت کا نظریۂ حسن و عشق، اُردو کے عام شاعروں سے مختلف ہے، ان کی محبت روایتی نہیں، اصلی اور حقیقی ہے۔ ان کا عشق روحانی نہیں، مادی اور زمینی ہے۔ ان کی شاعری میں جنس کی مہک ہے جو اصغر کے یہاں نہیں ہے۔ اصغر ممکن ہے جوان رہے ہوں۔ لیکن ان کی شاعری ہمیں پیرانہ سالی ہی ملی۔ نقیب خرد کو وہ کبھی نوید جنوں نہیں دے سکے۔ عاشق و محبوب کے تعلقات جنسی کو کبھی اُن کا شعور، لطیف اور رنگین نہیں بنا سکا۔ اسی لئے اُن کے تخیل میں رنگینی ہے لیکن جذبات میں گرمی نہیں۔ اس کے برعکس حسرت کی جنسی شاعری میں ایک تقدس اور طہارت ہے جس کی مثالیں اُردو شاعری میں بہت کم ملتی ہیں۔ یہ نظریہ متاخرین کے اُس نظریۂ جنس سے بالکل مختلف ہے جس میں جاگیرداری تمدن نے ہوسناکی پر عشق کا ریشمی غلاف چڑھا دیا تھا۔ اس عشق میں غیرت اور خودداری ہے۔ اس حسن میں وقار اور ہمدردی ہے، اس محبت میں بلندی اور پاکیزگی ہے ــ یہ زندگی کی ظلمتوں میں روشنی پیدا کر دیتی ہے۔ جینے کا حوصلہ بڑھا دیتی ہے۔ اور بار حیات کو ہلکا کر دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ ... "زکنار تو جواں بر خیزم" ہوتا ہے محرومیٔ جاوید نہیں ہوتا۔

حسرت کے یہاں غم کا احساس بھی ہے، لیکن یہ وہ غم ہے جس کی آگ میں تپ کر انسان نکھر جاتا ہے اور اس کی سیرت بلند ہو جاتی ہے، اُن کے یہاں جو غم ہے وہ دھیما دھیما اور حیات افروز ہے۔ اسی جذبہ نے اُن کے عشق کے مرتبہ کو بلند کر دیا ہے اور ان کی شاعری میں ابدیت کے جوہر پیدا کر دئے ہیں۔ لیکن حسرت کی عاشقی میں، کوئی منزل ایسی نہیں آتی جب وہ ناامید ہو جائیں۔ یہ پُرامیدی اور مسرت زائی ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ زندگی میں بھی وہ ہر ستم کو تمہید کرم ہی سمجھتے رہے اور کبھی وادیٔ عشق کی رہ نوردی میں تھک کر نہیں بیٹھے ــــ حسرت کی غزل گوئی، مومن کی طرح انسانی اور مجازی رنگ لئے ہوئے ہے۔ لیکن وہ طبیعت کو پستی کی طرف نہیں، بلندی کی طرف لے جاتی ہے بعض جگہ اُن کے یہاں جرأت کی سی معاملہ بندی بھی ملتی ہے لیکن حسرت کی خارجیت نکھری ہوئی ہے اور جب اس میں داخلیت کا میل ہو جاتا ہے تو معاملہ بندی کا اعجاز نظر آنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وقوعہ گوئی پر سستی جذباتیت اور رہ میضانہ جذبہ فروشی کا الزام نہیں لگ سکتا۔ انکا عشق مجازی ضرور ہے لیکن اسکی گیرائیاں عالمگیر ہیں۔ اور کبھی کبھی تو وہ ہمیں حلقۂ شام و سحر سے نکال کر زندگی کے اسرار و رموز کی دنیا میں لیجاتا ہے۔

حسرت نے اسلوب کی نفاست پر بھی زور دیا ہے انھوں نے جو محاسن سخن گنائے ہیں وہ تقریباً سب انکے یہاں موجود ہیں "جدت کے، عبارت کے، اشارت کے" جو "مزائد" ان کے کلام میں ہیں وہ انکے دل پُر خون کے پیدا کردہ ہیں۔ اور اسی لئے عام دسترس سے باہر ہیں۔ دراصل، غزل نوائے سرمدی اسی وقت بن سکتی ہے جب شاعر کی زندگی اور غزل گوئی میں لطیف ہم آہنگی ہو۔ حسرت کی غزل میں جو بے پناہ خلوص، خلاقانہ سادگی، حیات کا اُبھار، اور لب و لہجہ میں تیکھا پن ہے وہ بھی اسی ہم آہنگی کی بدولت ہے۔ ان کا اسلوب، شعر و ادب کی تاریخ کا حادثہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ مصحفی و مومن کے رنگ کی ارتقائی صورت ہے۔ اس طرز میں امیر و داغ کی سوقیت نہیں ہے۔ لیکن اس کا البیلا پن ہے۔ لکھنؤ کی مرصّعیت نہیں، لیکن اس کا حسن ہے۔ اس میں مومن کی سی نازک خیالی نہیں لیکن اسکی نفسیاتی واقعیت ہے۔ غرض شیرینیٔ نسیم ہے۔ سوز و گداز میر

حسرت ترے سخن پہ ہے لطف سخن تمام

کلام حسرت کی توقیت

(اڈیٹر)

حسرت کا معمول تھا کہ جب سو، پچاس غزلیں ہو جاتی تھیں تو وہ انھیں یکجا ایک مختصر سے دیوان کی صورت میں شایع کر دیا کرتے تھے ۔ ایسے دیوانوں کی تعداد تیرہ تک پہونچتی ہے لیکن تیرہ کا عدد بہت نامُبارک ثابت ہوا، کیونکہ اس آخری حصہ اشاعت کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا

سب سے پہلے دوران قیام حیدر آباد (سنہ ۴۲ء) میں انھیں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان تمام دواوین کو ایک ساتھ شایع کر دینا مناسب ہوگا چنانچہ اپنے بارہ دیوانوں کا مجموعہ جس میں دو ضمیمے بھی شامل ہیں کلیات حسرت کے نام سے سنہ ۴۳ء میں انھوں نے شایع کر دیا جس میں سنہ ۱۸۹۳ء سے لیکر سنہ ۱۹۴۲ء تک کی تمام غزلیں درج ہیں

اس کے بعد سنہ ۵۰ء میں انھوں نے ایک اور حصہ (تیرھواں) شایع کیا جس میں سنہ ۴۳ء سے سنہ ۵۰ء تک کی ۶۶ غزلیں درج ہیں

اس طرح حسرت کی تمام شایع شدہ غزلوں کی تعداد ۷۰۰ تک پہونچتی ہے، جن کی سنہ وار تقسیم حسب ذیل ہے :-

۱ - ضمیمۂ (الف) :- سنہ ۱۸۹۳ء سے سنہ ۱۹۰۳ء تک کی ابتدائی غزلوں پر مشتمل ہے جو موہان، فتحپور اور علیگڈھ میں بزمانۂ طالب علمی لکھی گئیں۔ یہ غزلیں بارہ سال سے اکیس سال عمر تک کی ہیں اور ان کی تعداد ۲۲ ہے

۲ - پہلا حصہ :- اس حصہ میں سنہ ۱۹۰۳ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک کی غزلیں درج ہیں جن میں بڑا حصہ اُن غزلوں کا ہے جو بزمانۂ قید سنہ ۱۹۰۸ء سے سنہ ۱۹۰۹ء تک علیگڈھ ڈسٹرکٹ جیل اور نینی سنٹرل جیل میں لکھی گئیں۔ یہ غزلیں ۲۲ سے ۳۰ سال عمر تک کی ہیں اور انکی تعداد ۱۱۰ ہے

۳ - دوسرا حصہ :- سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۱۶ء تک کی غزلوں پر مشتمل ہے جب حسرت قید سے رہا ہو چکے تھے۔ یہ غزلیں ۳۱ سے ۳۴ سال عمر تک کی ہیں اور ان کی تعداد ۹۴ ہے

۴ - تیسرا حصہ :- اکتوبر سنہ ۱۶ء سے جولائی سنہ ۱۸ء کے زمانۂ آزادی کی غزلوں کا مجموعہ ہے، جبکہ حسرت کی عمر ۳۵ سال کی تھی۔ ان غزلوں کی تعداد ۵۵ ہے

۵ - چوتھا حصہ :- اگست سنہ ۱۸ء سے اپریل سنہ ۲۰ء تک کی غزلوں پر مشتمل ہے جب حسرت دوبارہ قید و بند کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ غزلیں زیادہ تر فیض آباد جیل میں لکھی گئیں۔ ان کی تعداد ۷۵ ہے، یہ غزلیں ۳۶ - ۳۷ سال عمر کی ہیں

۶ - پانچواں حصہ :- اپریل سنہ ۲۰ء سے اپریل سنہ ۲۲ء تک کی غزلوں پر مشتمل ہے جو بہ حالت نظر بندی لکھنؤ اور موہان میں لکھی گئیں۔ یہ ۳۸ سے ۴۰ سال عمر تک کا سرمایہ ہے۔ ان غزلوں کی تعداد ۲۸ ہے

۷ - چھٹا حصہ :- نومبر سنہ ۲۲ء سے وسط ستمبر سنہ ۲۳ء کی غزلوں کا مجموعہ ہے اور یہ اس زمانہ میں لکھی گئیں جب حسرت کو تیسری مرتبہ یرودا سنٹرل جیل میں قید و بند کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ حسرت کی عمر اسوقت ۴۱ - ۴۲ سال کی ہوگی۔ ان غزلوں کی تعداد ۴۶ ہے۔

۸ - ساتواں حصہ :- ۲۲ ستمبر سنہ ۲۳ء سے ۳۰ ستمبر سنہ ۲۳ء یعنی صرف ۸ دن کے اندر یرودا سنٹرل جیل میں لکھی گئیں۔ ان کی تعداد ۲۳ ہے

۹ - آٹھواں حصہ :- یکم اکتوبر سنہ ۲۳ء سے ۹ نومبر سنہ ۲۳ء تک کا مجموعہ ہے یہ بھی یرودا سنٹرل جیل ہی کے اندر لکھی گئیں۔ ان کی تعداد ۴۲ ہے۔ حسرت کی عمر اس وقت ۴۳ کے لگ بھگ ہوگی

۱۰ - نواں حصہ :- نومبر اور دسمبر سنہ ۲۳ء تک کی غزلیں ہیں اور یرودا سنٹرل جیل ہی میں لکھی گئیں

۱۱ - دسواں حصہ :- جنوری سنہ ۲۴ء سے مارچ سنہ ۲۴ء تک کی غزلوں پر مشتمل ہے جبکہ حسرت کی عمر تقریباً ۴۴ ہو گی۔ یہ غزلیں بھی یرودا سنٹرل جیل ہی میں لکھی گئیں۔ ان کی تعداد ۲۲ ہے

۱۲ - گیارھواں حصہ :- جنوری سنہ ۲۵ء سے سنہ ۳۴ء تک کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ ان کی تعداد ۲۳ ہے اور زمانہ ۴۶ سے ۵۴ سال عمر تک کی یادگار ہیں

۱۳ - بارھواں حصہ :- جنوری سنہ ۳۵ء سے سنہ ۱۹۴۰ء (یعنی حسرت کی ۵۵ سے لیکر ۶۰ سال عمر) تک کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی تعداد ۵۳ ہے

۱۴ - ضمیمہ (ب) :- اس میں سنہ ۴۱ء، سنہ ۴۲ء کی غزلیں ہیں جبکہ حسرت کی عمر ۶۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی، ان غزلوں کی تعداد ۲۲ ہے

۱۵ - تیرھواں حصہ :- (جو کلیات سے علٰحدہ شایع ہوا ہے)۔ اس میں سنہ ۴۳ء سے سنہ ۱۹۵۰ء یعنی ۶۳ سے ۷۰ سال عمر تک کی غزلیں پائی جاتی ہیں۔ ان کی تعداد ۶۶ ہے

حسرت کی تمام غزلوں کی تعداد ۷۷۰ ہوتی ہے، جن میں ۳۸۴ غزلیں یعنی تقریباً نصف قید یا نظربندی کی حالت میں لکھی گئی تھیں

حسرت کی پہلی اور آخری غزل

«ضمیمہ الف» کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی ابتدائی غزلوں میں جو سنہ ۹۲ء اور سنہ ۱۹۰۳ء کے درمیان لکھی گئی تھیں، ۶۱ غزلیں وہ ہیں جو سنہ ۹۲ء و سنہ ۹۸ء کے درمیان فتحپور کے دوران قیام میں لکھیں اور ۲۲ (مابین سنہ ۹۹ء و سنہ ۱۹۰۳ء) علیگڑھ کے زمانۂ قیام میں۔ لیکن دو غزلیں ہم کو اس سے پہلے کی بھی ملتی ہیں۔ ایک سنہ ۹۵ء کی جو بمقام لکھنؤ انھوں نے لکھی اور دوسری سنہ ۹۳ء کی جو انھوں نے اپنے وطن موہان میں تحریر کی اور کلیات کی مندرجہ ذیل غزلوں میں سب سے پہلی غزل ان کی یہی ہے جو انھوں نے اپنی عمر کے بارھویں یا تیرھویں سال میں لکھی تھی۔

میں تو سمجھا تھا قیامت آگئی　　خیر ہم صاحب سلامت ہو گئی
مسجدوں میں کون جائے واعظا　　اب تو اک بت سے ارادت ہو گئی
جب میں جاؤں دل میں بھی آؤ نہ یاد　　گرچہ ظاہر میں عداوت ہو گئی
ان کو کب معلوم تھا طرز جفا　　غیر کی صحبت قیامت ہو گئی
عشق نے اس کو سکھا دی شاعری　　اب تو اچھی فکر حسرت ہو گئی

دیوان کا تیرھواں حصہ ان کے کلام کا بالکل آخری مجموعہ ہے اور اس میں ان کی آخری غزل وہ ہے جو انھوں نے ۲۰ نومبر سنہ ۵۰ء کو لکھی تھی:

شوق کو دادِ حیا ملتی نہیں　　وہ نگاہ آشنا ملتی نہیں
بوئے کوئے یار سے باوصف زعم　　نکہت باد صبا ملتی نہیں
شیوۂ اہلِ ریا سے زینہار　　خوئے ارباب صفا ملتی نہیں
دیدنی ہے یہ مروت حسن کی　　جرم الفت کی سزا ملتی نہیں
ان سے ملنے کی ہوس میں شوق کو　　ڈھونڈھتا ہے اور دعا ملتی نہیں
عاشقی سے خوئے نازِ حسنِ دوست　　بر سبیلِ اعتنا ملتی نہیں

یہ بھی حسرت کیا ستم ہے، عشق سے
حسن کو دادِ جفا ملتی نہیں

حسرت کی خصوصیات شاعری

(اڈیٹر)

شعر در اصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں

حسرت کی یہ خصوصیت کہ انھوں نے غزل کے سوا کسی اور صنف سخن کی طرف مطلق توجہ نہیں کی، بہت کم کسی دوسرے شاعر میں پائی جاتی ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ حسرت اپنی فطرت کے لحاظ سے بڑے یک رنگ واقع ہوئے تھے اور چونکہ بہ سلسلۂ شعر و سخن غزل سے ان کو زیادہ مناسبت تھی اس لئے وہ اسی کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی فطرت کی جھلک ہم کو ان کی سیاسی زندگی میں بھی ملتی ہے۔

حسرت نے غزل گوئی میں جو شہرت حاصل کی وہ نتیجہ مشق و مزاولت کا نہ تھا بلکہ صرف جذبات کے اقتضاء کا۔ چنانچہ اسی لئے ان کی بہترین غزلیں اس وقت کی ہیں جب ان کے جذبات جوان تھے، اور اخیر عمر کی غزلیں حالانکہ انتہائے مشق سخن کے زمانہ میں لکھی گئی تھیں، اکثر بے آب و رنگ ہیں۔ مثلاً ان کی سب سے پہلی غزل لیجئے جو ۹۳ء میں (جبکہ ان کی عمر تیرہ چودہ سال کی تھی) لکھی گئی:-

میں تو سمجھا تھا قیامت ہو گئی　　خیر پھر صاحب سلامت ہو گئی
مسجدوں میں کون جائے واعظا　　اب تو اک بت سے ارادت ہو گئی
جب میں جانوں دل میں بھی آؤں یاد　　گرچہ ظاہر میں عداوت ہو گئی
ان کو کب معلوم تھی طرز جفا　　غیر کی صحبت قیامت ہو گئی
عشق نے ان کو سکھا دی شاعری　　اب تو اچھی مشق حسرت ہو گئی

اس غزل کے ہر ہر شعر سے ان کی انفرادی فطرت کا پتہ چلتا ہے کیونکہ اس غزل میں سوا اس کے کہ کوئی شعر وزن سے خارج نہیں ہے اور زبان بہت سہل و سادہ ہے، دوسری کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ عشق، جفا، عداوت وغیرہ کا ذکر محض روایتی و رسمی طور پر کیا گیا ہے اور کہنے والے کو ان کا صحیح احساس و ادراک نہیں ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حسرت کی شاعری کی بنیاد تو پڑ گئی تھی لیکن اس بنیاد پر عمارت کیسی طیار ہونا تھی، اس کا علم غالباً خود ان کو بھی نہ تھا۔ اس کا حال اس وقت کھلا جب چند سال تک اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے اپنے عنفوان شباب کے جذبات اس طرح پیش کئے:-

مجھ کو خواہش نے بال ہما کیا　　نہیں میں ان کے کوچہ کا گدا کیا
جو آتا ہے تو آئینے سے نکلا مت　　یہ عرض جلوۂ حیرت فزا کیا
دل وقف الم ہاں پھر تو کہنا　　وہ رنج ہجر کا ہے ماجرا کیا
نہ ہو مجھ سا کوئی محو تمنا　　ہوا کرتی ہیں باتیں دل سے کیا کیا

اس غزل نے یہ بات صاف کر دی کہ ان کا ذوق انھیں مومن و مصحفی کی طرف کھینچے لئے جا رہا تھا اور آخر کار انھیں کے رنگ تغزل کو انھوں نے اپنے لئے پسند کر لیا۔ لیکن باوجود اس کے کہ اس غزل میں جلوۂ حیرت فزا، خواہش بال ہما، دل وقف الم، مومن کی سی ترکیبیں موجود ہیں اور چھ شعر میں

مصحفیؔ کا سا اندازِ بیان بھی پایا جاتا ہے، لیکن سوز و گداز سے ملی ہوئی عشق و محبت کی وہ کیفیت جو رچے ہوئے رنگِ تغزل کے لئے ضروری ہے اس میں آپ کو نہ ملے گی، بیان میں جوش ہے، لب و لہجہ میں ولولہ ہے، محبوب سے بات کرنے کا ایک خاص تیور ہے، لیکن محبت کی کسک، نیاز عشق کی سپردگی، یا راز و نیاز کی وہ باتیں جو دل کے زخمی ہوجانے کے بعد کی جاتی ہیں، اس غزل میں نہیں پائی جاتیں

یہ غزل حسرتؔ نے سنہ ۹۹ء میں لکھی تھی، جب ان کی عمر ۱۸ - ۱۹ سال کی تھی اور ان کی تعلیم کالج کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ اس غزل سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک وہ جذبات محبت سے آشنا ہوچکے تھے، لیکن کوئی ایسا چرکا نہ کھایا تھا جو انسان کو خون رونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ شاید یہ سعادت انھیں کبھی نصیب نہیں ہوئی اور اسی لئے ان کی یہ تمنا کہ "میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں" کبھی پوری نہ ہوسکی۔ تاہم ان کی شاعری معاملاتِ حسن و عشق اور جذبات دونوں حیثیتوں سے ترقی کرتی رہی، یہاں تک کہ تین چار سال کے اندر ہی ان کے تغزل میں ایک خاص ٹھہراؤ پیدا ہوگیا اور کچھ ایسی باتیں بھی ان کے قلم سے نکلنے لگیں جو ہرچند "پختہ مغزانِ جنوں" کی دنیا سے تو تعلق نہ رکھتی تھیں۔ لیکن "شیوۂ کار آگہی" ضرور ان سے ظاہر ہوتا تھا

مثلاً:-

حُسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا　　کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں　　ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہ سکوں　　دردِ دل اس نے تو حسرتؔ اور دونا کر دیا

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیِ جسم نازنیں　　اور بھی شوخ ہوگیا رنگ ترے لباس کا

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا　　طرفہ عالم ہے ترے حُسن کی بیداری کا

نہاں شانِ تغافل میں ہے رمزِ امتیاز اس کا　　بہ اندازِ جفا ہے التفاتِ دلنواز اس کا

غلط ہے شکوہ سنجی میرے عشقِ ناشکیبا کی　　بجا کرتا ہے جو کرتا ہے حسنِ بے نیاز اس کا

چھڑایا دم زدن میں دل کو فکرِ شادی و غم سے　　قیامت پُر اثر تھا جلوۂ حیرت نواز اس کا

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرتؔ کا　　وہ وضعِ پارسا اس کی وہ عشقِ پاکباز اس کا

ان اشعار سے آپ کو معلوم ہوسکتا ہے کہ حسرتؔ کے تغزل میں عمر کے پچیسویں سال تک کافی پختگی پیدا ہوگئی تھی، لیکن پختگی سے زیادہ اہم چیز اندازِ بیان کی شگفتگی و شیرینی تھی۔ ہرچند حسرتؔ کا یہ رنگ زندانِ فرنگ میں جانے سے پہلے ہی اپنا ایک خاص اسلوب قائم کرچکا تھا، لیکن اس کو پختگی حاصل ہوئی سنہ ۰۸ء اور سنہ ۰۹ء میں جب وہ قید و بند کے مصائب جھیل رہے تھے اور یہ رنگ ان کا کم و بیش ۸ - ۱۰ سال تک قائم رہا۔ اس کے بعد اس میں انحطاط شروع ہوا۔ چنانچہ سنہ ۲۳ء کی وہ غزلیں جو انھوں نے یرودا جیل میں لکھیں، ان کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک تھکے ہوئے دماغ کا نتیجہ ہیں، ایک ایسے دل کی صدائیں ہیں جس کا زخم بھر چکا ہے

ہوسکتا ہے کہ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ سیاسی زندگی نے ان کو عشق و محبت کی دنیا سے بڑی حد تک جدا کر دیا تھا، لیکن گمان غالب یہی ہے کہ شباب کے انحطاط کے ساتھ ساتھ ان کا وہ ولولۂ بے اختیار بھی ختم ہوگیا تھا جو ماضی کی یاد کے ساتھ ساتھ مستقبل کو بھی کچھ عرصہ تک کے لئے پُرکیف و رنگین بنائے رکھتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۳۵ء اور سنہ ۴۰ء کے درمیان کی لکھی ہوئی غزلیں ہم کو ان کے ابتدائی غزلوں سے بہت ہلکی نظر آتی ہیں اور سنہ ۴۳ء سے سنہ ۵۰ء تک کی غزلیں تو قافیہ پیمائی سے زیادہ کچھ نہیں ہیں

الغرض حسرتؔ کی شاعری یکسر جذبات کی شاعری ہے، جو عمر کے مختلف حصوں کے ساتھ ساتھ اُبھری، ٹھہری اور ختم ہوگئی، لیکن بایں ہمہ حسرتؔ کا ایک نہایت خوشگو شاعر ہونا اپنی جگہ مسلم ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ جو درجۂ شہرت و قبول انھیں حاصل ہوا وہ ان کے ہمعصر شعراء میں سے شاید ہی کسی نصیب ہوا ہو۔ جس کے متعدد اسباب تھے

(حسرتؔ کے ہمعصر شعراء میں متعدد قابلِ ذکر لوگوں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں، اور ان میں اکثر لکھنؤ کے تھے۔ گو دہلی میں سائلؔ و بیخودؔ موجود تھے لیکن ان کا ذکر ہم اس لئے نہیں کرتے کہ ان کی روایتی شاعری یکسر انحطاطی دور کی چیز تھی اور دہلی اسکول کی کوئی خصوصیت ان کے کلام میں نہ پائی جاتی تھی۔

لکھنؤ کے شعراء نے البتہ قدیم روایات سے ہٹ کر دہلی کی جذباتی شاعری کو سنبھال لیا تھا اور ناسخ کا قائم کیا ہوا طلسم ایہام ختم ہو چکا تھا۔

حسرت کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب عہد متاخرین کے دور دوم کے شعراء میں امیر و داغ، شاد، جلال، وحشت اور سالک و تسلیم زندہ تھے اور دورِ حاضر میں جلیل، آرزو، صفی، عزیز، یاس، اثر، اصغر و فانی کی شاعری عروج پر تھی۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ حسرت نے ان میں سے کسی ایک کی بھی تقلید نہیں کی اور اپنی غزل گوئی کے لئے ایک ایسی راہ نکالی جو نئی تو یقیناً نہ تھی لیکن شاید نئی سے بہتر تھی۔ خود حسرت نے اس کی صراحت یوں کی ہے:۔

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود
مجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

مجھے اس سے اختلاف ہے کیونکہ حسرت کی شاعری میں رنگِ دہلی کی نمود تو ضرور ہے۔ لیکن زبان لکھنؤ سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ ممکن ہے حسرت نے یہ اس لئے لکھ دیا ہو کہ وہ تسلیم کے شاگرد تھے اور تسلیم لکھنؤ کے رہنے والے تھے، لیکن جس حد تک خالص زبان اور لب و لہجہ کا تعلق ہے، حسرت کا کلام، لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، جس کی تصدیق خود ان کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے:۔

حسرت مجھے پسند نہیں طرزِ لکھنؤ
پیرو ہوں شاعری میں جنابِ نسیم کا

اس کے علاوہ اور متعدد اشعار سے ان کے دلی رجحان کا پتہ چلتا ہے:۔

پیروِ تسلیم ہوں۔ شیدائے اندازِ نسیم
شوق ہے حسرت مجھے اشعارِ حسرت خیز کا

شعر سے تیرے ہوئی مصحفی و میر کے بعد
تازہ حسرت، اثر و حسن و بیاں کی رونق

شیرینیِ نسیم ہے سوز و گدازِ میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

طرزِ مومن میں مرحبا حسرت
تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں،

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

قائم ہے ترے دم سے طرزِ سخن قائم
ہر ورنہ کہاں حسرت یہ رنگِ غزلخوانی

آپ نے دیکھا کہ حسرت نے کسی ایک جگہ بھی کسی لکھنوی شاعر کا نام نہیں لیا اور دہلوی اسکول کے شاعروں میں بھی انھوں نے صرف قائم، میر، مصحفی، غالب، مومن، و نسیم کا ذکر کیا ہے۔ ذوق و سودا اور ان کے متبعین سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ گو ان کے استاد ہونے سے انھیں انکار نہ تھا

متاخرین شعراء لکھنؤ میں وہ آتش و جلال کی شاعری کے بھی قائل تھے لیکن ان سے متاثر ہو کر انھوں نے تغزل میں ان کی تقلید نہیں کی

اپنے عہد کے شعراء میں انھوں نے شاد، وحشت، صفی، عزیز، محشر، جگر، اصغر، فانی، نظم طباطبائی سبھی کا ذکر نہایت اچھے الفاظ میں کیا ہے لیکن خود ان کا رنگ شاعری ان سب سے الگ تھا، میں اس جگہ ان تمام شعراء سے حسرت کا مقابلہ یا موازنہ کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ حسرت کی شاعرانہ انفرادیت کا تعلق جس چیز سے ہے وہ خود اس فرق و امتیاز کو متعین کر دیتی ہے جو حسرت اور ان تمام شاعروں کے کلام میں پایا جاتا تھا

لیکن قبل اس کے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی کے متعلق خود حسرت کی رائے ظاہر کر دیں

انھوں نے سب سے پہلے تین بڑی قسمیں کی ہیں ایک وہ جس کا تعلق صرف آمد سے ہے، دوسری وہ جس میں صرف آورد ہی آورد پائی جاتی ہے اور تیسری وہ جس میں آورد و آمد دونوں پائی جائیں

آمد کی بھی انھوں نے تین قسمیں کی ہیں:۔ عاشقانہ، عارفانہ، فاسقانہ۔ اسی طرح آورد کی تین قسمیں بتائی ہیں: ماہرانہ، ناقدانہ، ضاحکانہ اور آورد و آمد ملی ہوئی شاعری کی تین قسمیں شاعرانہ، واصفانہ، باغیانہ ظاہر کی ہیں

اس تقسیم کے بعد وہ اس کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں[1]:۔

"جو کلام خالص جذبات حسن و عشق کا حامل ہو اور اپنی خوبی کے لئے کسی محسوس صنعت گری کا محتاج نہ ہو وہ عاشقانہ کہلائے گا۔

---

[1] حسرت موہانی کا ایک غیر مطبوعہ مقالہ جو عبدالشکور صاحب نے اپنی کتاب حسرت موہانی میں درج کیا ہے۔

جس کلام میں عشق مجازی سے برتر عشق سے عشق مطلق اور حسن سے حسن مطلق مراد ہو وہ عارفانہ ہوگا، اس کے برخلاف جن غزلوں میں مجازی عشق سے کمتر درجہ کے جذبات ہوس کی مصوری موجود ہو وہ فاسقانہ کہلائے گا

"مثلاً عاشقانہ شاعری کی مثالیں زیادہ تر میر، مصحفی، قائم، غالب، شیفتہ، حالی، جلال لکھنوی اور شاد عظیم آبادی کی غزلوں میں ملیں گی اور عارفانہ شاعری کے نمونے درد دہلوی، نیاز بریلوی، آسی سکندر پوری کی غزلوں میں دستیاب ہوں گے اور فاسقانہ سخن سنجی کی تصویریں زیادہ جرأت کے ہاں، کمتر مصحفی و انشا و متاخرین میں اور کسی قدر مظفر خیرآبادی اور گستاخ رامپوری کے ہاں موجود ہیں

فاسقانہ شاعری کو بد مزاقی پر محمول کرنا یا سوقیانہ و مبتذل قرار دینا انصاف کا خون کرنا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ جب شاعری کا مقصد صحیح جذبات کی مصوری مسلّم ہے تو پھر اس کے دایرہ کو صرف پاک جذبۂ عشق و محبت تک محدود کر دینے اور عامۂ خلایق کے ۹۹ فی صدی جذبات ہوس کو اس سے خارج کر دینے کی کوشش انتہائی بد مذاقی و بے شعوری ہے۔ البتہ اس ضمن میں اعتدال سے گر جانا جیسا کہ رنگین کی بعض ریختیوں اور رجان صاحب و صاحبقراں کے تبذل اشعار میں پایا جاتا ہے بیشک قابل اعتراض ہے مگر ایسے کلام کو فاسقانہ کے بجائے فاحشانہ کہنا زیادہ مناسب ہے

اب اگر عاشقانہ شاعری کی خوبی بسیط ہونے کے بجائے مرکب ہو یعنی صنعت گری کی بھی شرمندۂ احسان ہو اور یکسر بیگانۂ تاثیر بھی نہ ہو تو اسے عاشقانہ کے بجائے شاعرانہ کہنا چاہئے۔ دور حاضر کے متغزلین کی اکثر غزلیں اس رنگ سخن کی حامل ہیں

اس کے بعد بھی شاعرانہ طرز سخن اگر خوبی اثر سے بالکل محروم ہو تو اسے شاعرانہ کے بجائے ماہرانہ یا استادانہ کہنا چاہئے مثلاً امیر مینائی، منیر شکوہ آبادی سے لیکر بزم اکبر آبادی۔ ثاقب لکھنوی و ضامن کنتوری تک کی غزلیں نہ عاشقانہ ہیں نہ شاعرانہ بلکہ ماہرانہ ہیں، پھر اگر یہ ماہرانہ شاعری پختگی و مشاقی کے جوہر سے بھی خالی ہو اور بقول مصحفی موزونی طبع کا نتیجہ ہو تو اسے فاتحانہ کہیں گے

عاشقانہ شاعری کے مانند عارفانہ شاعری بھی ہے۔ اگر اس میں عشق و حسن مطلق کی جگہ رسمی حمد یا اصطلاحی تصوف کا جلوہ نظر آتا ہو تو اسے عارفانہ کے بجائے ناقدانہ کہنا چاہئے یا اگر روحانی محرکات عشق سے کمتر درجہ پر جذبات خلوص و عقیدت کے تحت نعت یا منقبت یا سوز و سلام کی صورت میں ظاہر ہوئے ہوں تو ایسی شاعری کو واصفانہ شاعری کہنا چاہئے مثلاً غلام احمد شہید، شاہ نیاز بریلوی، محسن کاکوروی، رضوان مرادآبادی، ضیا بدایونی، حمید لکھنوی یا انیس و متعلقین انیس، تعشق و رشید وغیرہ کا کلام کہیں اگر اس قسم کا کلام محض صنعت گری ہو اور تاثیر سے محروم۔ یا محض حصول ثواب و نجات کی غرض سے وجود میں آیا ہو مثلاً امیر مینائی یا مضطر خیرآبادی کا نعتیہ دیوان یا مرزا دبیر کا تمام دفتر منظومات، تو اس کو واصفانہ کے بجائے ماہرانہ کہنا ہوگا یا ناقدانہ اور یہ دونوں قسمیں آورد کے تحت آتی ہیں

علیٰ ہذا القیاس فاسقانہ شاعری میں اگر خالص جذبات ہوس کی مصوری کے بجائے سماج یا مذہب و حکومت کے استخفاف یا انکار کا پہلو نمایاں ہو تو اسے باغیانہ کہنا چاہئے

اب صرف ایک قسم سخن اور رہ گئی یعنی ضاحکانہ جس میں محض ظرافت ہوتی ہے مثلاً ظریف لکھنوی یا احمق پھپھوندوی کا کلام یا ظرافت کے ساتھ طنز و قدامت پرستی کا پہلو نکلتا ہے مثلاً اکبر الہ آبادی اور ظفر علی خاں کا کلام

ہزل یا ہجو کا شمار بھی اسی قسم سخن میں ہوتا ہے لیکن اگر یہ چیزیں حد اعتدال سے گزر کر پھکڑپن یا فحش گوئی کے درجہ تک پہونچ جائیں تو اسے ضاحکانہ کے بجائے سوقیانہ کہیں گے۔ ناسخ کا کلام ماہرانہ ہے کیونکہ ان کے یہاں آورد ہی آورد اور جگر کا کلام بالعموم شاعرانہ ہوتا ہے کیونکہ ان کے ہاں اکثر آمد پائی جاتی ہے

حسرت کی اس تقسیم کو سامنے رکھ کر اگر ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو اسے زیادہ تر ہم عاشقانہ و شاعرانہ پائیں گے اور کہیں کہیں فاسقانہ ۔یعنی انکا کلام خالص جذبات حسن و عشق کا حامل ہے جس میں صنعتگری کو بہت کم یا بالکل دخل نہیں۔ لیکن صرف اتنا کہکر ہم حسرت اور ان کے ہمعصر دوسرے خوشگو شعرا کے

---

[1] حسرت نے ایک جگہ ناسخ و آتش کے فرق کو اس طرح ظاہر کیا ہے:۔

حسرت اک ریگ رواں ایک ہے دریائے رواں — فرق یہ ناسخ و آتش کی ہے استادی میں

کلام میں جو چیز "قدرِ مشترک" ہے وہ تو بتا دیتے ہیں لیکن "حد فارق" کا پتہ نہیں چلتا، حالانکہ حسرت کی شاعری نمایاں طور پر ان سب سے علیحدہ ہے۔ اس کے لئے ہم کو صرف یہی دیکھنا ہوگا کہ حسرت اپنی جذبات نگاری میں کس حد تک صداقت و واقعیت کے پابند ہیں بلکہ یہ بھی کہ انھوں نے ان جذبات کے اظہار کے لئے اسلوب اختیار کیا

حسن و عشق کے جذبات بہت محدود ہیں، اور عالم محبت کی کوئی کیفیت ایسی نہیں ہے جو جانی بوجھی نہ ہو۔ جو شعراء اس منزل سے گزر چکے ہیں وہ تو خیر جانتے ہی ہیں لیکن جن کو خود اس کا تجربہ نہیں ہے وہ بھی دوسروں سے اتنا کچھ سن چکے ہیں کہ وہ بلا تامل اسے اپنی بیتی کے رنگ میں پیش کر دیتے ہیں، تاہم دونوں کے بیانات میں ضرور ایسا فرق موجود ہوتا ہے جس سے "حال و قال" کی تمیز بہ آسانی ہو سکتی ہے اور یہ فرق پیدا ہوتا ہے صرف انداز بیان اور لب و لہجہ سے جو بالکل وجدانی چیز ہے اور فن و اکتساب سے اسے کوئی واسطہ نہیں

ایک شاعر کا زبانداں ہونا، محاورات پر عبور، عروض میں مہارت یہ تمام باتیں سیکھنے سے آسکتی ہیں، لیکن انداز بیان و لب و لہجہ بالکل فطری چیز ہے جو بڑی حد تک قصد و ارادہ یا کسب و کوشش کے حدود سے باہر ہے

مشہور ہے کہ جو بات "دل سے کہی جاتی ہے وہی دل پر اثر کرتی ہے" لیکن عمومیت کے ساتھ یہ نظریہ قابل تسلیم نہیں، کیونکہ ہر ایسا شاعر جو واقعی محبت کی دردمندیوں سے آگاہ ہے، اپنے قلبی تاثرات کا موثر طریقہ سے ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوتا یا یہ کہ کبھی وہ اس کے اظہار میں کامیاب ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں۔ اسی طرح تاثرات قلبی سے ہٹ کر آرٹ اور تکلف کی شاعری کو دیکھئے تو یہاں بھی آپ کو یہی فرق نظر آئے گا اور انداز بیان اور لب و لہجہ کی اہمیت تسلیم کرنا پڑے گی۔

تغزل میں میر کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ وہ نہ صرف تاثرات قلبی کا اظہار کرتے تھے بلکہ اس اظہار کے لئے ان کا لب و لہجہ بھی مخصوص تھا۔ میر کے علاوہ اکثر شعراء دہلی کی شاعری جذبات و تاثرات عشق ہی سے تعلق رکھتی تھی اور ان کے لب و لہجہ میں بھی صداقت پائی جاتی تھی، لیکن بقول ذوق میر کا سا انداز کسی کو نصیب نہ ہوا۔ میر کے رنگ میں مصحفی، درد، حاتم، قایم، سوز، افسوس، حسن، اور متاخرین میں آزردہ، مجروح، شیفتہ، حالی وغیرہ متعدد شعراء نے شاعری کی اور جذبات محبت کی فتادگی اور سپردگی کا اظہار ان سب نے مختلف طریقوں سے کیا، لیکن میر کے سیکڑوں نشتروں میں سے کسی ایک نشتر کا بھی جواب پیش نہ کر سکے

اسی طرح غیر جذباتی یا فنی شاعری میں بھی لب و لہجہ اور طرز ادا کو بڑا دخل ہے۔ مثلاً ناسخ آرٹ کی شاعری کا بادشاہ ہے اور وہ اپنے اس رنگ کے اشعار کی وجہ سے کافی بدنام ہے:۔

آج ہوتا ہے دلا درد جو میٹھا میٹھا — دھیان آتا ہے تجھے کس کے لب شیریں کا
کیا پڑ گیا ہے عکس تری چشم مست کا — نرگس کی شاخ بن گئی ہر موج آب میں

لیکن جب اس کا لب و لہجہ بدلتا ہے تو کبھی کبھی وہ ایسے شعر بھی کہہ جاتا ہے:۔

اُڑا کے ساتھ یہ مشت غبار لیتا جا — مجھے رکاب میں او شہسوار لیتا جا
ہم ضعیفوں کو کہاں آمد و شد کی طاقت — آنکھ کی بند ہوا کوچۂ جاناں پیدا
گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج — ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں
مانع صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں — دل دُکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا

آتش نے بھی ناسخ کے جواب میں کم ہرزہ سرائی نہیں کی، ملاحظہ ہو:۔

بوسہ بازی سے مری ہوتی ہے ایذا ان کو — منھ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں چھالے پیدا
بیتاب دل کو تسکیں ہوتی ہے دید خط سے — وہ بوٹی ہے یہ جس سے پارے کو مارتے ہیں

لیکن اس رنگ سے ہٹ کر اس نے ایسے شعر بھی کہے ہیں:۔

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا
پتلوں سے خاک کے یہ گڑھے بھر سکیں کہیں — ڈھا بیٹھے زمیں کے نشیب و فراز کا

اسی طرح لکھنوی شعراء میں وزیر، برق، رشک، صبا، رند، خلیل وغیرہ اپنی بے کیف شاعری کی وجہ سے بدنام ہیں، کہیں کہیں ان کے کلام میں ہم کو ایسے اشعار بھی نظر آجاتے ہیں :-

برق :- قیس کا نام نہ لو ذکرِ جنوں جانے دو — دیکھ لینا مجھے تم موسمِ گل آنے دو
صبا :- دل میں اک درد اُٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا
رند :- آعندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اس لحاظ سے لکھنؤ میں جلال خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ زبان اور لب و لہجہ کی شاعری کا بادشاہ تھا :-

نہ خوف آہ بتوں کا نہ ڈر ہے نالوں کا — بڑا کلیجہ ہے ان دل دکھانے والوں کا
دل سے تنگ آئے ہیں ہم جوشِ جنوں کا کیسا — یوں گریباں نہیں کیا پھاڑتے سودا کیسا
میں شوقِ دید میں کیا جانے کتنی دور آیا — کھلی کچھ آنکھیں مری جب قریبِ طور آیا
ہوش میں ذرا آؤ تم تو بھلا کیا ہو جلال — اچھے اچھوں کو وہ دیوانہ بنا دیتے ہیں

الغرض یہ جذباتی شاعری بھی، اندازِ بیان اور لب و لہجہ کی وجہ سے موثر و دلکش بن جاتی ہے۔ چہ جائیکہ داخلی و جذباتی شاعری۔ اور حسرت کی کامیابی کا یہی راز ہے

حسرت کے ہمعصر شعراء میں صفی، عزیز، شاد، اور جلیل کی شاعری بھی جذباتی تھی اور ان کا لب و لہجہ بھی بہت موثر و دلآویز تھا۔ لیکن حسرت کا لب و لہجہ ان سب سے علیحدہ تھا

حسرت نے ایک جگہ ظاہر کیا ہے کہ میری شاعری "ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود"۔ لیکن جیسا میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں، ان کا یہ بیان صحیح نہیں، کیونکہ ان کی زبان نہ ان کی طرزِ ادا اور نہ انکا لب و لہجہ اس سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر وہ واقعی مومن، مصحفی اور نسیم کے پیرو تھے، جیسا کہ انھوں نے بارہا ظاہر کیا ہے تو پھر زبان لکھنؤ میں دہلی کے رنگ کی شاعری کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کیونکہ زبان کا تعلق صرف تذکیر و تانیث یا مخصوص محاورات سے نہیں بلکہ اسلوب بیان سے ہے اور وہ حسرت کے یہاں بالکل دہلوی رنگ کا ہے

حسرت کی شاعری کی دو خصوصیتیں بہت نمایاں ہیں، ایک ان کی دلنشین فارسی تراکیب اور دوسرے زبان کی سلاست، اور اندازِ بیان کی حلاوت اور ان دونوں باتوں میں وہ دہلی کے مقلد ہیں، فارسی تراکیب تو مومن اسکول سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اس سے قطع نظر یوں بھی جو زبان و اندازِ بیان انھوں نے اختیار کیا ہے وہ دہلی کا ہے اور لکھنؤ اسکول سے کوئی تعلق نہیں رکھتا

چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

ملے نہ کسی سے ہو سکا تیرے سوا معاملہ — شبِ عجب لطف کا سامان بہم پہونچا تھا
جانِ امیدوار کا حسرتِ محوِ یاس کا — مقرر ہے نہال یار کی یہ کارفرمائی
ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرم نیاز — فنا ہو جاتے ہم کارِ محبت میں تو بہتر تھا
مخصوص غمِ عشق ہیں ہم لوگ، ہمارا — یوں بسر کئے جاتے لیل و نہارِ انتظار
اچھا نہیں اے گردشِ افلاک ستانا — دل پہ کا ہے کو رہے گا اختیار اب کی برس
مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل — دشوار ہے اہتمامِ تمکیں
ہم نے کس دن ترے کوچہ میں گزارا نہ کیا — ہم پہ کہ ہلاک گفتگو ہیں

ٹھہرا ہے ضبط شوق پہ آکر معاملہ ——— کس عنوان صبر آتا نہیں مجھ ناشکیبا کو
دل سے یاد روزگار عاشقی دیجئے نکال ——— اب ایسے بھی ان کے مبتلا نہیں ہم
آئینِ وفا مدنظر لے کے گئی ہے ——— حال میرا تھا جب بتر تب تو نہ ہوئے تم خبر
دشوار ہے رندوں پر انکار کرم یکسر ——— انکار نہیں ہوتا ارشاد نہیں کرتے
تم تو یہ خوب کار پسندیدہ کر چلے ——— شوق کی بیتابیاں حد سے گزر جانے لگیں
ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے ——— اے ترا غم رہتا ہے مجھے روز کا
کھینچا نہ کبھی اس نے اندوہ بیتابانی ——— عشق میں خود جان سے در گزرے
جس میں آ بیٹھے بارہا ان کی عیادت کو مزے ——— یہی تاثیر محبت یہ گمان لے جائے گا
التماس نگہ شوق پذیرا نہ ہوئی ——— وہ بھی کچھ کام خدمت میں تمہاری آیا

حسرت کے یہاں اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ایسی نظر آتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی زبان بھی دہلی کی تھی انداز بیان بھی دہلی کا تھا اور لکھنوی زبان ولب ولہجہ سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات بھی ان کی شہرت وقبولیت کا باعث ہوئی۔

دہلی اسکول جذبات وزبان دونوں حیثیتوں سے بالکل ختم ہوچکا تھا صرف داغ رہ گئے تھے سو وہ بھی گلزار داغ کے زمانہ کے نہیں اس لئے ان کی شاعری کو زبان ومحاورات کے لحاظ سے دہلی کی ہی ہو لیکن نمایاں اسلوب ولہجہ کی حیثیت سے یقیناً وہ غیر دہلوی تھی۔ لکھنؤ میں امیر ویاس کی فنی شاعری ضرور مقبول تھی لیکن جلال چشتی اور عزیز کے سامنے وہ بھی ماند پڑ چلی تھی۔ اسی زمانہ میں حسرت کی آواز بلند ہوئی اور اس مخصوص زبان ولب ولہجہ میں جو مومن ومصحفی نسیم وقائم کے زمانہ میں پایا جاتا تھا تو لوگ دفعتاً چونک پڑے اور دلی شاعری کے اس دور کی یاد سامنے آگئی جب شاعر خود معصوم رہا ہو یا نہ رہا ہو لیکن اس کا لب ولہجہ یقیناً بہت معصوم تھا

گزر گئیں کی جگہ گزر جانے لگیں۔ بدگماں ہو گا کی جگہ گمان لے گا، تم کو خبر نہ ہوئی کی جگہ تم خبر نہ ہوئے۔ مزے حاصل ہونے کی جگہ مزے آ بیٹھے۔ قبول نہ ہوئی کی جگہ پذیرا نہ ہوئی۔ زمانہ عاشقی کی جگہ روزگار عاشقی۔ یہ زبان غیر لکھنوی تو تھی ہی، حسرت کے زمانہ میں غیر دہلوی بھی تھی یہاں تک کہ شاد عظیم آبادی کے یہاں بھی جن کے آخری دور کی شاعری بڑی ورنہ دلی کی چیز تھی یہ زبان ہم کو نہیں ملتی اور اسی لئے حسرت جب یہ زبان لیکر سامنے آئے تو سب کی نگاہیں ان کی طرف اٹھ گئیں لیکن اس کو متروک کہلیہ دلکش ہونے کی وجہ ان کے لئے نہیں ہوئی کہ زبان ولب ولہجہ کے ساتھ حسرت نے جو جذبات پیش کئے وہ بجائے خود اس نسبت کے تھے کہ حسرت کو مصحفی ومومن کے عہد سے ملحق کر دیا ان کی شاعری پر انتقاد کے کوئی معنی نہ تھے اور اس حیثیت سے حسرت کی زبان بالکل موزوں ومحل تھی

اس وقت تک جو کچھ میں نے لکھا اس کا تعلق زیادہ تر زبان سے تھا اور گو اس سلسلہ میں لب ولہجہ کا بھی ہر جگہ ذکر ضمناً آگیا ہے لیکن اس کی صراحت ووضاحت نہیں کی گئی اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس پر بھی اظہار خیال کیا جائے

جیسا کہ پہلے ظاہر کیا گیا ہے کہ لب ولہجہ کا تعلق بڑی حد تک جذبات سے ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کا لب ولہجہ صحیح جذبات کا ہم آہنگ بھی ہو۔ لب ولہجہ سے مراد بات کرنے کا ڈھنگ ہے اور یہ مختلف ہوا کرتا ہے۔ دو شخص ایک ہی چیز کو دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں لیکن باوجود تاثر کی یکسانیت کے وہ اپنے خیالات کا اظہار مختلف صورتوں سے کرتے ہیں۔ یہی اختلاف لب ولہجہ کا اختلاف ہے اور اسی پر شاعری کا حسن وقبح بڑی حد تک موقوف ہے

لب ولہجہ کی سب سے بڑی خوبی اس کی صداقت ہے، یعنی کسی جذبہ کو خواہ وہ بلند ہو یا پست اس طرح ظاہر کرنا کہ حقیقت سامنے آجائے اور سننے والا ایسا محسوس کرے کہ اس نے گویا اس کے دل کی بات کہدی ہے ایسے لب ولہجہ کا مبالغہ وتصنع سے پاک ہونا ضروری ہے اور حسرت کے لب ولہجہ کی یہ خصوصیت بہت نمایاں ہے

حسرت کی شاعری میں نہ فلسفہ طرازی ہے نہ معنی آفرینی، نہ بلندی خیال ہے نہ جدت بیان۔ وہ آسمان کے تارے توڑ لانے کی فکر نہیں کرتے بلکہ وہی

باتیں کہتے ہیں جو عام طور پر سب کے دل میں گزرتی ہیں لیکن کہتے اس انداز سے ہیں کہ دل میں اتر جاتی ہیں

حسرت کے یہاں ہم کو دو قسم کے اشعار ملتے ہیں، ایک وہ جن میں انھوں نے فارسی ترکیبوں سے کام لیا ہے اور دوسرے وہ جو بالکل روز کی سادہ و سہل زبان میں ہیں، لیکن یہ خوبی کہ ان کے نثر کرنے کی ضرورت نہ ہو دونوں طرح کے اشعار میں پائی جاتی ہے اور اسی کو سہل ممتنع کہتے ہیں

فارسی ترکیبوں کے استعمال سے شعر میں اکثر و بیشتر گرانی و ثقل پیدا ہو جاتا ہے، لیکن حسرت کی فارسی تراکیب اس قدر سبک و شیریں ہوتی ہیں اور انکا وہ صرف اس طرح کرتے ہیں کہ ہمیں ترکیبوں کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ توالی اضافات میں ثقل و ناگواری سے بچنا بہت مشکل ہے، لیکن حسرت اس میں بھی غضب کی سلاست و روانی پیدا کر دیتے ہیں مثلاً :۔

اب آرزوئے شوق کی بیتابیاں کہاں　　　یعنی وہ سب لوازمِ عہدِ شباب تھا
اب میں ہوں اور تغافلِ بسیار کے گلے　　　وہ میں کہ موردِ کرمِ بے حساب تھا
ایک ہی بار ہوئیں وجہِ گرفتاریِ دل　　　التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا
ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرمِ نیاز　　　تجھ کو آخر آشنائے نازِ بیجا کر دیا
ہجومِ بیکسی کو وجہِ لطفِ بیکراں پایا　　　کہ ہم نے آج اس نامہرباں کو مہرباں پایا
سیکھا ہے کہاں سے اے لبِ یار　　　یہ شیوۂ دلکشِ شکر خند
اس عشوۂ نازنیں کے جلوے　　　ہیں دشمنِ عقلِ مصلحت کوش
آپ بیٹھیں تو سہی آکے مرے پاس کبھی　　　کہ میں فرصت میں حدیثِ دلِ دیوانہ کہوں
روشِ حُسنِ مراعات چلی جاتی ہے،　　　ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے
اس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتا　　　سعیِ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے،
درپئے ایذائے جانِ مبتلا ہو جائیے　　　اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے
سکھا دے گی ندامت شیوۂ قدرِ وفا تم کو　　　یہ شانِ کج ادائی میری جانِ ناتواں تک ہے

ان تمام اشعار میں توالی اضافات پائی جاتی ہے، لیکن شعر پڑھتے وقت ہم مطلق محسوس نہیں کرتے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ فارسی ترکیبیں بجائے خود بہت شگفتہ ہیں اور دوسرے یہ کہ مفہوم کی لذت اور لب و لہجہ کی دلکشی ہم کو اس کی طرف متوجہ ہی ہونے نہیں دیتی، فارسی ترکیبوں کا استعمال زیادہ تر اس لئے کیا جاتا ہے کہ بیان میں قوت پیدا ہو جائے اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ وسیع مفہوم ظاہر کر سکیں، لیکن اس کوشش میں جذباتی زبان کا لطف باقی نہیں رہتا اور اظہارِ خیال میں ناگوار تصنع پیدا ہو جاتا ہے۔ حسرت کے یہاں آپ کو کوئی فارسی ترکیب ایسی نہ ملے گی جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ قصداً جوش و قوت پیدا کرنے کے لئے استعمال کی گئی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترکیبیں خود جذبات نے بے اختیارانہ پیدا کی ہیں

میں سمجھتا ہوں کہ حسرت نے صرف ایک غزل ایسی لکھی ہے جس میں بہ لحاظ تراکیب اقبال کی جھلک نظر آتی ہے، لیکن وہ بھی کیفیات سے اس طرح بھر پور ہے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا حسرت نے صرف بیان میں قوت و جوش پیدا کرنے کے لئے ان ترکیبوں سے کام لیا ہے، ملاحظہ ہو :۔

ترا ناز کھول بیٹھا مری سب نیاز مندی　　　بہ غرورِ دلربائی بہ یقینِ دلپسندی،
نہ ہے اختیار دل پر نہ ہے اعتبار دل پر　　　ترے عاشقوں کا دیکھے کوئی رنگِ مستمندی
مجھے شکوۂ جفا کی نہیں آنے پاتی نوبت　　　وہ ستم بھی گر کرے ہے تو بہ لطفِ ہوشمندی
تری بزمِ ناز ظالم ہے عجب طلسمِ حیرت　　　کہ جہاں ہے میرے دل کو سرِ خدمت پسندی
غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں　　　مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

اس غزل کا ایک ایک مصرعہ سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے اور اثر کے اعتبار سے بھی ان اشعار میں وہی تلوار کام کر رہی ہے جو حسرت کے سادہ اشعار میں نظر آتی ہے

لیکن فرق یہ ہے کہ تلوار زیادہ جوہر دار ہے

حسرت کے تغزل میں محبت کی وہ کیفیت جو انسان کو یکسر سوز و گداز بنا دیتی ہے، نہیں پائی جاتی اور اسی لئے ان کے یہاں یاس و قنوط، وہ غم دائم اور وہ حسرت و جانگدازی بھی نہیں ہے جو میر یا فانی کے شاعری کی خصوصیات ہیں، ان کے یہاں عشق خاک بسر رہنے کا نہیں، بلکہ زخم کھا کر اس سے لذت اٹھاتے رہنے کا نام ہے، وہ محبت میں رات رات بھر گریہ و زاری کرکے دوسروں کی نیند حرام کرنا پسند نہیں کرتے، وہ اپنی بےلبسی و بیچارگی کے اظہار سے دنیا کی ہمدردی حاصل کرنا نہیں چاہتے، وہ اغیار کا ذکر کرکے اپنی محبت کی صداقت ثابت کرنے کے لئے کوئی اخلاقی بحث پیش نہیں کرنا مناسب نہیں سمجھتے، وہ عالم نزع یا موت کے ذکر سے محبوب میں جذبۂ استرحام پیدا کرنے کے قایل نہیں بلکہ ان کے یہاں حسن و محبت کا ایک بہت صاف سیدھا نظریہ یہ ہے کہ محبت ایک فطری تقاضہ ہے اور عاشق و محبوب دونوں اسی دُنیا کے انسان ہیں جن میں نہ تقابل ضروری ہے نہ تصادم۔ ان کی محبت ملکوتی یا افلاطونی محبت نہیں ہے جو جنسی جذبات سے خالی ہو، لیکن اس کی غایت ان کے یہاں ان جذبات کی تسکین بھی نہیں۔ وہ محبت کے اظہار میں چنیں و چناں سے کام نہیں لیتے، انھیں باتیں بنانا نہیں آتیں اگر انھیں محبوب کی طرف سے بے اعتنائی کی شکایت ہوتی ہے تو وہ نہ ہائے واویلا کرتے ہیں اور نہ اسے کوئی قیامت خیز سانحہ جانتے ہیں، وہ نہایت سادگی کے ساتھ محبوب سے کہہ دیتے ہیں کہ اگر آپ لطف و کرم نہیں کرنا چاہتے تو نہ کیجئے لیکن

ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجئے

اور اسی کے ساتھ دبی زبان سے یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ:۔

پھر کہئے کس امید پہ ہم زندگی کریں جب التفات آپ ذرا بھی نہ کیجئے

بات یہ ہے کہ حسرت کی شاعری کا ایک خاص ماحول ہے، ایک خاص پس منظر ہے اور اس کا تقاضہ یہ نہیں کہ وہ فضول بڑھ بڑھ کر باتیں کریں۔ ان کی محبت کی جولانگاہ اس دنیا سے بلند کوئی ایسی فضا نہیں ہے جہاں جسم کا گزر محال ہو اور گوشت و خون سے پیدا ہونے والے جذبات پر جس کے دروازے بند ہوں۔ ان کا محبوب وادیِ ایمن یا کوہ طور کی مخلوق نہیں بلکہ انھیں کی سوسائٹی کا فرد ہے جو چلمن کی اوٹ، پردہ کی آڑ، جھروکوں اور جھالیوں سے کوٹھے پر آکر اور موقع ہو تو نقاب اُلٹ کر بھی فریفتہ بنا سکتا ہے۔ حسرت کی محبت کی فضا وہی ہے جو "زہرِ عشق" کی تھی اور جس میں حکیم مومن خاں نے کسی ساعد سیمیں کو دیکھ کر اپنا دل گنوایا تھا۔ یہ فضا عشق و محبت کی وہ موہوم فضا نہیں جس میں گناہ کا خیال ہی دل میں نہ آئے اور واسطہ صرف فرشتوں سے ہو بلکہ یہ وہ ماحول ہے جو جذبات میں جنسی ہیجان بھی پیدا کرتا ہے اور جس کی بدولت کبھی کبھی انسان زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے

پھر اگر محبت لاہوتی و ناسوتی دنیا سے ہٹ کر بھی کوئی مفہوم رکھتی ہے اور ایک عاشق کا تنہا فرض یہی نہیں کہ وہ صرف فلسفہ و حکمت اور کائنات کے غوامض و دقایق حل کرتا رہے، تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ حسرت کی شاعری حُسن و عشق کے معاملات کی ایسی واقعی و حقیقی تصویر ہے کہ اس سے ہٹ کر انسان فلاطون و ارسطو تو بن سکتا ہے لیکن انسان شاید نہیں بن سکتا اور شاعر تو یقیناً نہیں

حسرت کی شاعری اسی انسانی محبت کی زبان ہے اور اس میں جو جو کیفیتیں دل پر طاری ہو سکتی ہیں، یا جو جو جذبات پیدا ہو سکتے ہیں وہی سب انھوں نے بغیر کسی تصنع و آورد کے، نہایت سادہ لیکن پر اثر انداز میں بیان کر دئے ہیں

ان تمام کیفیات اور مدارج محبت کا استقصاء اور ان کی جدا جدا مثالیں پیش کرنا تو ایک مختصر مضمون میں ممکن نہیں لیکن حسرت نے ان بعض مسلسل غزلوں میں تقریباً ان تمام مدارج کیفیات کو یکجا ظاہر کر دیا ہے ایک غزل وہ ہے جس کا مطلع ہے:۔

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جایئے بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے

اور دوسری غزل وہ جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے:۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

(پوری غزلیں انتخاب کلام میں ملاحظہ فرمایئے)

یہ غزلیں جن کو ہم مثنوی اور واسوخت بھی کہہ سکتے ہیں سنہ ۱۲ء اور سنہ ۱۶ء کے درمیان کی ہیں جب حسرت کا شباب تھا اور محبت کا رنگ انکے

دل میں پوری طرح رچا ہوا تھا۔ ان غزلوں میں جو زبان، طرزِ بیان اور پُرکارانہ سادگی پائی جاتی ہے، وہ نہ قصد و ارادہ سے پیدا ہو سکتی ہے نہ کسب و اکتساب سے بلکہ اُسے ایک چوٹ کھایا ہوا دل ہی پیدا کر سکتا ہے جس کے نزدیک محبت نام شورش و داویلا کا نہیں، بلکہ اس دھیمی دھیمی آنچ کا ہے جسے آدابِ محبت شعلہ نہیں ہونے دیتے

حسرت کے یہاں ان غزلوں کے علاوہ بھی بکثرت ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن کو ایک دُکھے ہوئے دل کی پکار ایک مجروح زندگی کی داستان کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً :-

قصۂ درد کہوں شوق کا افسانہ کہوں — دل ہو قابو میں تو اس شوخ سے کیا کیا نہ کہوں
خود ہے اقرار انھیں اپنی ستمگاری کا — پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ میں ایسا نہ کہوں
آپ بیٹھیں تو سہی آکے مرے پاس کبھی — کہ میں فرصت میں حدیثِ دلِ دیوانہ کہوں

ستم تم چھوڑ دو میں شکوہ سنجیہائے ناجا بجا — کہ فرضِ عین ہے کیشِ محبت میں رواداری
ہوئیں ناکامیاں، بدنامیاں، رسوائیاں کیا کیا — نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری
نہیں غم جیب و دامن کا مگر ہاں فکر ہے اتنی — نہ اُٹھے گا مرے دستِ جنوں سے رنجِ بیکاری
نہ ان کو رحم آتا ہے نہ مجھ سے صبر ہے ممکن — کہیں آسان ہو یارب محبت کی یہ دشواری
وفورِ اشکِ پیہم سے ہجومِ شوق بیجد میں — مری آنکھوں سے ہے اک آبشارِ آرزو جاری

اس رنگ کے اشعار ان کے کلیات میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی مثال ہمیں متقدمین کے یہاں بھی مشکل سے مل سکتی ہے۔ متاخرین کا کیا ذکر ——————— لیکن حسرت کا سارا کلام اس رنگ کا نہیں ہے اور نہ ہو سکتا تھا، کیونکہ شاعر ہو یا نبی ہر وقت اس کو الہام نہیں ہوا کرتا

حسرت کے یہاں اس کے بعد دوسرا قابلِ ذکر رنگ وہ ہے جسے ہم خاندانِ مومن کا فیض کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی حسرت کا رنگ مومن سے زیادہ نکھرا ہوا ہے اور نہ صرف یہ کہ پیچیدگیوں سے صاف ہے بلکہ زیادہ گہرے تاثرات کا حامل ہے۔ مثلاً :-

ستم ہو جائے تمہیدِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے — محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے

حُسن بے پروا کو خودبین و خودآرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

جاتے جاتے رہ گیا وہ نازنیں صبحِ وصال — ناز بردار اثر ہوں گریۂ مجبور کا

ہجومِ بیکسی کو وجہ لطفِ بیکراں پایا — کہ ہم نے آج اس نامہرباں کو مہرباں پایا

نہاں شانِ تغافل میں ہے رمزِ امتیاز اس کا — بہ اندازِ جفا ہے التفاتِ دلنواز اس کا
غلط ہے شکوہ سنجی میرے عشقِ ناشکیبا کی — بجا کرتا ہے جو کرتا ہے حُسنِ بے نیاز اس کا

دشوار ہے اہتمامِ تمکیں — ہم ہر کہ ہلاکِ گفتگو ہیں

تاثیرِ برقِ حُسن جو ان کے سخن میں تھی — اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں سے قریب — آن پہونچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

ان تمام اشعار میں حسرت نے فارسی ترکیبوں سے کام لیا ہے لیکن وہ سب اتنی آسانی و روانی کے ساتھ زبان سے ادا ہو کر دماغ تک پہونچ جاتی ہیں کہ ہمارا خیال ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی طرف نہیں جاتا، علاوہ اس کے مومن کے کلام کی سی تعقید ان کے اشعار میں نہیں پائی جاتی اور نہ نثر کرنے کے لئے الفاظ کی ترتیب کو زیادہ بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے

حسرت کی شاعری کی یہ عمومی خصوصیت "گویا وہ کسی سے بے تکلف باتیں کر رہے ہیں" ان کے تمام اشعار میں پائی جاتی ہے خواہ وہ روز کی معمولی

زبان میں ہوں یا فارسی آمیز زبان میں، اور اسی لیے ان کے اشعار سمجھنے کے لئے دماغ پر مطلق زور دینے کی ضرورت نہیں ہوتی اور ان کو پڑھ کر یا سنکر زبان کان اور دماغ سب ایک ساتھ اپنا اپنا کام کرنے لگتے ہیں۔

حسرت کی شاعری میں بہ لحاظ بیان ہم کو مختلف رنگ کے اشعار ملتے ہیں، ایک وہ جن میں زبانِ محبت کے حالات پر عمومی گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے وہ جو صرف ان کے اور ان کے محبوب سے تعلق رکھتے ہیں۔ تیسرے وہ جو محبوب کے مطالعۂ حسن سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن بیان کی دلآویزی، شیرینی وحلاوت، سلاست وروانی سب میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے

قسم اول کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کوئی بھی پرساں نہیں حالِ دلِ رنجور کا   یہ ستم دیکھو دیارِ شوق کے دستور کا
کہتے ہیں اہلِ جہاں دردِ محبت جس کو   نام اسی کا دلِ مضطر نے دوا رکھا ہے
وہی جور خزاں ہوگا، وہی گردشیاں ہونگی   نشاطِ بلبلِ بیدل بہارِ بوستاں تک ہے

اس رنگ کے اشعار حسرت کے یہاں بہت کم ہیں، کیونکہ ان کی شاعری زیادہ تر خود اپنے حال کا اظہار تھا اور اسی قسم کے اشعار ان کے یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مثلاً:۔

تجھ سے وہ لاشوق سے اور تیرنے نہ جانا   حسرت کو ابھی یاد ہے تیرا وہ زمانا،
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں   ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا۔
ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاریٔ دل   التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا
گر جوششِ آرزو کی یہی کیفیتیں رہیں   میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا
بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں   الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی   مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
دلِ آرزو شوق کا اظہار نہ کر دے   ڈرتا ہوں مگر یہ کہ وہ انکار نہ کر دے
تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا   پھر بھی تجھ سے ہمیں گلہ نہ ہوا

تیسرے رنگ میں انھوں نے صرف حسن کے ظاہری مطالعہ کو پیش کیا ہے جو محبوب کے جسم، لباس اور رنگ وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے:۔

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں   اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا
رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا   طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
محتاج بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوب یار   خوشبوئے دلبری بھی جو اس پیرہن میں تھی

ان رنگوں کے علاوہ بعض اور رنگ بھی حسرت کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً:۔

کسے فرصت تمھاری جستجو کی شوق بیجا سے   ابھی ہم نے کہاں ڈھونڈھا ابھی ہم نے کہاں پایا
نہ پا سکتے کبھی پابند رہ کر قیدِ ہستی میں   سو ہم نے بےنشاں ہو کر تجھے او بےنشاں پایا
اس درجہ دلپسند ہے آہنگ نغمہ کیوں   پنہاں لباسِ درد میں تیری صدا ہی کیا
دیکھو جسے ہے راہِ فنا کی طرف رواں   تیری محلسرا کا یہی راستہ ہے کیا،
ہر نغمہ نے انھیں کی طلب کا دیا مجھے پیام   ہر ساز نے انھیں کی سنائی صدا مجھے،

حسرت کی تقسیم کے مطابق یہ عارفانہ کلام ہے اور گو اس قسم کے اشعار ان کے یہاں بہت کم ہیں لیکن جتنے بھی ہیں وہ تصوف کی خشک اصطلاحوں سے پاک اور تاثرات سے لبریز ہیں۔ اس رنگ میں ان کا ایک شعر جو علاوہ بلندیٔ مفہوم کے نہایت گہرے تاثرات اور ایک خاص لہجے کا حامل ہے، خصوصیت کے ساتھ

قابلِ ذکر ہے :-

جذبۂ شوق کدھر کو لئے جاتا ہے مجھے پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے

شاعری میں ایک اور چیز بھی ہے جسے "بات سے بات پیدا کرنا" کہتے ہیں۔ حسرت کے یہاں یہ چیز بالکل نہیں پائی جاتی۔ ان کے یہاں مجھے صرف ایک مطلع اس انداز کا ملا ہے :-

انھوں نے پھیر دیا خط یونہی سلام کے بعد بڑھا گئے مرا تخلص بھی میرے نام کے بعد

حسرت کا کلام صنایع و بدایع سے بھی خالی ہے، البتہ صفت تقابل جس کا رواج لکھنؤ میں بہ سلسلۂ ایہام بہت عام ہو گیا تھا، کہیں کہیں ان کے یہاں البتہ پایا جاتا ہے لیکن ایسی خوبصورتی کے ساتھ کہ اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً :-

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا ہے تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی
عمر ہی کیا ہے وہ کمسن ہیں ابھی نام خدا ان پہ مرنا ہے تو کچھ دن ہمیں جینا ہے ضرور

الغرض حسرت کی شاعری بالکل انسانی سطح اور انسانی جذبات کی شاعری ہے اس میں کوئی کیفیت نہ "جنون زندگی" کی پائی جاتی ہے اور نہ کوئی ایسی کیفیت جس کو آج کل کی اصطلاح میں "ماورائی" کہا جاتا ہے اور جس میں فلسفہ و حکمت اور حقیقت و معرفت کے نکات تلاش کئے جاتے ہیں حسرت کی شاعری قطعاً "ادب برائے زندگی" ہے بشرطیکہ "زندگی" سے اقتصادی و سیاسی مسایل کو تھوڑی دیر کے لئے علٰحدہ کر دیا جائے اس کا تعلق یکسر "جمالیات" سے ہے جس میں تغازل ([illegible]) کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے یہاں محبت کا بیان ہے لیکن عشق کی شکست خوردگی سے بالکل پاک، ان کے یہاں جنسیاتی جذبات ہیں لیکن ہوسناکی سے مبرا، ان کی شاعری ایک خاص کلچر کی حامل ہے جو بالکل ہمارے مشرقی ماحول اور خاص شایستہ طبقہ سے تعلق رکھتا ہے

جس حد تک زبان و اندازِ بیان کا تعلق ہے وہ بھی طبقۂ عوام سے علٰحدہ ہے اور خواص میں بھی صرف ستھرے ذوق والوں کو اپیل کر سکتا ہے جذبات کے لحاظ سے ان کی شاعری ہوسناکی و ابتذال سے پاک ہے اور بڑی حد تک خودداری لئے ہوئے ہے۔ جرأت کے انداز کے بعض اشعار ان کے یہاں ضرور پائے جاتے ہیں لیکن یہ ان کا اصل رنگ نہیں ہے

حسرت نے مصحفی اور شعرائے قدیم کے تتبع میں ردیفوں میں حروفِ تہجی کا لحاظ بھی رکھا ہے اور مشکل ردیف و قوافی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اس میں یقیناً انھوں نے ایک حد تک عمدگی سے کام لیا ہے

حسرت کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جو بحریں شعر میں اختیار کی ہیں وہ بہت مترنم ہیں اور فنی کمال کے اظہار کے لئے سنگلاخ یا اضافات والی زمینیں اختیار نہیں کیں۔ لیکن ان تمام خصوصیات میں ان کے لہجہ کا حد درجہ نرم و شیریں ہونا وہ خصوصیت خاصہ ہے جو ان کی شاعری کا خصوصی طرۂ امتیاز ہے اور جس کی بنا پر ان کو رئیس المتغزلین کہا جاتا ہے۔

حسرت نے بعض غزلیں سیاسی رنگ کی بھی کہی ہیں، لیکن ان میں کوئی خصوصیت نہیں کیونکہ ان کی حیثیت نظموں کی ہے اور نظم نگاری حسرت کا فن نہ تھا حسرت نے رباعیاں بھی نہیں کہیں اور قصیدہ نگاری کی کوشش بھی کبھی نہیں کی کیونکہ یہ دونوں چیزیں ان کے ذوق سے علٰحدہ تھیں۔ دو چار تضمینیں ضرور انھوں نے لکھی ہیں اور فنی حیثیت سے بری نہیں، لیکن کوئی خاص بات ان میں بھی نہیں ہے

ہندی بھاشا میں بھی کبھی کبھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور غالباً اس جذبہ کے تحت کہ وہ کرشن جی کے بڑے معتقد تھے، لیکن ان میں بھی کوئی خاص کیفیت نہیں۔ کلیات میں ان کی چند فارسی کی غزلیں بھی ہیں جو زیادہ تر سعدی کے رنگ کی ہیں اور زبان و بیان دونوں حیثیتوں سے دلچسپ ہیں۔

رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی

(مولانا جمال میاں فرنگی محلی)

ایک ہی صنف میں کمال انسان کو لازوال بنا دیتا ہے اور اگر زندگی کا ہر شعبہ مکمل اور آدمی ہر پہلو سے انسان کامل ہو تو اس کی حیات جاوید میں کچھ شک نہیں، وہ نحیف و نزار جسم جو چند ماہ سے ہمیں اپنی خدمت کا شرف بخش رہا تھا سپرد خاک کیا جا چکا ہے۔ لیکن وہ ولی کامل اور درویش واصل جو اپنی زندگی ہی میں فانی فی اللہ اور باقی باللہ بن گیا تھا اس وقت بھی موجود ہے۔

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی صف اول کے مجاہد بن کر افق سیاست پر طلوع ہوئے اور ان کا سایۂ عاطفت مسلمانان ہند پر سب کے آخر وقت تک قائم رہا۔ حق تو یہ ہے کہ انھوں نے جو کام کیا وہ اس کے مجدد تھے اور جس راستے پر چلے وہی اس کے رہنما رہے۔

توں نے حسرت کی ادا تہذیب رسم عاشقی اس سے پہلے اعتبار شان رسوائی نہ تھا

دو لفظوں میں یہ سمجھیے کہ وہ گاندھی جی سے پرانے کانگریسی اور جناح صاحب سے پرانے مسلم لیگی تھے۔ ہندوستان کے سارے اشتراکیت پسندوں سے پرانے اشتراکی اور سارے آزادی چاہنے والوں سے پہلے مبلغ آزادی تھے، وہ سراپا جدوجہد تھے جو ہر استبداد سے مقابلہ کرتے رہے، وہ ایسے باعمل تھے جن کا ہر لمحہ ایک بلند مقصد کے لئے صرف ہوا وہ ایک اضطراب مسلسل تھے جس کی انتہا شاید موت بھی نہ کر سکے اور آج علیین میں انکے درجے بلند کر رہی ہو

جان حسرت کے لئے مایۂ نازش ہے یہی اضطراب دل دیوانہ مبارک باشد

حق گوئی اور بے باکی

جس صفت میں ان کا مثل و نظیر نہ دیکھا نہ سنا وہ ان کی حق گوئی اور بے باکی تھی بڑی سے بڑی حکومت سے وہ مرعوب نہیں ہوئے بڑے سے بڑا مجمع ان کو خوف زدہ نہیں کر سکا اور بڑے سے بڑے لیڈر ان کو ڈرا نہیں سکے حکومت سے تو لڑنے کے سلسلے میں ان کو بار ہا سخت سے سخت مصائب جھیلنا پڑے۔ گاندھی جی کے انتہائی عروج کے زمانہ میں ایک بار مولانا نے تنہا ان کے خلاف سیاہ جھنڈیوں کا جلوس نکالا۔ قائد اعظم کی قیادت کے شباب میں بھی مولانا نے تنہا ان کی مخالفت بارہا کی۔ تقسیم ہند کے بعد بھی ان کی وہی حالت رہی جو پہلے تھی، دہلی کے فسادات کے زمانہ میں وہ ایک بار تنہا دہلی اٹیشن سے بلیماراں گئے تھے اور ایک بار پارلیمنٹ اسٹریٹ کے ایک درخت کے نیچے عین فساد کی حالت میں نماز ادا کی، حج کو گئے تو سعودی ٹیکس دینے سے انکار کیا اور آخر میں وہاں کی حکومت کو ان کے سامنے جھکنا پڑا۔

ذاتی طور پر مجھکو ان کی اس طبیعت کا تجربہ اس دن ہوا جب وہ انگلستان جاتے ہوئے دمشق میں مجھ سے رخصت ہوئے لڑائی چھڑ جانے کی وجہ سے تمام دریائی جہازوں کے سفر منسوخ ہو گئے تھے اسی لئے میں نے اپنا ارادہ فسخ کر دیا تھا۔ مولانا نے مجھ سے کہا کہ میں تو عزم مصمم اس سفر کا کر چکا ہوں اگر جہاز نہ ملے گا تو سمندر میں پیر کر جاؤں گا، مگر جاؤں گا ضرور" اس وقت تو مجھے اس بات پر ہنسی ضرور آئی مگر مجھے یقین ہے کہ اگر نوبت آتی تو وہ یہ بھی کر گزرتے۔ آخر ان کا ارادہ پورا ہوا اور وہ ایک جہاز میں پہلے یونان گئے پھر دوسرے ممالک کی سیر کرتے ہوئے انگلستان پہونچے۔

جب وہ کسی بات کے کرنے یا کہنے کا ارادہ کر لیتے تو کسی کی طاقت نہیں تھی کہ ان کو روک سکے۔ انھوں نے خود اپنے ایک شعر میں یہ بات کہی ہے:-

روشن ہے ہم پہ حسرت عزم امور تیرا کرکے وہی رہے گا جو دل میں ٹھان لی ہے

سیاست میں بھی ان کا رویہ ہمیشہ منفرد رہا وہ کسی کے متبع نہ بن سکے جو تڑپ ان کے دل میں تھی اس کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ سب لوگ انھیں کی طرح ایثار پیشہ ور

جفاکش بن جائیں، اور اس رفتار سے جدوجہد کریں جو مولانا کا شعار تھی، بقول خود ؎

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم ۔۔۔ گھبرا گئے ہیں بے دلی ہمرہاں سے ہم

مختصر حالات

مولانا کی ولادت موہان میں ہوئی ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی اور شاعری کی ابتدا بھی اسی قصبہ میں ہوئی، اس کے بعد کانپور، فتحپور اور علی گڑھ میں تعلیم کی تکمیل ہوئی (مسلم یونیورسٹی سے انھوں نے امتیاز کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا اور علی گڑھ میں ہی اُردوئے معلی کے نام سے ایک ماہنامہ نکالنا شروع کیا۔ برطانوی استبداد کے خلاف ان کی جدوجہد کا آغاز علی گڑھ ہی سے ہوا وہ ۱۹۰۴ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوئے اور اس کے بعد کانگریس میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۰۸ء میں وہ پہلی بار گرفتار ہوئے۔ گرفتاری کے سلسلہ میں مولانا پر جو مظالم کئے ان میں سے ایک بات جس کا ساری عمر ان کو قلق رہا یہ تھی کہ اُردو کی بیش بہا کتابوں کا ذخیرہ جن میں بعض شعراء کے قلمی دواوین بھی تھے ان کی نگاہوں کے سامنے حکام نے جلا ڈالا۔ جیل خانے میں سیاسی اور غیر سیاسی قیدی کا کوئی فرق نہ تھا اور مولانا کو پہلے ایک من اور بعد کو ۲۰ سیر گیہوں چکی پر پیسنا پڑتا تھا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے کہا :۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی ۔۔۔ اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

رمضان کا مہینہ جیل خانے میں تو حسب معمول روزے بھی رکھے ؎

کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت ۔۔۔ گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

ایک زمانہ میں انھوں نے جیل کا کھانا لینے سے انکار کر دیا اور مسلسل روزے رکھنا شروع کئے۔ افطار صرف سادی چائے سے کرتے تھے۔ تمام لیڈروں نے منت و سماجت کی مگر مولانا نے نہ مانا، آخر ان کے پیرزادے (یعنی میرے والد مولانا عبدالباری) نے جب نہایت شد و مد سے لکھا تب وہ مانے۔

شاعری

ان کا شعر شعرہی نہ تھا، ان کا وہ اسوۂ حسنہ تھا، طبیعت میں بلا کی بے چینی، شوخی، رنگینی اور خوش مذاقی تھی، ان کے اشعار توہم پر مبنی نہ تھے ان کے دیکھے بھالے واقعات اور سمجھے بوجھے خیالات تھے، وہ جس چیز کو مان گئے اس کے کبھی منکر نہ ہوئے اور انھوں نے جس چیز کو رد کیا اس کے کبھی قایل نہ ہو سکے، وہ فخر سے کہتے تھے :۔

میں غلبۂ اعدا سے ڈرا ہوں نہ ڈروں گا ۔۔۔ یہ حوصلہ بخشا ہے مجھے شیر خدا نے

دشمن کے مٹانے سے مٹا ہوں نہ مٹونگا ۔۔۔ اور یوں تو میں فانی ہوں فنا میرے لئے ہے

وہ شاعر تھے اور ایسے شاعر کہ نعت و معرفت میں نظامی اور رومی کے ہم پلہ غزل میں خسرو اور سعدی کے ہم پایہ زبان کی چاشنی اور طرزادا کی ندرت اور دلکشی میں میر و مصحفی، مومن و غالب، درد اور سودا کے ہم رتبہ۔ اور حقیقی معنی میں عصر حاضر کے سب سے بڑے شاعر تھے، ہزاروں شعر ضرب المثل ہو چکے ہیں، سیکڑوں غزلیں زبان زد خاص و عام ہیں۔ اس عہد میں کون ہے جس نے ان تبرکات سخن کو آنکھ سے نہ لگایا ہو ؎

نسیم دہلوی کو وجد ہے فردوس میں حسرت ۔۔۔ جزاک اللہ تیری شاعری ہے یا فسوں کاری

مولانا کی شاعری کے سلسلہ میں ایک بات یہ تھی کہ وہ سونے کی حالت میں بھی پوری پوری غزلیں کہہ جاتے تھے اور صبح اُٹھ کر پوری غزل اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتے۔ مثلاً ان کے تازہ دیوان کا یہ شعر ؎

جذبۂ شوق کی تاثیر دکھاتا ہے مجھے ۔۔۔ آپ رو رو کے خود ان کو بھی رُلاتا ہے مجھے

گزشتہ چند سال سے ان کی توجہ شاعری کی طرف سے کم ہوگئی تھی اور ان کی زیادہ تر غزلیں وہی ہیں جو خود بخود ہوگئی ہیں۔

مولانا سیاسی خیالات بھی کبھی کبھی نظم کر دیا کرتے تھے، ان کے مطبوعہ کلیات کی بہت سی غزلوں میں جا بجا ان کے سیاسی عقاید کی جھلک ملتی ہے۔ اشتراکیت کے وہ سچے دلدادہ تھے اور اس نظام کو اسلامی نظام قرار دینے میں ان کو غیر معمولی غلو تھا۔ سچ بات یہ ہے کہ وہ سچائی سے یہ سمجھتے تھے کہ نظام اشتراکیت ہی صحیح نظام ہے اور وہ ایک نہ ایک دن ہندوستان میں نافذ ہو کر رہے گا۔ ایک شعر میں کہتے ہیں :۔

لازم ہے کہ ہو ہند میں آئین سویت ۔۔۔ دو چار برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

اتنے گہرے لگاؤ کے ساتھ مولانا کے مذہبی عقاید نہایت مستحکم تھے درج ذیل قطعہ میں انھوں نے اپنے عقاید کو خوب نظم کیا ہے :-

تکمیل علاج دینوی کو حسرت　　ہے خواہش حسن عاقبت بھی لازم
درویشی و انقلاب مسلک ہے مرا　　صوفی مومن ہوں، اشتراکی مسلم
رانو رکہ بہ نہج بیت مال اسلام　　فی الجملہ ہے آئین سوبت قایم

چند سال ہوئے مقام اشتراکیت کے نام سے مرحوم نے چند شعر کہے تھے اور ان میں بھی یہی مضمون پایا جاتا ہے۔ بہت سے اشعار ہیں جو کسی خواب کے دیکھنے کے بعد کہے گئے۔ مثلاً :-

فارغ از وسوسۂ سود و زیاں خواہد بود　　تا دل از ولولۂ عشق جواں خواہد بود
تا نصیب ہوسِ انس تاں خواہد بود　　تا زمے خانہ دمے نام و نشاں خواہد بود
سرما خاک رہ پیر مغاں خواہد بود

روحانی مرتبہ ان کی زندگی کا شخصی پہلو بھی عجیب و غریب تھا، غریبوں کی طرح رہے جس مساوات کے علمبردار تھے اس کا نمونہ تھے، جس فقر و زہد کی تلقین کرتے تھے اس کا معیار تھے۔ جو خلوص اور للہیت صرف کتابوں میں پڑھی ہی ہے وہ اس کا چلتا پھرتا خاکہ تھے۔ سیاسی عقاید کی انتہائی تیزی کے ساتھ تصوف کی ایک لطیف فضا تھی جو ان کے انکسار، ان کے خلوص، ان کے زہد، ان کی حق گوئی، ان کی بے باکی —————— ان کی شاعری بلکہ ان کی ساری زندگی کو اپنے دامن میں چھپائے تھی ؎

ہر حال ہر خیال میں ہر اعتبار سے　　حسرت مطیع عشق رہے ٹھیک ہم رہے

وہ ایسے درویش کامل تھے کہ ایک زمانہ تک اپنے پیران سلسلہ کا کوئی عرس انھوں نے ناغہ نہیں کیا۔ نعت و منقبت میں بہت سا کلام ان کا ایسا ہے جو بہت سے سلاسل میں وظایف اور اوراد کی طرح پڑھا جاتا ہے۔ پیران پیر کی شان میں ان کی یہ غزل اکثر سلاسل میں بطور ورد کے پڑھی جاتی ہے ؎

دستگیری کا طلبگار ہوں شیئاً للہ　　پیر بغداد میں ناچار ہوں شیئاً للہ

مولانا اپنے مشرب میں کٹر صوفی تھے قوالی کے بہت شوقین تھے اور محفل سماع میں خاص جذب وکیف سے شریک ہوتے تھے جب روپے ختم ہو جاتے تھے تو اپنے کپڑے اتار کر قوالوں کو دیدیتے عرس سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اپنی جایداد کا بیشتر حصہ اپنے پیر و مرشد اور اپنے جداعلیٰ کے عرس کے لئے اپنی زندگی میں وقف کر چکے تھے۔ مولانا دراصل سلسلۂ قادریہ میں میرے دادا مولانا عبدالوہاب کے مرید ہوئے اور بیعت کا واقعہ انھوں نے مجھسے یہ بیان کیا کہ ایک بار ان کے ذہن میں کچھ شکوک تھے اور انھوں نے یہ خیال کیا کہ اگر مولانا عبدالوہاب صاحب میرے شکوک بغیر بات کئے صرف اپنی نظر سے دور کر دیں تب میں ان کا قائل ہوں گا۔ ادھر یہ خیال آیا ادھر ان کے ہونے والے مرشد نے ان کو ایک ایسی نگاہ سے دیکھا کہ مولانا ان کے قدمبوس ہوگئے اور داخل بیعت ہوئے اسی واقعہ کی طرف انھوں نے اپنے ایک شعر میں اشارہ کیا ہے :-

کیا چیز تھی وہ مرشد وہاب کی نگاہ　　حسرت کو جس نے عارف کامل بنا دیا

سلسلۂ چشتیہ میں میرے والد نے ان کو مرید اور خلیفہ بنا دیا تھا اور مولانا کا بیان یہ تھا کہ یہ ایک خاص حکم کی بناء پر کیا گیا تھا۔

موت کا احساس آنے والے واقعات کو خوب اندازہ کرتے تھے۔ مولانا کو اپنے وقت آجانے کا علم عرصہ سے تھا، امسال حج کے لئے وہ گئے اور مجھے بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہوا تو برابر یہی کہتے تھے کہ میں آخری سفر کر رہا ہوں اور واپسی کے لئے جب کراچی اور لاہور ہوتے ہوئے انھوں نے اپنا تسرع ظاہر کیا اور میں نے ان سے رکنے پر اصرار کیا تو مولانا نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد اپنے وہاں کے احباب سے مل کر لکھنؤ پہونچ جاؤں کیونکہ اب مجھے زیادہ دن جینا نہیں ہے

مجھے اس پر ناز اور فخر ہے کہ مولانا حسرت مرحوم مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے۔ میں گزشتہ ماہ جب ڈھاکہ میں تھا اور مولانا علیل ہو کر فرنگی محل آچکے تھے تو انھوں نے مجھے صرف یہ جملہ تحریر کرایا "مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ میں یہاں ہوں اور آپ یہاں نہیں ہیں"

آخر وقت تک میری ہر خواہش کو پورا فرمایا۔ اور انتہائی انکار کی حالت میں بھی جب یہ کہا جاتا کہ میں دوا پینے کے لئے کہہ رہا ہوں یا میں آرہا ہوں تو فوراً دوا پی لیتے تھے۔ مولانا کا مزاج ایسا تھا کہ وہ میرے بزرگ بھی تھے۔ دوست بھی، مقتدی بھی تھے۔ مقتدا بھی، اور یہ سب کچھ محض اس لئے کہ میرے بزرگوں سے ان کو ارادت تھی اور میرے دادا کے وہ مرید تھے۔ ہم لوگ اپنے اسلاف کے طریقہ پر نہیں چل سکے۔ لیکن یہ مولانا کی وضعداری تھی کہ ان کا رویہ نہ بدلا۔

علیل پہلے بھی ہوئے مگر اس بار لکھنؤ میں آکر ٹھہر گئے۔ مدعا یہ تھا کہ پیر و مرشد کے پہلو میں پہونچ جائیں ؎

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگ جاں کے قریب — آن پہونچے ہیں مگر منزل جاناں کے قریب
لکھنؤ آنے کے باعث یہ کھلا آخر کار — کھینچ لایا ہے دل اک شاہد پنہاں کے قریب
بیٹے اس ڈھب سے کہ پھر ہو نہ جدا خاک میری — کہیں پہونچے بھی تو اس گوشۂ داماں کے قریب

دفن اس باغ میں ہوئے جس کی شان میں کبھی یوں نغمہ سرا تھے :۔

تا قیامت رہے قایم مری سرکار کا باغ — وہ جسے کہتے ہیں سب حضرت انوار کا باغ
مئے عرفاں کی لگی رہتی ہے ہر وقت سبیل — جائے رحمت ہے یہ رندانِ قدح خوار کا باغ
ہدیۂ حسنِ عقیدت ہیں یہ گلہائے خلوص — نذرِ رزاق ہے حسرت مرے اشعار کا باغ

آخر کار خود بھی نذر ہو گئے اور ہمیشہ کے لئے ان کی روح مطمئن ہو گئی۔

بیماری شروع سے پریشان کن تھی، اس بار خلاف معمول علاج سے بہت انکار تھا۔ ہر امر میں اصرار کی حاجت ہوتی تھی۔

مولانا کے پھوپھی زاد بھائی اور تیمار دار مولانا سید علی حسین موہانی نے مجھ سے بیان کیا کہ مولانا کے دوران علالت میں کسی ڈاکٹر نے طنزاً کہا کہ مولانا آپ ذرا سی سوئی کی تکلیف سے ڈرتے ہیں۔ اس پر مولانا سخت ناراض ہوئے انھوں نے فرمایا کہ میں اپنی زندگی میں کبھی کسی تکلیف سے نہیں ڈرا اب آپ کی سوئی سے کیا ڈرونگا میں تو محض اس لئے مزاحمت کرتا ہوں کہ اسے اب بیکار سمجھتا ہوں۔

انجکشن لینے اور دوا پینے پر راضی نہ ہوتے تھے، ڈاکٹروں کی رائے اور ہدایت بیان کی جائے تو ٹال دیتے تھے اور گویا زبانِ حال سے کہتے ؎

تشخیص طبیباں پہ ہنسی آتی ہے حسرت — یہ درد جگر ہے کہ دوا میرے لئے ہے

زندگی جس شان استغنا اور فراغت سے ختم ہوئی وہ دنیا کو معلوم ہے۔ لوگوں کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کے میرے یہاں قیام کا سبب کوئی دنیاوی زحمت تھی۔ وہ میرے گھر میں ضرور رہے لیکن اپنے کسی خرچ میں کسی کے کبھی شرمندۂ احسان نہیں ہوئے۔

اس بار مردم شماری کے موقع پر جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا نام کانپور میں لکھا جائے یا لکھنؤ میں تو صرف درج ذیل شعر پڑھ کر خاموش ہو گئے :۔

نہ چھوٹا دریار حسرت نہ چھوٹا — بہت ہم نے چاہا بنیں کانپوری

علالت کے انتہائی کرب میں بھی جبین پر شکن نہ آئی، منھ سے ایک آہ نہ نکلی، صرف توبہ اور استغفار کے الفاظ سنائی دیتے تھے۔ استقلال اور ہمت کا یہ عالم تھا کہ اپنے پریشان اعزا کے اضطراب پر موت سے کچھ وقت پہلے انھوں نے فرمایا کہ "یہ کوئی نئی بات ہو رہی ہے"؟

تصانیف کلیات حسرت کے سوا مولانا کی چند کتابیں شاعری کے بارے میں ہیں اور شایع ہو چکی ہیں۔ مولانا روزانہ بعد نماز فجر اپنا روزنامچہ تحریر کرتے تھے اور ان کی جملہ غزلیں بھی اس میں درج ہوتی تھیں۔ سیاسی مشاغل کی تفصیل بھی ہوتی اور ادنیٰ سے ادنیٰ معاملہ بھی لکھا جاتا۔

۱۳ مئی کو انتقال ہوا اور ۷ اپریل تک انھوں نے اپنا روزنامچہ لکھا ہے۔ اگر یہ مرتب کرکے شایع کر دیا جائے تو ادب، سیاست اور تاریخ میں ایک نادر اور قیمتی اضافہ ہوگا۔

مولانا کے ورثا کا ارادہ ہے کہ مرحوم کی تصانیف کے لئے ایک یادگاری ادارہ قایم کریں۔ خدا کرے ان کے ورثا مولانا کی یہ یادگار جلد قایم کریں اور ان کی تصانیف شایان شایع کریں۔

مولانا کے منشا کے مطابق ان کا سالانہ عرس ماہ صفر میں ان کے پیر و مرشد کے ساتھ ہر سال ہوتا رہے گا

پسماندگان مولانا کی پہلی بیوی کے بطن سے صرف ایک صاحبزادی نعیمہ بیگم تولد ہوئیں جن کی شادی عبد السمیع صاحب سے ہوئی ان کے دو لڑکے رضوان الحسن اور احسان الحسن تعلیم ختم کر چکے ہیں اور کراچی میں ملازم ہیں، دو لڑکے صباح الحسن اور انعام الحسن کان پور میں زیر تعلیم ہیں۔ سب سے چھوٹا لڑکا عبد الحی مع صغیر سن ہے۔ ایک لڑکی ہے جس کی شادی ہو چکی ہے۔

مولانا نے دوسری شادی بھی اپنے خاندان ہی میں شوہر اول کی وفات کے بعد صبیحہ بیگم سے کی تھی۔ جو اکے بطن سے خالدہ سلمہا ایک خورد سال صاحبزادی ہیں۔

مولانا کے سگے بھائی سید مبین الحسن ہند کی ضلع فتحپور میں رہتے ہیں۔ مولانا کے بڑے بھائی سید روح الحسن مرحوم کے دو صاحبزادے فتحپور میں اور ایک صاحبزادے حیدر آباد میں رہتے ہیں۔

وفات کے وقت مولانا کا سن ہجری حساب سے پورے ۷۵ سال تھا۔ مولانا نے کوئی قابل ذکر جائداد نہیں چھوڑی ہے اپنی آبائی جائداد وہ وقف کر چکے تھے۔ صرف ایک قلیل سرمایہ بعض تجارتی کمپنیوں میں لگا ہوا ہے۔

ایک التماس ملک و ملت کے ایسے مجاہد قائد اور اردو کے اتنے بڑے شاعر کی ان یادگاروں کے لئے حکومت یا ملت سے کوئی امید رکھنا بے کار ہے اور اس قسم کی استدعا بھی کرنا مولانا ئے مرحوم کی شانِ استغنا کو صدمہ پہونچانا ہے لیکن ناشرینِ کتب سے اور مضمون نگاروں سے اتنی التماس ضروری ہے کہ وہ کم از کم مولانا کی تصانیف بلا ان کی اہلیہ محترمہ کی اجازت کے شایع نہ کریں اور ان کی داخل نصاب کتابوں میں سرقہ تو نہ کریں۔

ایک پسندیدہ غزل آخر میں مولانا کی وہ غزل درج کی جاتی ہے جس کے لئے انھوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ یہ انھیں سب سے زیادہ مرغوب غزل ہے ؎

شغل بے کار ہیں سب ان کی محبت کے سوا — کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا
تیرے وارفتۂ دیوانہ طبیعت کے سوا — دے سکا کوئی نہ دہری کے وساوس کا جواب
کچھ نہیں اور جب اس رنج میں راحت کے سوا — کون رکھے گا ترے غم سے دل و جاں کو عزیز
اور کچھ ہو بھی شریعت میں طریقت کے سوا — قول زاہد کو غلط ہم نہیں کہتے ہیں مگر
اہلِ عصیاں کو ترے سایۂ رحمت کے سوا — حشر میں تاب جہنم سے مفر اور کہاں
اور یاں خاک نہیں خواہشِ جنت کے سوا — نورِ عرفاں کی عبث ہے دلِ زاہد میں تلاش
آپ نے تو نہ دیا کچھ بھی اذیت کے سوا — اس کی بات اور ہے پائیں جو ہم اس میں بھی مزا
کچھ نہ پائیں گے وہاں رنج و مصیبت کے سوا — اہلِ ظاہر نہ کریں کوچۂ باطن کی تلاش
کچھ نہیں فلسفۂ عشق میں جدت کے سوا — علم و حکمت کا جنھیں شوق ہو آئیں نہ ادھر
اس میں اک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا — سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم

عقل حیران ہے اے جانِ جہاں راز ترا
کون سمجھے دلِ دیوانۂ حسرت کے سوا

("قومی آواز")

میر

بیاضِ حسرت:-

شب کو القصہ عجب قصۂ جانکاہ سنا — حالِ دل میر کا رو رو کے سب اے ماہ سنا
حالانکہ رفتنی ہیں سب اس کارواں کے لوگ — غافل ہیں ایسے سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ
یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ — کیا سہل جی سے ہاتھ اٹھا بیٹھتے ہیں ہائے

حسرت کے شاعرانہ مرتبے کا تعین

(خلیل الرحمان اعظمی، ایم-اے)

حسرت اُردو کے بڑے مقبول اور ہردلعزیز شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری اور شخصیت میں جو دلکشی اور دلآویزی ہے اس کی بنا پر وہ ہماری زبان میں ایک محبوب کردار کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ حسرت ہی ایک ایسے شاعر تھے جنھیں نہ تو معاصرانہ چشمکوں اور شاعرانہ رقابتوں سے واسطہ پڑا، نہ میر کی طرح کسی نے ان کی "بددماغی" کا شکوہ کیا، نہ غالب کی طرح انھیں "مہمل گوئی" کا طعنہ سہنا پڑا اور نہ اقبال کی طرح ان پر فسطائیت کا الزام لگایا گیا۔ شاید ہی ایسا کوئی سربھرا نقاد ہو جس نے حسرت کی شاعری کو نکتہ چینی اور خوردہ گیری کی نظر سے دیکھا ہو۔

میں نے سولہ سترہ سال کی عمر میں پہلی بار حسرت کا کلام پڑھا اور ان کی غزلوں کا گرویدہ ہو گیا۔ ان کی غزلوں میں زندگی کی جوان رگوں کا خون جس طرح دوڑ رہا ہے اور متوسط نوجوان طبقے کی نفسیات کا جس طرح عکس پڑ رہا ہے اس نے مجھے اپنی طرف کھینچا۔ اگر میں اس زمانہ کے پسندیدہ اشعار کا یہاں انتخاب دیدوں تو اس سے حسرت کے کلام کی خوبیاں اتنی اُجاگر نہ ہوں گی جتنا میری رسوائی کا سامان — لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کی چند بنیادی خوبیوں کو جانتے ہوئے بھی میں اس سے دور ہونے لگا۔ میری زندگی میں جب عنفوان شباب کا ہیجان اور سرور و نشاط ختم ہونے لگا اور بے درد دنیا مجھے کچوکے دینے لگی تو مجھ میں ایک سنجیدگی پیدا ہونے لگی۔ میں دردمند سا رہنے لگا۔ تشنگی، ناکامی، اداسی اور محرومی سے سامنا کرنا پڑا تو چھیڑ چھاڑ والی شاعری سے لطف لینے کے بجائے میں اکثر ایک سوچ میں پڑ جاتا تھا۔ ایک حیرت، ایک بیزاری، کسی چیز کو پانے اور بعض مسایل کو سمجھنے یا چند چیزوں کو بدل دینے کی زبردست خواہش جنم لینے لگی تو دن بدن حسرت سے میری دلچسپی کم ہونے لگی۔

ایک طرف میرے ذاتی حالات کا ردعمل تھا دوسری طرف میرے ادبی شعور اور مطالعہ نے بھی اثر ڈالا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج میں اس منزل پر پہونچ گیا ہوں کہ حسرت پر کچھ لکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک ان کے کلام کو پڑھنے اور اس سے لطف لینے کا سوال ہے میں اس سے دوری کے باوجود سال میں ایک آدھ مرتبہ دلچسپی لے لیتا ہوں اور دیوان حسرت میرے سرہانے رکھا ہوا مل جاتا ہے اور جہاں تک روزمرہ کی گفتگو اور بات چیت کے دوران میں حسرت پر رائے دینے کا مسئلہ ہے میں اب بھی ان کی غزلوں کی بھرپور رنگا رنگیوں ہی کو سراہتا ہوں لیکن حسرت پر کوئی تنقیدی مضمون لکھنے سے میں نے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ کیونکہ حسرت کے متعلق میرے دل میں شروع ہی سے ایک چور رہا ہے۔ لوگ انھیں پسند کرتے ہیں لیکن اس پسند کی بنا پر انھیں بڑا شاعر بھی سمجھتے ہیں۔ میں ان کی خوبیوں کا معترف ہوتے ہوئے بھی ان کو اس مقام پر نہیں بٹھا سکتا۔ خیر حسرت پر صحیح تنقید تو اب شروع ہوگی۔ سنا ہے ہمارے تمام مستند اور معتبر نقادوں نے حسرت پر قلم اُٹھایا ہے۔ وہ لوگ حسرت پر جو رائے دیں گے اور ان کے کھرے کھوٹے کو پرکھ کر ان کی جگہ متعین کریں گے اس کے بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ بعض اوقات تنقید نگار بھی مصالح، ذاتی پسند اور تعلقات کا شکار ہو جاتا ہے اور جبکہ حسرت کا ابھی چند مہینے پہلے انتقال ہوا ہے اور پوری قوم ان کے بچھڑ جانے پر افسردہ و اداس ہے کسی کو ذرا یہ جرأت مشکل ہی سے ہوگی کہ ان کے کلام پر رائے دیتے وقت کوئی ایسی تنقید کرے جو سچی ہونے کے باوجود تلخ ہو۔ میں دراصل اسی تلخی سے بچنا چاہتا تھا، اسی لئے ان پر لکھنے سے جی چراتا رہا۔ اگر کسی نے ان کے بارے میں پوچھا تو میں نے بھی نذرِ عقیدت پیش کر دی لیکن لکھتے وقت پتہ نہیں کیوں میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا کہ تنقید کے نام پر شاعر

کے کلام کی تشریح کی جائے محض اس کے زمانہ کے حالات اور سماجی پس منظر کو بیان کر دیا جائے یا صرف اس کی خوبیوں ہی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر دیا جائے۔ میرا تو یہ عقیدہ رہا ہے کہ یا تو تنقید لکھی ہی نہ جائے اور اگر نقاد ہاتھ میں قلم لے تو اسے اپنے شعور کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا چاہئے اور نہ ایمانداری سے گریز کرنا چاہئے۔

میں نے حسرت پر مضمون لکھنے کا ارادہ تقریباً ترک کر دیا تھا اور سوچا تھا کہ دو چار سال بعد جب یہ سوگوارانہ فضا ختم ہوگی تو میں ان پر اصل رائے دوں گا لیکن پچھلے دنوں علی گڑھ کے شعبۂ انگریزی کے ایک استاد جو میرے دوست بھی ہیں اور شعر و ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں اپنی گفتگو کے دوران میں مجھ سے کہنے لگے کہ حسرت عظیم شاعروں میں سے نہیں ہیں۔ انھیں صرف "اچھا" شاعر کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ "عظیم" کا لفظ استعمال کرتے وقت ہمارے سامنے فوراً ہومر، ورجل، گوئٹے، شیکسپیر، رومی، غالب اور اقبال وغیرہ آتے ہیں اس لئے ان کے اس جملہ پر میں چونکا۔ میں اسے شاید پی جاتا لیکن ایک تو موصوف کے ادبی شعور پر مجھے بڑا بھروسہ تھا دوسرے یہ کہ وہ آجکل حسرت پر ایک کتاب بھی لکھ رہے ہیں۔ کوئی اور آدمی ہوتا تو میں بات کو ٹال دیتا لیکن حسرت پر کتاب لکھنے والا ان کے متعلق اس طرح رائے دے یہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس طرح رائے دینے میں ان کا تو خیر کوئی فائدہ ہی نہیں لیکن حسرت کو بھی اس قسم کی تنقید سے نقصان پہونچے گا کیونکہ اس طرح حسرت کے پاس جو کچھ رہی سہی پونجی ہے اس کی بھی وقعت کم ہو جائے گی اور ان کی شاعری سے ہم جو اتنا لطف لیتے ہیں اس پر خاک پڑ جائے گی۔ یہی جذبہ تھا جس نے مجھے حسرت پر لکھنے کے لئے مجبور کیا۔ میرے مضمون سے حسرت کے پرستاروں کے دل کو تھوڑی سی تکلیف تو ہوگی لیکن میں اپنے نقطۂ نظر کو اس لئے پیش کر دینا چاہتا ہوں کہ ممکن ہے میری یہ باتیں کچھ لوگوں کو حسرت کے بارے میں سوچنے پر آمادہ کریں اور میرے دوست یا ان ہی طرح کے بہت سے نقاد حسرت پر تفصیلی تنقید یا کتاب لکھتے وقت اپنی رائے پر ایک مرتبہ نظر ثانی بھی کر لیں۔

حسرت کو میں اردو کے اچھے شاعروں میں شمار کرتا ہوں ان کی شاعری میں ایسی بہت سی خوبیاں ہیں جن کی بنا پر وہ ہر زمانہ میں پڑھے اور پسند کئے جائیں گے۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ ان کی شاعری رسمی اور روایتی نہیں ہے بلکہ اس میں ایک زندہ اور جیتی جاگتی شخصیت کا عکس ہے۔ اردو کی عشقیہ شاعری میں حسرت کا یہ کارنامہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا کہ ان کے اشعار کو پڑھ کر ان کے عشق پر خیالی یا تصوراتی ہونے کا گمان نہیں ہوتا۔ اچھے اچھے شاعر اگر زندگی کے بعض مسائل پر اپنے ذاتی تجربات کی مدد سے نگاہ ڈالتے ہیں تو اکثر اوقات شاعرانہ رعایتوں سے کام لیکر اور لفظی بازی گری کے سہارے ہر طرح کے مضامین باندھتے ہیں۔ ان شعراء نے عشق کبھی نہیں کیا لیکن شاعری میں مجنوں اور فرہاد سے کم درجے کے نہیں معلوم ہوتے۔ زندگی رندی اور اوباشی میں کٹ رہی ہے لیکن تصوف کا اس طرح ذکر کرتے ہیں گویا دن رات عبادت اور تسبیح و تہلیل میں گزرتے ہیں۔ حسرت کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو غزل کو سچ بولنا سکھایا۔ ان کے یہاں تین موضوع ملتے ہیں۔ عشق، تصوف اور سیاست۔ ان کا مزاج عاشقانہ ہے اور ان کو عاشقی کے وہ تجربات ملے ہیں جو ہمارے یہاں کے شاعر یا اوسط درجے کے نوجوان کو نہیں ملتے یعنی کامیاب عشق جس میں بجائے تشنگی محرومی اور سماجی رکاوٹوں کے بھرپور آسودگی آزادی اور محبوب سے قربت ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں عشق مادی ہے، حقیقی ہے اور اس میں کامیابی کی ہماہمی اور چہل پہل ہے۔ حسرت کو اپنی محبت میں محرومی و ناکامی، محبوب کی بے اعتنائی اور فراق کی کیفیتوں سے واسطہ نہیں پڑا اس لئے ان کی شاعری میں بھی ان باتوں کا گزر نہیں۔ ——

—— البتہ یہ بعد میں چل کر معلوم ہوگا کہ اس سے ان کی شاعری کہاں تک محدود یا وسیع ہوئی یا ان کے یہاں کتنی گہرائی اور کتنا ہلکا پن ہے لیکن اس بات کو تو ماننا ہی پڑے گا کہ حسرت نے اپنے عشق کے اظہار میں ہمیشہ خلوص اور سچائی سے کام لیا۔ انھوں نے اپنی عشقیہ شاعری کے لئے قافیہ و ردیف یا پرانے شعراء کے دواوین کے بجائے خود اپنی حیات معاشقہ سے مواد لیا اور اپنے ہی کاروبار دلفروشی و دلداری کی تصویریں پیش کیں۔ دوسرا موضوع ان کے یہاں تصوف ہے۔ حسرت کی زندگی اور ان کے مشاغل کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ کوئی صوفی نہ تھے اور نہ انھیں باشعور طریقے پر تصوف کو اپنا کر اس پر عامل ہونے اور اپنے دل کو جذب و سرور سے مملو کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ محض بڑے بڑے صوفیوں سے عقیدت رکھتے تھے اور ہر سال اجمیر شریف، کلیر شریف، بہرائچ، فرنگی محل اور دوسرے مقامات پر جا کر صوفیائے کرام کے عرسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان کی شاعری میں صرف اسی عقیدت مندی کے اظہار کا نام تصوف ہے۔ وہ اس سے آگے نہیں بڑھتے وہ یہ بھی کر سکتے تھے کہ اسی عقیدت کی بنا پر تصوف کے اسرار و رموز کو کتابوں سے سیکھ کر اپنی شاعری میں پیش کرتے اور اصطلاحات کے جال پھیلا کر اپنی صوفیانہ شاعری میں اضافہ کر لیتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ اپنی زندگی سے ہٹ کر اپنے جذبات سے علٰحدہ ہو کر کوئی کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ رنگ ان کی عشقیہ شاعری کے مقابلہ

میں پھیکا ہے لیکن ایسا ہونا ناگزیر تھا کیونکہ محبت اور اظہارِ عقیدت میں پھر بھی فرق ہے۔ اب رہ جاتی ہے ان کی سیاسی شاعری۔ ان کا یہ رنگ اور بھی پھیکا اور بے جان ہے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حسرتؔ خود تو اتنے بڑے سیاسی آدمی تھے۔ بارہا جیل میں چکی پیسی اور پولیس کے کوڑے کھائے لیکن ان کی سیاسی شاعری رسمی اور پھس پھسی ہے۔ اس میں شدتِ احساس، جذباتی وفور یا سیاسی شعور نہیں ملتا۔ اگر انھوں نے زندگی کی شاعری کی تو کیا وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ان کی زندگی کا یہ پہلو پورے طور پر اپنا عکس نہ دکھا سکا۔ یہ سوال دراصل بڑا اہم ہے اور واقعی حیرت ہوتی ہے کہ وہی حسرتؔ جن کی زندگی میں ہندوستان نے کتنی کروٹیں لیں۔ کانگرس کی ابتدائی تحریکِ آزادی سے لیکر جنگِ عظیم، جلیان والا باغ، مسجد شہید گنج، کان پور کا حادثہ، تحریکِ خلافت، ستیاگرہیں، مسلم لیگ کی تحریک، دوسری جنگِ عظیم، قحطِ بنگال، تقسیمِ ہند، فسادات اور نہ جانے کتنے واقعات جنھیں ہندوستان کے بنانے اور بگاڑنے میں بڑا دخل ہے حسرتؔ ہی کے زمانہ میں پیش آئے اور حسرتؔ خود اس میں ذاتی طور پر شریک رہے لیکن حسرتؔ کی شاعری میں ان واقعات کی گرمی، خون اور دھمک کہیں محسوس نہیں ہوتی۔ انھوں نے تلک، ڈاکٹر انصاری یا بعض سیاسی رہنماؤں کے بارے میں جو نظمیں لکھی ہیں وہ بہت ہی رسمی انداز میں لکھی گئی ہیں جیسے کسی کا سہرا لکھ دیا جائے۔ وہ نقاد جو کسی شاعر پر لکھتے وقت محض اس کے زمانہ کے حالات اور سماجی پس منظر پر ہی نگاہ رکھتے ہیں یہاں بڑی دشواری میں مبتلا ہو جائیں گے۔ آخر حسرتؔ کے بارہ میں کیا فتویٰ صادر کیا جائے۔ کیا وہ رجعت پسند شاعر تھے کہ زمانہ کی طرف سے آنکھ بند کر کے اپنی محبوبہ کی یاد میں مبتلا رہے۔ کیا وہ قومی ترقی اور آزادی کی تحریک میں دل سے حصہ نہیں لے رہے تھے۔

میرا خیال ہے حسرتؔ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس بات کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ان کے خلوص پر شبہ کرے۔ انھوں نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں جو قربانیاں دی ہیں ان کا اعتراف نہ کرنا بڑی بے ایمانی ہوگی لیکن ان کی شاعری کو پڑھتے اور اس پر رائے دیتے وقت ذرا صبر سے کام لینا پڑے گا۔ حسرتؔ مخلص تھے، سچے تھے، رجعت پسند نہیں بلکہ بڑے ترقی پسند اور انسانیت کے لئے بڑے مفید تھے لیکن شاعری پر انسان کے اُس شعور کا اثر پڑتا ہے جو اس کے مزاج اور اس کی شخصیت کا پروردہ ہوتا ہے اور اگر کوئی نقاد شاعر کے مزاج کو سمجھ لے اور اس کے شعور کا تجزیہ کر لے تو اس کی شاعری کے محرکات اور اس کے موضوعات کی نوعیت کو بہت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ دراصل خارجی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے تو انکار ممکن ہی نہیں لیکن خارجی دنیا کا عکس ہر شاعر پر اس کے شعور کے اعتبار ہی سے پڑتا ہے۔ ایک آدمی آزادی و انقلاب کی جنگ میں ایک مخلص سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے کے باوجود آزادی اور انقلاب کے ادراک سے محروم ہوتا ہے اور اس کے شعور میں اسے جذب کرنے اور اس کی تہوں تک پہونچنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے جسم و جان کو اس راہ میں قربان کرنا تو ضروری سمجھتا ہے لیکن اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ یہ راہ کس طرح متعین کی جائے، اس میں کون کونسی مہرے اور چالیں ہیں، کن ہتھیاروں سے کام لیا جائے کہ دشمن پر فتح حاصل ہو، کب قدم پھونک کر رکھنا ہے اور کب تیز گامی کی ضرورت ہے۔ اسے تو صرف آزادی سے محبت ہے اور وہ اس کا ایک جاں نثار سپاہی ہے۔ اس سپاہی کے خلوص کی بھی تعریف کی جائے گی لیکن اس کے شعور و ادراک پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک آدمی جو آزادی اور انقلاب کے لئے اتنی قربانیاں نہیں دے سکتا لیکن وہ اس سے الگ رہتے ہوئے بھی اسے اپنے شعور میں جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر خلوص ہے تو وہ اس جذبہ کو شدت سے محسوس کر سکتا ہے اور اسکے ادراک پر ہم زیادہ بھروسہ کر سکتے ہیں۔ حسرتؔ اور اقبالؔ دونوں کی شاعری کو پڑھئے تو پتہ چلے گا کہ صرف شخصیتوں کے فرق نے ایک سیاسی آدمی کو محبت کا شاعر اور ایک غیر سیاسی اور گوشہ نشین شخص کو قوم و ملک، آزادی و سیاست اور انسانیت کا شاعر بنا دیا۔ حسرتؔ کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں لیکن ان کی شخصیت میں وہ عناصر نہیں تھے جو ایک شخص کو مدبر، سیاست داں، مفکر و فلسفی اور مسائلِ حیات کا ادراک رکھنے والا بنا دیتے ہیں

۲ ان کی سیاسی زندگی سے جو لوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حسرتؔ ایک سیاسی کارکن ہونے کے باوجود سیاسی سوجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے وہ پر خلوص مگر جذباتی آدمی تھے۔ بہت جلد کسی کے بارے میں کوئی رائے قایم کر لیتے تھے یہی وجہ ہے کہ سیاست میں وہ ہمیشہ ناکام رہے۔ ہر جماعت میں حزبِ مخالف کی سرداری انھوں نے کی اور ہر تجویز پر مخالفت میں دھواں دھار تقریریں کرنے کے لئے وہ مشہور تھے۔ کسی بات کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا، مصالح پر نظر رکھنا، ضبط و استقلال، حالات اور وقت کی رفتار کو پہچاننا اور اس کے تقاضوں کو سمجھنا مناسب موقعہ پر قدم اُٹھانا، یہ حسرتؔ کی سیاست میں شامل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انھیں ایک سچا اور وفادار مجاہد یا سپاہی کہہ سکتے ہیں لیکن باشعور

سیاست داں نہیں۔ ظاہر ہے کہ سپاہی لڑ تو سکتا ہے لیکن جنگ پر باشعور طریقے سے نظر نہیں ڈال سکتا۔ بلکہ اس کو تو اپنی کٹھن منزلوں اور صعوبتوں میں اپنے ماضی کی سنہری یاد کے سہارے ہی دل بہلاتا ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ حسرت جو بڑھاپے تک عشقیہ شاعری کرتے رہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

حسرت کی شاعری کی ایک خصوصیت ایک تو یہی ان کی سچائی ہے۔ دوسری خصوصیت اس کا سادہ و عام فہم ہونا اور بہت جلد متاثر کرنا ہے۔ شعر کے متعلق ان کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ:

شعر دراصل ہیں وہی حسرت سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

اس میں شک نہیں کہ ان کے اشعار سنتے ہی ہم ان کی نرمی و ملائمت، معصومی اور لطافت سے اتنا متاثر ہو جاتے ہیں کہ ہم پر اس کا ایک خوشگوار اثر ہوتا ہے۔ ان کے یہاں نہ تو پیچیدگی ہے اور نہ زبان و بیان کے پیترے اور صنائع، بدائع کے پیچ و خم جو قاری کو الجھاوے میں ڈال دیں یا اسکی طبیعت میں کسی قسم کا تکدر پیدا کریں۔ ایک اچھے غزل گو کی حیثیت سے ان کی یہ خصوصیت بڑی قابل قدر ہے لیکن ان کی یہی خصوصیت ان کو بڑا بننے سے روکتی بھی ہے۔ سنتے ہی دل میں اتر جانے والے اشعار پسندیدہ ہو سکتے ہیں لیکن ان میں کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ بڑے شاعر کا شعر ذرا مشکل سے گلے کے نیچے اترتا ہے۔ ہم اس سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ یہ کوئی بڑی بات ہے اور نہ جانے کتنی منزلوں سے گزرنے اور کتنے زہر کو ہضم کرنے کے بعد شاعر نے کہی ہے۔ اس میں ایک عرفان و آگہی، ایک پرواز، ایک سوچ اور زندگی کی تہوں میں ڈوب کر کوئی راز معلوم کرنے کی کیفیت ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اوسط درجے کی ذہانت اور استعداد کا آدمی شاعر کے ساتھ ان بلندیوں پر ذرا مشکل سے جا سکتا ہے اور اس کے جذبات سے ہم آہنگ ہونے میں دیر لگتی ہے۔ ایسا شعر کہنے کے لئے جہاں زندگی کے زبردست ادراک اور کلچر کے تمام عناصر کو جذب کرنا پڑتا ہے اور اپنے ذہنی معیار کو ایک خاص سطح پر لانا پڑتا ہے۔ جرأت، داغ، یا جگر کے اشعار جلد پر ایک جھرجھری سی پیدا کر دیتے ہیں، اختر شیرانی کی نظمیں ہمیں رنگین وادیوں اور گنگناتے ہوئے لالہ زاروں میں پہونچا دیتی ہیں لیکن غالب اور اقبال کے اشعار اپنے اندر اس قسم کی کوئی کیفیت نہیں رکھتے۔ ان کی باتیں تو ایک لمحے کیلئے ہمیں بھونچکا کر دیتی ہیں اور ارضیت کے باوجود اس میں ایک ماورائیت کا احساس ہوتا ہے۔ معمولی ذہن کا آدمی ایسے اشعار کو مہمل یا مجذوب کی بڑ سمجھنے لگتا ہے مثلاً غالب جب کہتے ہیں کہ:

ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

تو یہ شعر دل میں اترتا نہیں بلکہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح جب ہم اقبال کے یہ اشعار پڑھتے ہیں کہ:

خدائی اہتمام خشک و تر ہے خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی استغفر اللہ یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

تو ہمارا ذہن تشکیک میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کیفیت تک پہونچنے کے لئے اپنے آپ کو بہت دیر تک تیار کرنا پڑتا ہے (حسرت کی شاعری کو میں نے جب بھی پڑھا ہے تو کسی اونچی سطح پر پہونچنے کے بجائے ایک نارمل سی کیفیت محسوس کی ہے۔ ان کی بہترین شاعری بھی صرف وجدان کی رہین منت ہے اور ظاہر ہے کہ صرف وجدان کے سہارے آج تک کبھی بڑی شاعری نہیں ہوئی ہے۔ بڑی شاعری وجدان اور فکر دونوں کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے فکر کا عنصر شاعری میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ساری جگر کاوی، شعور کی تربیت اور شخصیت کی تعمیر اسی کے لئے کرنی پڑتی ہے۔ وجدان کا شاعر صرف "حال" کا شاعر ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ اپنے آس پاس دیکھتا ہے اور جو اس کے دل پر یا اس کی ذات پر گزرتی ہے انھیں کے تاثرات کو وہ شعر کا جامہ پہنا دیتا ہے لیکن بڑا شاعر، ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کا شاعر ہوتا ہے کیونکہ ایک طرف تو وہ ماضی کے کلچر اور انسانی تاریخ کی بہترین روایات کو اپنے شعور میں جذب کرتا اور اپنی شخصیت میں رچاتا ہے دوسری طرف وہ اپنے شعور کی بنا پر اپنے سامنے پھیلی ہوئی کائنات کو بھی چھوتا ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح وہ اپنے انفرادیت کے چوکھٹے سے نکل کر اجتماعی احساس پیدا کر لیتا ہے اور اس غم کا عرفان حاصل کر لیتا ہے جسے بعض نقادوں نے "غمِ آفات" سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ عرفان شاعر کو حاصل ہو جائے تو اس کے پاؤں کیچڑ میں ہوتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ ستاروں کی طرف بڑھے گا،

یعنی موجودہ دنیا کی گندگیاں، اس کی تاریکیاں، اس کی محرومیاں اور ناکامیاں اس سے اس مقصد کو نہیں چھین سکیں گی جسے وہ پانا چاہتا ہے یا جہاں اس کی نظر پہونچ رہی ہے۔ یہیں سے دراصل وہ مستقبل کا شاعر ہو جاتا ہے۔

حسرت کے دیوان کا انتخاب کیا جائے اور ان کی شاعری کا وہ حصہ جو ان کا بہترین سرمایہ کہا جاتا ہے ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے تو سب سے پہلے جو بات ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ان کی آپ بیتی ہے۔ یہی ان کی خصوصیت بھی ہے اور یہی ان کا عیب بھی۔ حسرت کی شاعری کا عاشق متوسط طبقے کا ایک نارمل قسم کا نوجوان ہے جو اپنے ہی طبقے یا اپنے ہی خاندان کی ایک لڑکی کو چاہتا ہے۔ اس کے کچھ مادی اور جسمانی مطالبے ہیں جنھوں نے اسکے احساسات میں ایک ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ اس کی رگوں میں گرم خون کی روانی اور عنفوان شباب کی سرمستی ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کو پا لینے اور اسے اپنا بنا لینے میں کامیاب ہے۔ روزانہ کی زندگی میں کچھ چھیڑ چھاڑ اور آنکھ مچولی بھی ہے۔ عشق کی فضا اور یہ مرحلے کب تک قایم رہے ہوں گے۔ دو چار سال یا آٹھ دس سال یعنی سولہ سترہ سال سے لیکر پچیس تیس کی عمر تک رکھ لیجئے۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔ دونوں کی شادی ہوئی ہوگی، ازدواجی زندگی کے مسایل پیش آئے ہوں گے، اسے اپنے بچوں کی پرورش، ان کی تعلیم اور پھر ان کی شادی بیاہ کا انتظام کرنا پڑا ہوگا اور حسرت نے جتنی عمر پائی اس عمر میں ہندوستان کے ایک نارمل آدمی کے پوتے اور نواسے وغیرہ بھی ہو جاتے ہیں۔ اب حسرت کی شاعری پر نظر ڈالئے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی "آپ بیتی" بھی ان کی پوری زندگی کا احاطہ نہیں کرتی۔ سولہ سے پچیس سال کی عمر میں ان کو عشق کا جو تجربہ حاصل ہوا اسی تجربے کی بنا پر وہ عمر بھر شاعری کرتے ہیں اور انھیں جذبات و کیفیات کو نظم کرتے ہیں جو عنفوان شباب میں پیش آئی تھیں۔ اب آپ ہی بتایئے کہ اس کا مقابلہ ہم اس شاعری سے کس طرح کر سکتے ہیں جس میں نہ صرف شاعر کی زندگی اور اس کے ارد گرد کا ماحول سمٹ آتا ہے بلکہ اس کی گرفت میں پوری کائنات اور زمان و مکان کی سرحدیں آجاتی ہیں۔

حسرت کے کلام کا جب بھی میں نے مطالعہ کیا ہے تو اس سے پورے طور پر لطف اندوز ہوتے اور اس کی قدر کرتے کے لئے میں نے حسرت کی بڑائی کے سوال کو چھوڑ کر اور میر، غالب یا اقبال سے علحدہ کرکے ان کو اردو کے ان شاعروں کے ساتھ رکھا ہے جو ہیں تو صف دوئم کے غزل گو لیکن ان کی شاعری میں بعض ایسی لطافتیں اور کیفیات ہیں اور انھوں نے ہماری غزل کو کچھ ایسی روایتیں دی ہیں جن کو باقی رکھنے اور ان کے امکانات کو اُبھارنے کی ضرورت ہے۔ میں ان شاعروں کا بڑا مداح اور معترف ہوں۔ یہ شاعر ہیں مصحفی، قائم اور مومن۔ کبھی کبھی جی چاہے تو اس صف میں آسی غازی پوری، شیفتہ اور حالی کو بھی رکھ لیجئے اگرچہ موخر الذکر شعراء کی کچھ علحدہ خصوصیات ہیں جو ان کی غزلوں میں ٹھہراؤ، رکھ رکھاؤ اور اعتدال پیدا کر دیتی ہیں یا ان کی شرافت اور سنجیدگی مصحفی، قایم و مومن کی طرح غزلیت کے عناصر کو اتنا اجاگر نہیں کرتی جتنا ان شعراء کی شخصیت کے لوازم کو ظاہر کرتی ہے۔ بہر حال مصحفی، قایم اور مومن سے حسرت کا سلسلۂ نسب آسانی سے جوڑا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ حسرت کو پڑھئے تو مزہ بھی آتا ہے، اور ایک روایت سے دوسری روایت کے پروان چڑھنے اور ایک چراغ سے دوسرے چراغ کے جلنے کا سماں ہمارے سامنے اُردو غزل کے بڑے اچھے سرمائے کو پیش کرتا ہے۔ حسیات اور لمسیت کی شاعری کو ان شعراء نے جتنا نکھارا ہے اتنا کسی اور نے نہیں۔ پھر محبوب کی نفسیات اور عشقیہ زندگی کے ماحول اور اس کی فضا کی تصویر کشی کے لئے ہمیں انھیں شعراء کی غزلوں سے مثال تلاش کرنی پڑے گی۔ لمسیاتی شاعری کے لئے اگر مصحفی اپنا جواب نہیں رکھتے تو محبوبہ کی نفسیات کو اس طرح پیش کرنا کہ اس کا سراپا اور اس کے کردار کے خد و خال واضح ہو جائیں، اس خصوصیت میں حسرت منفرد ہیں۔ حسرت کے اس قبیل کے اشعار کا ایک بہت بڑا انتخاب تیار ہو سکتا ہے۔ میں صرف چند اشعار پیش کر رہا ہوں:۔

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے ——— ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا
ہو کے نادم وہ بیٹھے ہیں خاموش ——— صلح میں شان ہے لڑائی کی
دیکھا جو مجھے گرمِ نظر بزمِ عدو میں ——— وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر
مجھے گرمِ نظارہ دیکھا تو ہنس کر ——— وہ بولے کہ اس کی اجازت نہیں ہے
ٹوکا جو بزمِ غیر میں آتے ہوئے انھیں ——— کہتے بنا نہ کچھ وہ قسم کھا کے رہ گئے
گرچہ ہے پردۂ انکار میں ہمشکل عتاب ——— پھر بھی ہے صاف نمایاں وہ اجازت کی نظر

آہ کہنا وہ ترا پاکے مجھے گرم نظر　　ایسی باتوں سے نہ ہو جائیں میں بدنام کہیں

ان اشعار میں خیالات کی فوٹوگرافی نہیں ہے بلکہ ایک "عمل" کو شاعر نے اس طرح مقید کیا ہے کہ محبوب کی نفسیات کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ محبوب کے جسم کو بھی حسرت نے اپنی شاعری میں کافی جگہ دی ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ رنگ، آواز، لباس، خوشبو اور دوسری چیزوں کو جس طرح مصحفی پیش کرتے ہیں وہ بات حسرت کے یہاں نہیں آتی۔ حسرت صرف ان کا ذکر کرتے ہیں لیکن مصحفی اس میں ایک کیفیاتی رچاؤ بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً مصحفی کے اسی شعر کو لیجئے:-

کسی کو گرمیٔ تقریر سے اپنے لگا رکھا　　کسی کو منہ چھپا کر نرمیٔ آواز سے مارا

یہ حسیاتی کیف حسرت کے یہاں نہیں ہے پھر بھی حسرت کا حسیاتی شاعری میں جو سرمایہ ہے وہ یاد رکھے جانے والی چیز ہے۔ اس میں ایک طرح کا تندرست رجحان بھی ملتا ہے جو صحت مندی کی علامت ہے اور لکھنؤ کی اس شاعری کے مقابلہ میں اسے زیادہ رواج دینے کی ضرورت ہے جہاں زلف و کمر کے ذکر میں شاعروں نے رکاکت اور ابتذال کا مظاہرہ کیا ہے۔

حسرت کا رشتہ مصحفی، قائم اور مومن سے جوڑنے کے بعد جہاں مجھے ان کی غزل گوئی کے بعض بنیادی عناصر کا پتہ چلا وہاں ایک بات ہمیشہ کھٹکتی رہی ہے جس کا اظہار بھی اس موقعہ پر ضروری سمجھتا ہوں۔ مصحفی، قائم، مومن اور اُردو کے دوسرے اچھے غزل گویوں کے یہاں موضوع سے قطع نظر غزل کا ایک خاص مزاج اور اس کا کینڈا ہے۔ اس کی تھوڑی سی تشریح ضروری ہے۔ بعض لوگ غزل کو محض ٹکنیک کے اعتبار سے دیکھ کر یعنی ردیف، قافیہ اور مطلع و مقطع کو سامنے رکھ کر ہی اسے اور اصناف سے علٰحدہ کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ غزل کو نظم یا مثنوی سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ غزل کا ٹھہراؤ اور اس کے ہر شعر کا اپنی جگہ پر مکمل اور بھرپور ہونا ہے، بھرپور وار غزل کے شعر کے لئے ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ داخلی تجربات کے پیش کرنے میں بھی شاعر کو جلد بازی نہ کرنا چاہئے بلکہ اسے ہضم کرنے کے بعد اس طرح پیش کیا جائے کہ اس میں ایک طرح کی تعمیم پیدا ہو جائے، حسرت کے اشعار خود ان کی ذات سے اتنا چمٹ جاتے ہیں کہ وہ کبھی "غیر شخصی" ہوتے ہی نہیں، دوسرے یہ کہ انکا وار بھی بھرپور نہیں ہوتا۔ انکے یہاں عام طور پر پوری غزل پڑھنے کے بعد ہی ان کے اشعار سے لطف اُٹھایا جا سکتا ہے۔ جو بات یا جو کیفیت پہلے شعر میں ملتی ہے اس کی تشریح یا تفصیل کے لئے باقی اشعار کہے گئے ہیں۔ اس طرح بارہا مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ حسرت کی غزلیں "نظم یا" "غزل نما نظم" ہیں۔ ضبط اور ٹھہراؤ کے بجائے جذبات میں ہیجانی کیفیت غزل کے لئے بڑی تباہ کن ہے۔ یہ کیفیت شاعر سے رومانی نظم تو کہلوا سکتی ہے لیکن غزل نہیں۔ حسرت اس ہیجانی کیفیت پر قابو نہیں پا سکے جس کی وجہ سے ان کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ مجھے ان کی "نظمیت"، کھٹکتی رہی ہے۔ ان کے دیوان میں وہ تمام غزلیں دیکھ ڈالئے جو حسرت کی منتخب اور نمایندہ غزلیں ہیں، جن میں ان کی حیات معاشقہ کا پورا سرمایہ ہے اور جن سے اشعار نکال نکال کر ہم ان کی داستان کو مکمل کرتے ہیں وہ سب دراصل نظمیں ہیں۔ نظم میں وحدت کا تاثر یا ایک موڈ کا ہونا کوئی عیب نہیں، لیکن حسرت کے یہاں تو جو بات پہلے شعر میں ہے اسی کے متعلقات کے بیان کے لئے یا اس کی فضا کو مکمل کرنے کے لئے بقیہ اشعار کہے گئے ہیں، اس لئے ان غزلوں پر اگر آپ عنوان رکھ دیں تو یہ آسانی سے نظمیں کہی جا سکتی ہیں۔ حسرت کی کامیاب غزلوں کے پہلے شعر نقل کر دینا یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، اس سے حسرت کی شاعری کے متعلق ایک دلچسپ بات معلوم ہوگی یعنی ان کے یہ مطلعے ان غزلوں کے بارے میں اسی طرح بتاتے ہیں جس طرح نظم کا عنوان۔ نظم کے موضوع، اسکی کیفیت اور اس کے تاثر کی غمازی کرتا ہے۔

مطلعوں کی جو فہرست میں نے تیار کی ہے وہ یہ ہے:-

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا　　باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے　　ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

یاد ہیں سارے وہ عیشِ با فراغت کے مزے　　دل ابھی بھولا نہیں آغازِ اُلفت کے مزے

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا　　کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام — دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

بدلِ لذتِ آزار کہاں سے لاؤں — اب تجھے اے ستمِ یار کہاں سے لاؤں

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں — دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں

گرفتارِ محبت ہوں اسیرِ دامِ محنت ہوں — میں سوائے جہانِ آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں — الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے — وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

لایا ہے دل پر کتنی خرابی — اے یار تیرا حسنِ شرابی

روشِ حسن مراعات چلی جاتی ہے — ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جایئے — بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے

اے گریۂ محرومی تو جانِ محبت ہے — تو جانِ محبت ہے ایمانِ محبت ہے

محبوبی و رنگینی ہے جزوِ بدن تیری — سرشارِ محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

ستم ہو جائے تمہیدِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے — محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے

دل میں کیا کیا ہوسِ دید بڑھائی نہ گئی — روبرو ان کے مگر آنکھ ملائی نہ گئی

جذبِ کامل کو اثر اپنا دکھا دینا تھا — میرے پہلو میں انھیں لا کے بٹھا دینا تھا

محوِ طرب ہے دلِ دلگیر ابھی تک — باقی ہے ترے عشق کی تاثیر ابھی تک

آج سن کر میرے نالوں کو ز راہِ التفات — زیرِ لب اس نے بھی کھینچی ایک آہِ التفات

تمہیدِ صلحِ شوق کے ساماں ہو گئے — جتنے تھے ان کے جور سب احساں ہو گئے

تاثیرِ برقِ حسن جو ان کے سخن میں تھی — اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے — مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے

دلِ مایوس کو گرویدۂ گفتار کر لینا — وہ ان کا پردۂ انکار میں اقرار کر لینا

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا — اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا

حائل تھی درمیاں میں رضائی تمام شب — اس غم میں ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

چھپ نہیں سکتی چھپائے سے محبت کی نظر — پڑ ہی جاتی ہے رخِ یار پہ حسرت کی نظر

ہر دل میں اک ہجومِ محبت ہے آج کل — اس شوخ کی کچھ اور ہی صورت ہے آج کل

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں — جل دے حوصلۂ دید مجھے تمام کہیں

بلاکشانِ غمِ انتظار ہم بھی ہیں — خرابِ گردشِ لیل و نہار ہم بھی ہیں

گھٹے گا تیرے کوچے میں وقار آہستہ آہستہ — بڑھے گا عاشقی کا اعتبار آہستہ آہستہ

اس محوِ تغافل کی جفا میرے لئے ہے — صد شکر کہ اتنا تو روا میرے لئے ہے

شبِ فرقت میں یاد اس بے وفا کی بار بار آئی — بھلانا ہم نے بھی چاہا مگر بے اختیار آئی

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا — شغل بیکار ہیں سب ان کی محبت کے سوا

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا — شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگ جاں کے قریب — آن پہونچے ہیں اگر منزل جاناں کے قریب
روگ دل کو لگا گئیں آنکھیں — اک تماشا دکھا گئیں آنکھیں
جاؤ جہاں عشق میں اک شور برپا ہے — جدھر دیکھو تمہارے حسن روزافزوں کا چرچا ہے
وہ راتوں کا آنا ہے نہ وہ دن کا بلانا ہے — خفا ہو کر انھیں مد نظر میرا ستانا ہے
ہو گا پڑے جو آپ کے در سے جدا مجھے — دنیا میں اس گھڑی کو نہ رکھے خدا مجھے
ان کو جو شغل ناز سے فرصت نہ ہو سکی — ہم نے یہ کہہ دیا کہ محبت نہ ہو سکی
دیکھنے کو آئے ہیں کوٹھے پہ وہ کالی گھٹا — جھومتی پھرتی ہے کیا کیا ہو کے متوالی گھٹا
سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم — ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
عشق بتاں کو جی کا جنجال کر لیا ہے — آخر یہ میں نے اپنا کیا حال کر لیا ہے
عاشقوں سے ناروا ہے بے وفائی آپ کی — حد سے بڑھ جائے نہ شان کج ادائی آپ کی
کوچہ اس فتنۂ دوراں کا دکھا کر چھوڑا — دل نے آخر ہمیں دیوانہ بنا کر چھوڑا
وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ رہتے تھے بہم دونوں — نہ تھے آگاہ آزار غم فرقت سے ہم دونوں
جفا تیری بہت اے بے مروت بڑھتی جاتی ہے — ہمیں بھی خواہش ترک محبت بڑھتی جاتی ہے
جب سوا میرے نہ تھا کوئی نشانا تیرا — یاد ہے مجھ کو ابھی تک وہ زمانہ تیرا

اس فہرست میں پہلا مطلع ان کے پہلے دیوان سے اور آخری مطلع ان کے بارھویں دیوان کے ضمیمے سے لیا گیا ہے اور یہ غزل ۹ ستمبر ۱۹۴۱ء کی لکھی ہوئی ہے۔ حسرت کی ان غزلوں میں اگر ان کے مزاج کو تلاش کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے یہاں ابتدا میں جو ہیجانی کیفیت تھی وہ آخر عمر تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی اور یہی دراصل سبب ہے ان کی غزلوں کی نظمیت کا بھی اور ان کی شاعری کے محدود ہونے کا بھی۔ شروع شروع میں تقریباً ہر شاعر اپنی ذاتی زندگی ہی کو اپنی شاعری کا موضوع بناتا ہے اور اپنے ہی ردعمل کو پیش کرتا ہے لیکن وہ شعرا جن میں ہیجان کے بجائے ضبط ہوتا ہے وہ اپنے جذبات کو جوں کا توں بیان نہیں کر دیتے بلکہ اسے ہضم کرنے کے بعد اسے ایک نئی صورت دے دیتے ہیں، یوں کہئے کہ دوبارہ تخلیق کرتے ہیں۔ یہیں سے دراصل شاعر کو عرفان نصیب ہوتا ہے جو اس کو اپنی ذات کے دائرے سے نکال کر دنیا کے ہجوم میں لا کھڑا کرتا ہے اور وہ دوسروں کے غم کو بھی سمجھنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے غزل گو شاعر عمر کے ساتھ ساتھ گمبھیر ہوتے جاتے ہیں اور ان کی آواز میں ایک برگزیدگی اور رچاؤ آتا جاتا ہے۔ میر اور غالب کو تو خیر چھوڑیئے کیونکہ ان کے یہاں تو شروع ہی سے حیرت و استعجاب اور تفکر کے عناصر ملتے ہیں اور آخر تک پہونچتے پہونچتے وہ پیغمبرانہ قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں لیکن مصحفی، قائم، مومن اور اردو کے دوسرے غزل گویوں کے یہاں بھی زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تجربات کی نوعیت بدلتی جاتی ہے اور لب و لہجے میں بھی ٹھہراؤ آتا جاتا ہے۔ مومن جو ان غزل گویوں میں سب سے زیادہ عنفوان شباب کا ہیجان رکھتے ہیں وہ بھی "وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" والی منزل سے گزر کر ایک دن یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ:-

اے حشر جلد کر تہ و بالا زمین کو — کچھ بھی نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

اس شعر میں ان کے مزاج کی تلملاہٹ باقی ہے لیکن زندگی کا تجربہ گہرا ہو گیا ہے جس نے ان کے انداز بیان میں بیداری کر دی ہے ——— حسرت کی غزلوں کی فہرست ہمیں بتاتی ہے کہ حسرت "وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" والی منزل ہی پر رک جاتے ہیں۔ مومن کی یہ غزل بھی ایک طرح سے نظم ہی ہے اور حسرت کی غزلیں "یاد کرو وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا" سے چل کر "جب سوا میرے نہ تھا کوئی نشانا تیرا" تک پہونچتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حسرت اس ہیجانی کیفیت سے عمر بھر چمٹے رہے اس لئے ایک طرف تو وہ موضوع کے لحاظ سے سمٹ کر رہ گئے، دوسری طرف ان کی شاعری میں نکھار آنے کے بجائے پھیکا پن آ گیا اور ان کی آواز دن بدن پتلی ہوتی گئی۔ ان کے پہلے دیوان سے ان کے کلام کا مطالعہ شروع کیجئے تو تیسرے چوتھے دیوان

تک پہونچتے پہونچتے حسرت کچھ مدھم ہونا شروع ہوتے ہیں اور گیارھویں بارھویں دیوان تک پہونچتے پہونچتے وہ بالکل بجھ جاتے ہیں۔ ادھر دس بارہ سال سے اپنی زندگی ہی میں بحیثیت شاعر کے ان کا رول تقریباً ختم ہو گیا تھا اور اس میں کسی قسم کے امکان کی گنجایش نہ رہی تھی۔ کبھی کبھار جو غزلیں کہتے تھے وہ رسمی اور بے جان ہوتی تھیں جنھیں تبرکاً پڑھا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے اردو کے کسی اچھے شاعر کا انجام اتنا حسرتناک نہیں ہوا۔ اسی لئے جب ہم اردو غزل میں اس قسم کے اشعار پاتے ہیں کہ:-

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں (میر)

کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی، — امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی (فراق)

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے — اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا (یگانہ)

تو حسرت کی غزل بحیثیت غزل کے مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔ اردو کے بعض غیر معروف شعراء نے بھی اپنے جذبات کو ہضم کر کے اور اپنے ہیجان پر قابو پاکر جب شعر کہا ہے تو اس مقام پر پہونچ گئے ہیں کہ:-

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی — دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اس ایک شعر میں کلچر کی روح کو جس طرح سمویا گیا ہے اس کے مقابلے میں تاثراتی اور ہیجانی نظموں یا غزلوں کا دیوان کھلونا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اب ایک بات حسرت کے بارہ میں اور رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جدید اردو غزل کے موجد حسرت ہی ہیں۔ حسرت کے ساتھ بعض لوگ ان کے تین ہمعصروں کا نام اور لیتے ہیں یعنی فانی، اصغر اور جگر کا۔ جہاں تک اردو غزل کا احیاء اور اس کو دوبارہ مقبول بنانے کا تعلق ہے، حسرت اور ان کے بعض معاصرین کے کارنامے سے کوئی انکار کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان شعراء کے یہاں قدیم غزل گوئی سے ہٹ کر کچھ نئے امکانات بھی ملتے ہیں جنھیں ہم صرف موجودہ دور کی پیداوار کہہ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا جواب نفی میں ملے گا۔ مولانا حالی کی جدید شاعری کی تحریک کے بعد لوگوں میں غزل سے بیزاری ضرور پھیل گئی تھی لیکن غزل ختم نہیں ہوئی تھی۔ ایک طبقے میں یہ اب بھی مقبول تھی، حالی کی اصلاحی تحریک کے بعد بھی داغ، امیر مینائی، ریاض خیرآبادی، حفیظ جونپوری، جلیل مانک پوری، مضطر خیرآبادی، جلال لکھنوی، شاد عظیم آبادی، بیخود دہلوی، سائل دہلوی اور بہت سے شعراء غزل ہی میں دلو سخن دے رہے تھے اور حسرت کی غزل گوئی کا جب دور شروع ہوتا ہے تو اسی کے لگ بھگ لکھنؤ میں عزیز، صفی، محشر، ثاقب اور آرزو بھی غزل کے ناز برداروں میں تھے لیکن اتنا ضرور ہے کہ غزل کی شاعری کو محض مشاعرے سے وابستہ کر دیا گیا تھا۔ مصرع طرح پر طبع آزمائی ہو رہی تھی اور جذبات و احساسات سے اپنا رشتہ توڑ کر سارا زور انداز بیان اور زبان و محاورے کی باریکیوں پر صرف ہو رہا تھا جس کی وجہ سے قومی بیداری کے زمانے میں اس کی کوئی افادیت نظر نہ آتی تھی۔ مجھے جہاں تک یاد پڑتا ہے میں نے اس زمانہ کا کوئی رسالہ ایسا بھی دیکھا ہے جس میں مشاعرے میں پڑھی جانے والی تمام غزلوں کو اس طرح شایع کیا جاتا تھا کہ ہر قافیہ کو عنوان کے طور پر لکھ دیتے تھے اور اس کے بعد اس قافیے میں مختلف شعراء نے جو شعر نکالے ہیں انھیں درج کیا جاتا تھا جب غزل کا مقصد صرف کرتب رہ گیا ہو تو اس کے مقابلے میں اگر حالی کی اصلاحی تحریک کے پروردہ اسمٰعیل میرٹھی، چکبست، سرور جہان آبادی، نادر کاکوروی اور نوبت رائے نظر وغیرہ کی مناظر فطرت یا حب وطن سے متعلق نظموں کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حسرت اور ان کے معاصرین نے اس میں کلام نہیں کہ غزل کو پھر ایک بار سوسائٹی میں باعزت بنایا۔ اس کی اہمیت کو منوایا اور اس پر جو "ذات باہر" کا لیبل لگا دیا گیا تھا، اسے چھڑایا۔ یہاں تک میں ان کی اہمیت اور ان کے تاریخی رول کو مانتا ہوں لیکن اس کے بعد نہیں۔ حسرت کی غزل میں "نظمیت" کے عناصر کا پہلے ذکر آ چکا ہے اور موضوع کے بارے میں بھی اپنی رائے دے چکا ہوں کہ میرا اور مومن کی مثنویوں اور زہر عشق کی عشقیہ دنیا سے ملتی جلتی ایک آپ بیتی کو حسرت نے اپنی غزل میں جگہ دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جدید اردو غزل کی علامت نہیں ہے۔ اب رہے فانی، اصغر اور جگر ان میں سے تھوڑا بہت فانی کا میں قایل ہوں یعنی جہاں تک غزل کے لب و لہجہ کا تعلق ہے ان کو میں حسرت سے اچھا غزل گو سمجھتا ہوں۔ ان کے یہاں وہ ضبط اور ٹھیراؤ اور وہ وسعت تعمیم بھی ہے جو غزل کے لئے ضروری ہے اور ان کی آواز میں وہ بھاری پن بھی ہے جو میر اور غالب کی آواز ہے۔ فانی کا موضوع اگر وسیع ہوتا اور ان کے نظریۂ حیات میں صحت مند عناصر ہوتے تو میرا خیال ہے وہ غزل میں میر اور غالب کا معیار قایم

رکھ سکتے تھے۔ اصغر کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ وہ صاف ستھرے اور دامن بچا کر چلنے والوں میں تھے۔ ان کی غزل میں فحش اور ابتذال شعر ایک بھی نہیں ملتا، یہ قابل تعریف بات ہے، باقی ان کے اندر کوئی خصوصیت نہیں۔ ان کی شاعری زندگی سے اتنی دور ہے کہ کبھی کبھی احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ عمر بھر بیٹھے ہوئے کاغذ پر بیل بوٹے بناتے رہے۔ جگر کو میں جدید غزل گویوں میں سب سے کمتر سمجھتا ہوں کیونکہ ایک طرف تو انھوں نے داغ اسکول کی شاعری کا پرچار کیا اور "کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی" یا "گوری گوری کلائیاں توبہ" والی شاعری کا چٹخارہ پیدا کر کے لوگوں کا مذاق خراب کیا۔ دوسری طرف زبان اور فن کو بھی انھوں نے نقصان پہونچایا نئی نسل میں زبان اور فن کی طرف سے جو بے راہ روی پھیلی ہے اس کی بہت کچھ ذمہ داری جگر پر ہے کیونکہ ان کا کلام ایک طرف تو اغلاط سے پُر ہے اس پر طرہ یہ کہ زبان و بیان کی ان غلطیوں پر یہ نوٹ دیا جائے "کہ" یہ میرے نزدیک جائز ہے"۔ جہاں تک ان کے شعور اور ان کے موضوعات کا تعلق ہے اس میں بھی وہ سب سے پیچھے ہیں۔ ضبط اور گہرائی پیدا کرنے کے بجائے سلونے اور چٹپٹے انداز پر ہی انھوں نے سارا زور صرف کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی غزلیں قوالی کے طرز پر گانے یا "مشاعرہ لوٹنے کے لئے" تو بہت کار آمد ہیں لیکن اس سے جدید اُردو غزل یا نئے شعور کو کوئی فایدہ نہیں پہونچا۔ ادھر انھوں نے زمانے کا رنگ دیکھ کر سیاسی مضامین کو بھی اپنی غزلوں میں لانا شروع کیا لیکن سیاسی شعور کے بغیر اس قسم کی شاعری کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ غزل کے دائرے سے بھی نکل آئے ہیں اور جو کچھ دل سہا انداز ان کے پاس تھا اسے بھی چھوڑ رہے ہیں۔

یہاں تک لکھنے کے بعد سوچتا ہوں کہیں میری ان باتوں سے لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں حسرت کو بالکل ہی گئے گزرے شاعروں میں سمجھتا ہوں اور ان پر خواہ مخواہ کی نکتہ چینی کر کے ان کی عظمت پر حرف رکھ رہا ہوں۔ یہ بات بالکل نہیں۔ میں دراصل یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ کسی شاعر کو اس کی اپنی جگہ پر رکھ کر ہمیں اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنا چاہئے اور اس کی شاعری سے لطف اندوز ہونا چاہئے یعنی حسرت جو کچھ ہیں وہی کہئے۔ ان کی شاعری میں جو خوبیاں ہیں انھیں کا ذکر کیجئے۔ ان کا دوسرا نام رکھنے یا ان کی خوبیوں کو کچھ اور کر کے پیش کرنے سے حسرت کی صحیح قدر دانی نہ ہو سکے گی۔

بیاضِ حسرت موہانی

بابا سے فغانی

دل بیفرار و دیدنِ دیدار مشکل است — گر تو ترحمے نکنی کار مشکل است
وا سے کہ تلخ شد دو ابر دل پر گزند ما — مرگ بود نہ زندگی دارو سود مند ما

بہار دالاد ما ہے و پیالہ گزشت — پیالہ نکشیدیم و دور لالہ گزشت
ماتم نشست و کوکب سود شد بلند — صد نیزہ در حوالی مانورِ شد بلند
معشوق در کنار و دہد روشنی بچشم — زاں آتشم چہ سود کہ از دور شد بلند

ملک فطرت کاشی

از بہار دیگراں گلہائے باغم تازہ شد — ہر کرا دیدم کہ داغے داشت داغم تازہ شد
بسکہ خود بے بہرہ ام شادم ز عیش دیگراں — ہر کرا جامے بلب دیدم دماغم تازہ شد

کمال اسمٰعیل

بے یا و سراں دشت خوں آشامی — مردند ز حسرت و غم ناکامی
محنت زدگانِ وادیِ عشق ترا — ہجراں کُشد و اجل کُشد بدنامی

اصلاحاتِ حسرت

(شفیق صدیقی جون پوری)

سلطان تغزل استادی حضرت مولانا حسرت موہانی علیہ الرحمہ کا طریقۂ ''اصلاح'' عام اساتذہ سے بالکل مختلف تھا، اولاً تو مولانا کو شاگرد بنانے کا قطعاً شوق نہ تھا بہت اصرار اور پیہم تقاضوں کے بعد کسی خوش نصیب کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ اصلاحِ سخن کے متعلق مولانا اکثر یہ کہا کرتے ارشاد فرما دیتے کہ جتنے وقت میں کسی غزل کی اصلاح کروں گا اس میں خود کیوں نہ ایک غزل کہہ ڈالوں۔

مجھے بر بنائے عقیدت بے انتہا شوق و اصرار کے بعد مولانا سے شرفِ تلمذ ۱۹۲۵ء میں حاصل ہوا اس پچیس برس کے عرصہ میں پچیس غزلیں نظمیں دکھانے کا بھی موقع نہ ہاتھ آیا عند الملاقات مشتبہ اشعار سنا کر تصحیح و تسکین کر لیا کرتا تھا اور مولانا نے وقتاً فوقتاً میری بصیرت میں اضافہ کیا یا اتفاقی طور پر کسی مشاعرے میں ساتھ ہو گیا تو پوری غزل یا نظم سنا دی اس سلسلہ میں کبھی کوئی لفظ مولانا نے رکھ دیا ورنہ اصطلاحات یا محاورات وغیرہ کی تحقیق ہی پر اصلاح کا دار و مدار رہا۔

مولانا نے اپنے رسالۂ اردوئے معلّٰی میں اساتذہ کے انتخابات کلام کا ایک سلسلہ رکھا تھا جس میں ردیف وار اشعار شایع ہوا کرتے تھے میرے لئے یہ خصوصیت ہمیشہ فخر کا باعث رہے گی کہ مشاہیر کے انتخابات کے سلسلہ میں استاد معظم نے دسمبر ۱۹۳۲ء میں میرے ناچیز کلام کا انتخاب بھی شایع فرما کر مجھے عزت بخشی اور اپنے مایۂ ناز قلم سے میرے تخلص کے ساتھ شاگرد حسرت موہانی تحریر فرمایا۔ اس مطبوعہ انتخاب میں اشاعت سے پیشتر استاد مرحوم نے بیاض پر مختصر طور سے اصلاحی نظر ڈالی اور اسی موقع پر اصلاحاتِ لفظی کا شوق پورا ہوا اور میرے اکثر اشعار میں تقریباً نصف نصف مصرع مولانا مرحوم نے بلٹے یا ایک آدھ لفظ کے بدل دینے سے اشعار میں جان ڈال دی جس کے نمونے میں ذیل میں پیش کرتا ہوں یہ میری مشق کا ابتدائی زمانہ تھا۔

اصل شعر:- اُلفت میں جدا سب سے طریقا ہے ہمارا — سنگِ درِ محبوب پہ سجدا ہے ہمارا

مصرعۂ ثانی میں سنگِ درِ محبوب کی جگہ ''نقشِ قدمِ یار'' بنا دیا جو ذوق سجود کے اظہار کے لئے علاوہ بلیغ ہونے کے دامِ سجدوں سے جدا گانہ ہونے کا اہم پہلو ہے۔

اصل شعر:- کوئی گالی تو نہ تھی آپ کو دلبر کہنا — اتنی سی بات پہ دیوانے سے بیزار ہیں آپ

مصرعۂ ثانی کو اس طرح بدل دیا:- ''اتنی سی بات پہ زحمت کش پیکار ہیں آپ''

اس ترکیب و اصلاح میں مولانا کی شاعری کا مزاج جھلک رہا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ دیوانہ کے لفظ سے معشوق کا مخاطبہ ایک درمیانی شخص سے ہوتا ہے جو سفارش کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ محبت کی راز داری بلکہ عاشقانہ پاکبازی کے خلاف ہے اصلاح نے اس عیبِ معنوی کو بھی دور کر دیا۔

اصل شعر:- بہارِ گل ذرا اس وقت دیکھیں دیکھنے والے — گھٹا جب آبپاشی کر گئی ہو سبزہ زاروں میں

مصرعۂ ثانی میں آبپاشی کو آبیاری سے بدل دیا جو اتنا لطیف و نفیس لفظ ہے کہ گویا نگینہ جڑ دیا گیا ہے۔

اصل شعر:- ابھی زاہد مئے معشوق کا پرہیز مشکل ہے — جوانی کا زمانہ ہے امنگیں ہیں طبیعت میں

پہلے مصرعہ میں زاہد کی جگہ ''ہم سے'' اصلاح دی گئی جس سے روانی بڑھ گئی۔

اصل شعر:- ہم اگر شکر بھی کرتے ہیں تو ہوتا ہے گلہ
آپ کے منہ سے تو شکوے بھی مزا دیتے ہیں

دوسرے مصرعہ کو ذرا سی تعبیر کے ساتھ کتنا پر اثر بنا دیا اصلاح نصف مصرعہ کی ہے مگر گویا پورا شعر بدل گیا ملاحظہ ہو:-

ان کے منہ سے ہوں تو شکوے بھی مزا دیتے ہیں

اصل شعر:- قیامت خیز ہے محفل میں ان کی یہ شرارت بھی
کہ اٹھنا چاہتا ہوں میں تو وہ دامن دباتے ہیں

قیامت خیز کی جگہ "عجب پر لطف" بنا دیا گیا جس سے شعر کا لطف بڑھ گیا قیامت خیز کا لفظ مبالغہ ہی مبالغہ تھا لیکن عجب پر لطف نے موقع کی صحیح تصویر شعر میں کھینچ دی جس سے بجائے مبالغہ کے حقیقت نگاری کا رنگ غالب آ گیا۔

اصل شعر:- تمھیں پر آج پڑتی ہے نظر ساری خدائی کی
اگر ہم نے تمھیں چاہا تو آخر کیا برائی کی

اصلاح یوں دی گئی:- "جو ہم نے بھی تمھیں چاہا تو آخر کیا برائی کی"

اہل نظر پر پوشیدہ نہیں کہ بھی کی ضرورت تھی جس کے بغیر شعر مکمل تھا لیکن شعر کی چستی نامکمل تھی۔

اصل شعر:- شفیق افسوس ساری عمر روتے ہی کٹی اپنی
مگر دنیا میں ہم نے زندگی پائی تھی شبنم کی

مصرعۂ اولیٰ میں پہلوئے ذم تھا نیز "افسوس ساری" کی بندش بھی پے در پے "س" میں آجانے سے غیر فصیح تھی، لہذا مولانا نے مصرعہ کو بدل کر اس طرح درست کیا:-

شفیق افسوس اپنی عمر گزری اشکباری میں

اصل شعر:- ذرا برقع ہٹا دیں آپ اپنے روئے زیبا سے
کہ رخصت ہو رہا ہے آپ کا بیمار دنیا سے

مصرعۂ اولیٰ پورا بدل گیا۔ اب اصلاح کا مصرعہ اصل شعر کے مصرعۂ ثانی کے ساتھ ملا کر پڑھئے اور مطلع کی شان دیکھئے:-

گلے مل مل کے روتی ہے وفا شوق و تمنا سے
کہ رخصت ہو رہا ہے آپ کا بیمار دنیا سے

سال گزشتہ سفر حرمین میں ناچیز کو حضرت مولانا مرحوم کا شرف رفاقت حاصل رہا اس موقع کی بھی ایک زریں اصلاح یاد رہ گئی ہے۔ میں نے (جنت البقیع میں عاشورے کی رات) کے عنوان سے ایک چھوٹی سی نظم لکھی تھی جس کا مطلع حسب ذیل ہے:-

شبستاں میں ہیں محبوبانِ طیبہ
شبِ عاشور ہے عنوانِ طیبہ

مولانا نے مصرعۂ اولیٰ میں کتنا حسن پیدا کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

بکھری زلفِ محبوبانِ طیبہ

استاد منظم کا طریقۂ اصلاح یہ تھا کہ غلطی سے باخبر فرما کر ارشاد فرماتے تھے کہ اب شعر یا مصرعہ کو خود بدلو یہ اصلاح و ترقی اور مشق سخن کا بہترین طریقہ ہے۔ میں نے اس طریقہ کار سے بہت کچھ فائدہ حاصل کیا۔ مولانا مرحوم یک مصرعہ بھی کاٹ کر بنانا پسند نہ فرماتے تھے۔

حسرت - ایک تاثر

(پروفیسر آلِ احمد سرور - لکھنؤ یونیورسٹی)

نیاز صاحب - تسلیم

آپ نے نگار کے حسرت نمبر کے لئے مجھ سے مضمون طلب کیا ہے - آپ فرماتے ہیں کہ "میں اپنا حرج کروں گا، انتظار کروں گا، اور سالنامہ کو لیٹ کر دوں گا، لیکن آپ کا مقالہ اُس میں ضرور شایع ہوگا" میں شاید آپ کے خفا ہونے کے خیال سے زیادہ پریشان نہ ہوتا، کیونکہ اپنے خلوص پر اعتماد کرتے ہوئے آپ کو منا سکتا ہوں، لیکن مجھے نگار کی باقاعدگی اور وضعداری عزیز ہے - آپ نے بہت سی مصروفیتیں دیکھی ہوں گی - میری مصروفیت ایسی ہے کہ بے حد عدیم الفرصت ہوں اور کر کچھ نہیں پاتا - یہ بات سمجھنے کی ہو یا نہ ہو ماننے کی تو ہے - بہرحال اس عالم میں بھی نگار کے لئے حسرت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں - لیکن شروع میں دو تین باتیں تمہید کے طور پر کہنی ہیں

آخر یہ خاص نمبر ہم لوگ کیوں نکالتے ہیں ؟ اگر ان سے صرف عقیدت کے جذبے کی تسکین مراد ہے تو میں اس کا احترام کرتا ہوں، مگر اس سے اتفاق نہیں کر سکتا - میں نے خود بھی خاص نمبر نکالے ہیں اور "اُردو ادب" کا حسرت نمبر بھی جلد نکلنے والا ہے - مگر میں تو ان نمبروں کو صرف گلدستۂ عقیدت کے طور پر پیش کرنا پسند نہیں کرتا - ہم ہندوستانی عقیدت و محبت کا زیادہ مظاہرہ کرتے ہیں، خصوصاً کوئی مرجائے تو اُس کے عیب بھی ہمارے نزدیک حسن بن جاتے ہیں، ہم رحم کر سکتے ہیں، انصاف نہیں کر سکتے ہیں ——— ہم سر جھکا سکتے ہیں، آنکھیں چار کرنے کی تاب نہیں لا سکتے، ہمیں قبروں پر عود و لوبان کا مہکتا ہوا دھواں عزیز ہے، صحت مند تنقید کی خوشگوار لہر ناپسند ہے - ہم اپنے اچھے آدمیوں کو زندہ درگور کر دیتے ہیں اور جب وہ مرجاتے ہیں تو اُن کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں - زندگی سے ہمیں اتنی عقیدت نہیں جتنی موت سے ہے - کسی مرنے والے کی یاد میں خاص نمبر کتنا ہی منصفانہ کیوں نہ ہو، خراج عقیدت ہی ہو جاتا ہے کاش کہ ایسا نہ ہوتا

دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ پر آشوب دور میں جبکہ پڑھنے والا طبقہ بڑی مصروفیت اور مالی مشکلات کا شکار ہے، وہ چاہے بھی تو شعرا کے سارے دیوان اور اُن پر اچھی تنقیدیں نہیں پڑھ سکتا، اس لئے وہ خاص نمبروں، انتخابات اور اہم مجموعوں کا محتاج ہو گیا ہے - مغرب میں ایسے مجموعے بکثرت ہیں اور ان سے خاص و عام دونوں کے ذوق کی تسکین ہو جاتی ہے - اُردو میں ابھی ایسے نمبر کم ہیں اس لئے ان کی ضرورت ہے - مگر ضرورت اور بھی زیادہ ہے کہ ایسے مجموعوں میں شاعر کے ساتھ ساتھ شاعری اور اس کی قدر کرنے والوں کے ساتھ بھی انصاف کیا جائے - کیا عام طور پر ایسا ہوتا ہے ؟ پڑھنے والوں کی ضروریات اور مجبوریوں کو ہم دیانت داری سے دیکھتے بھی ہیں یا نہیں ؟

• اُردو تنقید نے موجودہ دور میں بڑی ترقی کی ہے - وہ مدح و قدح کی چار دیواری سے بہت آگے نکل گئی ہے - وہ تجربات کی تازگی اور انفرادیت پر وجد بھی کر چکی ہے اور اب ان تجربات کو زندگی کے قیمتی اور معنی خیز اصولوں کی روشنی میں دیکھنے لگی ہے - کچھ لوگوں نے عطائی حکیموں کی طرح زندگی اور ادب کے سستے نسخے دریافت کر لئے ہیں، لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو زندگی کے اسرار و رموز کو سمجھتے ہیں اور تنقید کی وادیِ پرخار میں ذرا احتیاط سے قدم رکھتے ہیں - پھر وہ کسی ایک پھول کی تعریف میں گلستاں کی بہاروں کو نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے، اور نہ تنقید کو پل صراط کی طرح بال سے باریک

اور تلوار سے زیادہ تیز کہکر عام پڑھنے والوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ میری مراد ایسے لوگوں سے ہے جو حُسن کو پہچانتے ہیں اور اس کی تعریف کرنے میں شرماتے نہیں، جن کی رائے غلط ہوسکتی ہے مگر جس میں خلوص تاثر کے ساتھ مل کر ایک "خاصے کی چیز" بن جاتا ہے، جن سے لوگ اختلاف کرسکتے ہیں، لیکن بے نیاز نہیں ہوسکتے، جو شاعر اور ادیب پر نہ عمل جراحی کرتے ہیں اور نہ اُس کے نقیب ہوتے ہیں، بلکہ جو ذہنی صحت اور ذوق سلیم کا معیار قایم کرتے ہیں اور اچھے شاعر کو زندگی کے صالح اور معنی خیز تجربات کے معیار سے پرکھتے ہیں

اس معیار سے حسرت کو دیکھئے تو حسرت کے متعلق بہت کچھ لکھنے کی گنجایش ہے اُن کے موافق بھی اور اُن کے خلاف بھی۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ حسرت ایک ایسے شاعر ہیں جن کی مقبولیت مسلّم ہے۔ مقبول تو فلمی گانے بھی ہوتے ہیں اور ان کی مقبولیت پر ہنسنا اپنی عقلمندی کو ثابت کرنے کے لئے ضروری بھی نہیں ہے۔ مگر حسرت کی مقبولیت وقتی نشے سے زیادہ ہمہ گیر اور دیرپا ہے۔ اس مقبولیت میں ان کی سیاسی اور ادبی شخصیت کو بھی زیادہ دخل نہیں ہے۔ سیاست میں ان کی آزادیِ رائے اور ان کے خلوص کو کون نہیں مانتا، مگر اُن کے سیاسی خیالات میں گہرائی اور تنظیم نہیں ہے۔ اُن کی تنقید اور تحقیق کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اس دنیا میں وہ ہمارے چوٹی کے لکھنے والوں کی برابری نہیں کرسکتے۔ ان کے یہاں شاعری کا ایک اچھا اور سلجھا ہوا معیار ہے، یہ ان کا اپنا معیار ہے۔ کسی سے اُنھوں نے مستعار نہیں لیا۔ مگر یہاں بھی وہ فن کا زیادہ اور فکر کا کچھ کم خیال رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنکی شاعری کی اہمیت ان کی سیاست اور تحقیق و تنقید کی اہمیت سے بہت زیادہ ہے اس اہمیت کو سمجھنا اور اس میں جو کسی شے کی کمی رہ گئی ہے، اُسے دریافت کرنا تنقید کا بہت بڑا فریضہ ہے۔ ایک خط میں اس کو پورا کرنا ناممکن سہی۔ مگر اس کی طرف اشارہ تو ہوسکتا ہے۔ سنا ہے عقل مندوں کے لئے اشارہ ہی کافی ہے۔

ہم لوگ چونکہ سیاہ یا سفید لکیروں کے عادی ہوگئے ہیں اس لئے جسم کی شاعری اور روح کی پکار کو علٰحدہ علٰحدہ سمجھ لیتے ہیں۔ جرأت کی چوما چاٹی یا نظیر کی نظمیں اور اثر، شوق اور مومن کی مثنویاں جو کچھ کہتی ہیں وہ ہمیں معلوم ہے۔ اسی طرح درد، آتش، آسی غازی پوری کی روح کی پکار ہم سمجھ لیتے ہیں مگر جسم کے بیان میں روحانیت اور روحانیت میں جسم ہماری سمجھ میں آسانی سے نہیں آتے۔ حالانکہ اچھی عشقیہ شاعری میں جنسی پہلو جس طرح جمالیاتی رفعت حاصل کرلیتا ہے، کثافتیں جس طرح لطافتیں بن جاتی ہیں، نار سے جو نور پیدا ہوتا ہے، اُسے سمجھنا ایسا مشکل نہیں ہے۔ حسرت کی عشقیہ شاعری ایسی ہی ہے۔ پرجوش جنسی جذبے نے بلند ہوکر ایک ایسی لطافت اور عظمت حاصل کرلی ہے جو محسوس کی جاسکتی ہے، بیان نہیں کی جاسکتی۔

حسرت کی شاعری عشقیہ شاعری کا ایک معیاری نمونہ ہے۔ حسرت کے عشق میں جو لذت آئی ہے اُس میں جسم کی آنچ اور روح کی پکار دونوں ایک ناقابلِ بیان ہم آہنگی کے ساتھ مل جل گئے ہیں۔ حسرت مجازی عشق کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ "اس نعمت کے منکر ہیں نہ عادی"۔ عشقیہ شاعری میں پرخلوص اور گہرے جذبات کی موجودگی ضروری ہے۔ تخیل کی کرشمہ سازی یا فن کی شعبدہ بازی سے بھی اس وادی میں کچھ لوگوں نے پھول کھلائے ہیں مگر ان پھولوں میں رنگ ہے خوشبو نہیں۔ حسرت کے اشعار میں عشق کی گرمی اور شیرینی دونوں موجود ہیں۔ اُنھوں نے خود بھی اپنے کلام میں شیرینیِ نسیم و سوز و گداز میر کا جابجا ذکر کیا ہے۔ حسرت کے یہ عشقیہ اشعار صرف میر، مصحفی، جرأت، مومن، نسیم کی آواز بازگشت ہی نہیں ہیں انکے یہاں ان شعرا کا رنگ مل جل کر ایک نیا رنگ بن گیا ہے۔ اس رنگ کو پہچاننا تو مشکل نہیں، مگر اسے ایک نام دینا مشکل ہے۔ میرے خیال میں یہ حسّی یا لمسی (SENSUOUS) شاعری کی بہترین مثال ہے۔ کیٹس (SENSATIONS) کو (THOUGHTS) سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ حسرت کے یہاں بھی احساس زیادہ نمایاں ہے فکر کم۔ اُنکے یہاں ایک سپردگی، ایک مدھم ہیجان، ایک سرشاری اور ایک شادابی ملتی ہے جو بڑی خوش آہنگ، بڑی لطیف اور اس کے ساتھ بڑی صحت مند اور جاندار ہے۔ میر کے لہجے میں ایک نشتریت ہے۔ عشق اُس کے لئے ایک آزار ہی رہا۔ اُسکا یہ بے مثل شعر دیکھئے ؎

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا   ہم یہ سمجھے تھے کہ اے میر یہ آزار گیا

حسرت کہتے ہیں ؎

سب سے منھ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم   اس میں اک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا

عشق ہی اُن کی عبادت ہے۔ عشق کی راحت اور فراغت کا یہ تصور اُن کا اپنا ہے۔ اور یہ تصور بھی حسرت کو دنیا اور اپنے زمانہ کا ایک فرد ثابت

کرتا ہے۔ چنانچہ حسرت کے کلام کی خصوصیات کے بیان میں ان کے یہاں پرخلوص اور تھرتھراتے ہوئے جذبات کی کیفیت، اس کیفیت میں ایک سپردگی اور اس سرشاری کی قوت شفا تینوں کی اہمیت کو مقدم رکھنا ضروری ہے۔ یہیں سے حسرت کی عشقیہ شاعری، ان کا لب و لہجہ اور ان کا مزاج دوسرے شعرا کی یاد دلاتے ہوئے ان سے ممتاز اور منفرد معلوم ہوتے ہیں۔ ان نکات کی خاص تفصیل ہو سکتی ہے لیکن اول تو نگار کے خاص نمبر میں حسرت کے اتنے اشعار درج کئے گئے ہوں گے کہ ان کی تکرار کچھ غیر ضروری ہے اور دوسرے میرے پاس وقت بھی نہیں ہے اس لئے ان کی وضاحت کے بغیر میں آگے بڑھتا ہوں

دوسری بات یہ ہے کہ حسرت کی عشقیہ شاعری میں حسن کا ایک نسبتاً جدید تصور ملتا ہے۔ یوں تو حسن شرابی کا ذکر میر کے یہاں بھی ہے اور مصحفی نے محبوب کے لباس اور اُس کے رنگوں کے تناسب کا ذکر کیا ہے، مگر عام طور پر اُردو شاعری میں محبوب ایک مقدس اور روشن پرچھائیں کی طرح ہے۔ وہ بجلی ہے، شعلہ ہے، تلوار ہے، وہ دشمنِ ایمان و آگہی اور رہزنِ تمکین و ہوش ہے، مگر اُس کے باوجود وہ کچھ دور کا جلوہ، ایک ان دیکھی کرن، ایک ماورائی غبار، ایک حجاب رنگیں معلوم ہوتا ہے۔ حسرت کے یہاں ایسا نہیں۔ حسرت نے جس حسن کو دیکھا اور دکھایا ہے اُس کے جسم میں یہ خوبی ہے کہ "پیرہن رنگینیوں میں ڈوب جاتا ہے، جیسے سوتے میں زلف عنبر گھیر لیتی ہے" جس کی طرح داری کا یہ عالم ہے کہ خواب میں بھی حسن بیدار ہے، جس کی "خوشبو سے دہن سرشار محبت" ہے جس کی جامہ زیبی ایسی ہے کہ بگڑتے ہی میں اور سنور جاتا ہے اور جو "کشمکش ہائے نوجوانی" کا ایک اور مرقع ہے۔ حسرت کے یہاں یہ جسم کا احساس حواس کو سرشار کر دینے کا یہ سامان، اور اس جنت نگاہ میں ملاحیت اور محبوبیت کے باوجود عشق کا گداز اور عشق پر خفگی کے بجائے اُس کے اثر سے یہ شگفتگی اور نکھار —————— یعنی حسن بے پرواہ کے بجائے وہ حسن جو عشق سے متاثر ہے ان کی عشقیہ شاعری کو ایک ایسی نازک اور لطیف سچائی، ایک شاداب واقعیت اور ایک دلربا اصلیت دیتا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جائیگا

تیسری چیز یہ ہے کہ حسرت صرف حسن و عشق کے مصور ہی نہیں محرم اسرار بھی ہیں۔ وہ عشق کی واردات اور حسن کے جذبات کو سمجھتے ہیں۔ مثلاً اُن کے یہ متفرق اشعار دیکھئے ؎

۱- بسی ہوئی ہے جن آنکھوں میں شوخیوں کی بہار　　ادائے شرم اُنھیں کیوں سکھائی جاتی ہے

۲- اب ان آنکھوں میں ہے صبح شب وصل　　نہ شوخی کی نہ گنجائش حیا کی

۳- پوشیدہ سکون یاس میں ہے　　اک محشر اضطراب خاموش

۴- حیرت ہے یادگار زمانِ جنوں ہنوز　　باقی ہیں شوقِ یار کی اب تک نشانیاں

۵- آپ کا شوق بھی تو اب دل میں　　آپ کی یاد کے سوا نہ رہا

۶- شادماں تھا جو ترے رنج طرب کار سے دل　　غم دنیا سے گراں بار نہ ہونے پایا

یہ بات صرف حسرت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اُردو کے تمام بڑے شعرا کو حسن و عشق کی عکاسی کے ساتھ نفسیات انسانی کی مصوری بھی آتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ حسرت کے یہاں بیک وقت دو کیفیات کی بظاہر متضاد جھلکیوں کی جو مصوری ہے وہ نئی ہے اور اُسے جدید علم النفسیات کے مطابق بالکل فطری سمجھا گیا ہے۔ شاعر نے دونوں کے تجزیے کی بجائے دونوں کا ایک باطنی تعلق، ایک ربط باہمی واضح کر دیا ہے۔ شعور و لاشعور کی ارادی مصوری اُن کے یہاں نہیں ہے، مگر ان دونوں کا احساس حسرت کے یہاں ملتا ہے، خصوصاً حسن کے خاموش منظر میں جو اندرونی طوفان موجزن ہوتے ہیں، وہ حسرت کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں، حسرت یہاں صرف تماشائی ہیں، وہ ان نیرنگیوں کے بیان کو کافی سمجھتے ہیں، ان پر تبصرہ ضروری نہیں سمجھتے جیسا اُن کے بعد بعض جدید شعرا نے کیا ہے

حسرت کی چوتھی خصوصیت اُن کی بعض مسلسل غزلوں میں ملتی ہے، آغاز الفت کے مزے یا عاشقی کا زمانہ، یا فنا ہو جائیے میں مومن کا عکس ہے، مگر مومن کا رنگ نہیں۔ مجھے بعض اوقات یہ خیال آتا ہے کہ غالب و مومن بھی عشق میں اپنے آپ کو بھول نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے عشق میں وہ معصومیت اور حلاوت نہیں ہے جو حسرت کے یہاں ہے۔ حسرت پرستار ہیں اور لوگ طلب گار، حسرت نظارے میں مست ہیں اور لوگ ذوق نظر کی داد چاہتے ہیں۔

اُنھوں نے اپنے عشق پاکباز اور تہذیب رسم عاشقی کا ذکر بار بار کیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت کے یہاں حُسن ارضی کے ساتھ تصوف کی چاشنی بھی ہے، مگر اُن کے مجازی عشق میں بھی وہ شوخی، چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک نہیں ہے جو داغ کی خوبی بھی ہے اور خامی بھی۔ حسرت کے عشق میں عنفوانِ شباب کی دلآویز پاکیزگی اور نرمی ہے۔ حسرت نے شوخ اشعار بھی کہے ہیں، مگر اُنھیں کھیل کھیلنے کی عادت نہیں۔ وہ عاشق ہیں، ہوس پرست نہیں ہیں جنسی احساس کے ہوتے ہوئے بھی حسرت کے یہاں آلودگی اور برہنگی بہت کم ملے گی۔ وہ جنسیات کی ساری لطافتوں کو سموتے ہوئے بھی اُس کی کثافتوں سے اپنا دامن بچا گئے ہیں

اب ضروری ہے کہ حسرت کے اسلوب کے متعلق کچھ کہا جائے۔ حسرت سے پہلے غزل کے تین اسلوب پہچانے جا سکتے ہیں۔ ایک میر کا، ایک ناسخ و ذوق اور ایک مومن و غالب کا۔ ناسخ و ذوق اور مومن و غالب کا نام ایک ساتھ لینے اور اُنھیں بریکٹ کرنے پر شاید لوگ تعجب کریں، لیکن دونوں کے یہاں ایک وحدت ہے۔ میر کے یہاں سادہ مگر تازہ کار داخلیت ہے، ناسخ و ذوق کے یہاں خارجیت اور ہمواری ہے، اور مومن و غالب کے یہاں خیال انگیز پیکر تراشی جس میں داخلیت اور خارجیت کا ملاپ ہے۔ میر نے جذبات کو زبان دی، ناسخ و ذوق نے فن پر جذبات کو قربان کر دیا۔ غالب و مومن نے فکر و فن کی تجدید کی۔ میر سے غزل کی عاشقانہ روایت، ناسخ و ذوق سے فنی روایت، اور غالب و مومن سے (غالب سے زیادہ اور مومن سے کم) فکر کی روایت قایم ہوتی ہے۔ حسرت نے تمام اساتذہ کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ ہر طرز کی نزاکتوں کو سمجھتے تھے۔ اُنھیں راہبر کو پہچاننے کے لئے ہر راہرو کے ساتھ کچھ دور چلنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اُنھیں شعر و سخن کی وادی میں قدم رکھتے ہی اپنی راہ معلوم ہو گئی۔ غزل کے لئے میر کی سادہ پرکاری سے بہتر کیا چیز ہوتی مگر میر کی سادگی کو غالب بھی نہ برت سکے۔ میر کے زمانے کے عشق اور غالب کے زمانے کے عشق میں فرق تھا، زندگی کا نظام بدل رہا تھا۔ غالب میر کی سی معصوم سادگی نہ لا سکتے تھے، اس لئے کہ غالب کے زمانہ میں آرایشِ خمِ کاکل کے ساتھ اندیشہ ہائے دور و دراز پیدا ہو گئے تھے۔ میر کی سادگی کا جواب غالب نے رمزیت سے دیا۔ یہ رمزیت اُن کی تراکیب کو گنجینۂ معانی کا ایک طلسم بنا دیتی ہے حسرت نے میر کی سادگی میں غالب کی رمزیت سموئی، مگر وہ غالب کا سا خلاق اور آفاقی تخیل نہ رکھتے تھے۔ اس لئے اُن کے یہاں تراکیب میں تازگی اور شگفتگی، معنویت اور رنگینی ہے مگر وہ غالب کے جامِ جہاں نما پر دسترس حاصل نہ کر سکے۔ اساتذہ کے رنگوں میں ڈوبنے سے جہاں اُنھیں فایدہ ہوا وہاں نقصان بھی ہوا۔ وہ زبان کی شایستگی اور ہمواری کے زرا زیادہ قایل ہو گئے، اُس کی خیال انگیزی کو اُنھوں نے نظر انداز کیا۔ حسرت کی نظر میں فکر و فن کا بنیادی رشتہ نہ تھا۔ اُن کے یہاں فکر کی گہرائی اور جامعیت بھی نہیں ہے۔ اُس میں ایک محدود کیفیت ہے، وسعت و فراغی نہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ حسرت کے یہاں آئینے کی سی جو جِلا اور چمک ملتی ہے وہ اُن کے جذبات کی اصلیت اور اساتذہ کے فیضان دونوں کی مرہونِ منت ہے۔ اس کی شگفتگی، تھرتھراہٹ، جادو اور رس اور رچن کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں جو کمی ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ حسرت کے عشق کی دنیا بڑی رنگین و جاندار ہوتے ہوئے کچھ محدود ہے۔ اُن کے یہاں تجربات میں زیادہ تنوع نہیں ہے۔ اُنھوں نے عشق کی جنت کا نظارہ کیا ہے مگر اُس کے جہنم کی لپٹ محسوس نہیں کی۔ اُن کی پاکیزگی اور مذہبیت نے اُنھیں شاید پاک اور جایز محبت کے دایرے میں رکھا۔ ذوقِ نظر نے اُنھیں اِدھر اُدھر بھٹکایا، مگر وہ اس وادی میں زیادہ دور تک نہیں چل سکے۔ اس لئے اُنھیں زندگی کی گہرائیوں کا زیادہ علم نہیں ہو سکا

میرے لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ حسرت کی عشقیہ شاعری ذرا سادہ ہے، اس میں وہ پیچ و خم، وہ اُلجھاؤ اور سلجھاؤ نہیں ہے جو عشقیہ شاعری کو آفاقی شاعری بنا دیتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ حسرت کی شاعری میں عظمت نہیں۔ عظمت تو ہے مگر وسعت نہیں۔ جدید تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی پیچیدگی ہے۔ آپ اسے اچھا یا بُرا کہیں تو کافی نہ ہوگا، اسے تسلیم کرنا پڑے گا، حسرت کے سادہ پرجوش اور فطری عشق میں ہم کھو جاتے ہیں ہمیں اس کے فیض سے زندگی کی بڑی سچائیوں کا علم ہوتا ہے، مگر اس کی سطح زیادہ بلند نہیں ہے۔ یہ زیادہ دیر تک یا دور تک ہماری رفاقت نہیں کر سکتا، پہلی جنگ عظیم سے پہلے ہماری ذہنی زندگی میں جو ایک طرفہ سادگی تھی، اُس کا سب سے قابلِ قدر اظہار حسرت کے یہاں ہوا ہے، مگر وہ زمانہ اب کتنا دور (اور اس لئے کتنا رنگین) نظر آتا ہے

شاعری - ترنم (SOUND)، (SENSE) اور (SUGGESTION) کا نام ہے۔ یعنی الفاظ کا ترنم، اُن کا مفہوم، معنی یا مطلب اور اُن کا کنایاتی یا اشارتی پہلو۔ حسرت کے یہاں یہ تینوں باتیں بڑی اچھی طرح گھل مل گئی ہیں اور اسی سے اُن کے اسلوب میں ترشے

ہوئے ہیرے کی سی دمک اور پنکھڑی کی سی لطافت ہے۔ حسرت کے کسی اچھے شعر کو لیجئے۔ بنیادی خیال، تمثیل کی تازہ کاری اور الفاظ کا ترنم، مل جل کر ایک رنگین فضا پیدا کر دیتے ہیں۔ لہجے میں نرمی ہے۔ معلوم ہوتا ہے شاعر نے خود کچھ نہیں کہا، جذبات کو زبان دیدی ہے۔ جذبات کو زبان دینے ہی میں اظہار کا سارا کھیل ہے اسے آپ آمد اور آورد کی مدد سے نہیں سمجھ سکتے۔ صرف آمد مجذوب کی بڑ ہو سکتی ہے معنی خیز شاعری نہیں ہو سکتی۔ محض آورد سے آپ جادو نہیں جگا سکتے، جذبات میں ہلچل نہیں برپا کر سکتے، ریگستانوں میں پھول نہیں کھلا سکتے۔ آورد زیادہ سے زیادہ پتھر اسکھا سکتی ہے دار نہیں کر سکتی۔ ہر اچھے شعر میں جذبات کو الفاظ میں مقید کرنا ہوتا ہے، بے نام پرچھائیوں کو آب و رنگ دینا پڑتا ہے، بے ربط چیزوں میں ربط ڈھونڈھنا ہوتا ہے، مانوس چیزوں میں تازگی اور نئی چیزوں میں جانی پہچانی صداقتیں دریافت کرنی پڑتی ہیں اور یہ کھیل تمثیل کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے حسرت کے یہاں الفاظ کا ترنم، خیال کی صداقت اور فضا، سب اُن کے تخیل کی مرہون منت ہیں۔ مگر حسرت آسمان سے تارے نہیں توڑتے۔ وہ زمین کے ذروں سے کیمیا بناتے ہیں۔ اچھا شاعر بھی ایک کیمیاگر ہوتا ہے

حسرت کے چند اچھے اشعار سے اُن کی کیمیا سازی کا کچھ اندازہ ہوجاتا ہے ؎

۱- وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں — آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

۲- غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں — مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

۳- خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

۴- آہ اُس نگاہِ شوق کی مستی جو بے خبر — خوبی پہ روئے یار کے پہلے بہک گئی

۵- کیونکر کوئی سنائے اُنھیں شوق کی وہ بات — جو پڑ گئی ہو کشمکشِ التماس میں

۶- کیا کیا نہ اُن کی یاد سے ہوں شرمسار ہم — فرصت کبھی جو کشمکشِ روزگار دے

۷- تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے — تماشا کامیاب آیا، تمنا بے قرار آئی

۸- تاثیرِ برقِ حسن جو اُن کے سخن میں تھی — اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

۹- محتاجِ بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوب یار — خوشبوئے دلبری تھی جو اُس پیرہن میں تھی

۱۰- رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا — طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

ان اشعار میں خیال واضح ہے، سادہ ہے، مگر سپاٹ نہیں بلکہ اپنی اصلیت کی وجہ سے دل پر اثر کرتا ہے، ان میں تخیل کی پیکر تراشی حسین لباس اختیار کر لیتی ہے، یہاں الفاظ نرم، مترنم اور موزوں ہیں۔ حروف کی آوازیں موضوع کے مطابق ہیں اور خود بھی مفہوم سے الگ ذہن کے گرد ایک رنگین غبار پیدا کر دیتی ہیں۔ شاعر کی شخصیت یا انا یہاں اتنی نمایاں نہیں کہ عشق کی داستان میں حارج ہو، ان جذبات میں عمومیت کے باوجود خصوصیت ہے، یہاں داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہے، بھرپور اور نکھرتے ہوئے احساس نے یہاں جذبات اور کیفیات کی ایک دنیا آباد کر دی ہے۔ شاعر جذبے کی گہرائی اور خیال کی صداقت کے سہارے سامنے آتا ہے، اسلوب فوراً اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا، بلکہ تصویر کی رنگینی میں گھل مل جاتا ہے، یہی اچھے اسلوب کی پہچان ہے ؎ کر جائے کام اپنا لیکن نظر نہ آئے

حسرت کے یہاں اُردو غزل کی پوری انجمن آباد ہے۔ وہ ہمارے آخری کلاسیکل شاعر ہیں۔ اُردو شاعری کو میں آسانی کے لئے تین دوروں میں تقسیم کرتا ہوں۔ پہلا غدر ۵۷ء تک، دوسرا پہلی جنگ عظیم تک اور تیسرا ۱۹۲۰ء سے آج تک۔ ہمارا اصلی کلاسیکل دور ۵۷ء کے بعد نہ چل سکا گو اس کی نشانیاں باقی رہیں۔ آزاد اور حالی نے اس دوسرے دور میں پورے ادب کو ایک نیا رنگ دیا، مگر اس میں غزل کی پچھلی روایات ختم نہ ہو سکیں۔ حسرت کا سارا اچھا کلام ۱۹۲۰ء سے پہلے کا ہے۔ اُس کے بعد اُنھوں نے جو کچھ کہا ہے تبرک ہے۔ یوں تو مشق سخن اور چکی کی مشقت (ذرا وسیع معنی میں) آخر تک رہی۔ مگر زندگی کی چکی نے شاعری کی روح کو پیس ڈالا۔ ۵۷ء سے ۱۹۲۰ء تک ہماری شاعری میں نئے اور پرانے اثرات اپنی اپنی سادگی لئے ہوئے ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے بعد ہر چیز پیچیدہ ہو گئی۔ اس پیچیدگی کے خلاف اختر شیرانی کی رومانیت اور جوش کی شبابیات میں

ہے - دوسرے دور کے سب سے بڑے کلاسیکل شاعر حسرت ہی ہیں - اُن کی یہ خصوصیت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ وہ اتنے پرانے ہونے کے باوجود بھی کچھ نیا پن رکھتے ہیں - اُنھوں نے غزل کی ساری صالح روایات کو جذب کیا اور اُس کی خزینہ کو کم کر کے اُس میں ایک ایسا ذوق و شوق، سرخوشی و سرشاری، تازگی اور قوت شنا بھر دی کہ اُس نے پوری شاعری کے لئے صحت و اصلاح کا کام انجام دیا۔ حسرت عام پڑھنے والوں کو اساتذہ سے بے نیاز کر دیتے ہیں، اور خواص کو اُن کی طرف متوجہ کرتے ہیں - حسرت ہمیں میر، مصحفی، قائم، جرأت، غالب، مومن، نسیم کی یاد دلاتے ہیں اور اُن کی قدر کرنا سکھاتے ہیں - یہ بہت بڑی بات ہے - مگر حسرت غالباً ایک کلاسک ہی رہیں گے، ایک زندہ و پائندہ اثر نہ بن سکیں گے - یہ حسرت کی خامی نہیں ہے اس دور کی مجبوری ہے - حسرت کا سا معصوم عشق، اُن کی سپردگی، اُن کی عنفوان شباب کی رومانیت اور حسن کی پرستش، اُن کی سی فراغت اور راحت کوئی کہاں سے لائے گا۔ حسرت نے جس طرح جذبے کے سہارے اور سیدھے سادے فکر کے بل پر عشق کیا اور سیاست میں انا دلاغیری کا ثبوت دیا اور مذہب اور سیاست کے بھی علیحدہ علیحدہ خانے بنائے، وہ آج کیسے ممکن ہوں گے - پھر بھی یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ حسرت کی سادہ مگر دلآویز شخصیت، اُس کی پُرخلوص اور سحر کار آواز، اُس کی حکایات و احساسات کا جادو، ہمارا بڑا قیمتی ادبی سرمایہ ہے - اُس نے عشق کو زندگی کی بڑی عبادتوں میں شمار کر کے عشق اور زندگی دونوں کی عظمت بڑھائی، اُس نے دردمندی اور سوز و گداز کو اپنے اور دوسروں کے زخموں کو کریدنے کے بجائے، حیات کی چمن بندی کے لئے استعمال کیا۔ اُس کی شاعری زمین کے حسن اور زندگی کی رنگینیوں سے محبت سکھاتی ہے، اس لئے ہمیں بہت سے شعرا کی شاعری سے زیادہ عزیز ہے، گو ہم اُسے وہ درجہ نہیں دے سکتے جو میر، غالب اور اقبال کے لئے مخصوص ہے -

آخر میں ایک بات اور کہنی ہے - شاعری میں جو سادگی ہوتی ہے وہ بھی بالکل فطری نہیں ہوتی - جو پُرکاری یا صناعی ہوتی ہے اُس کے متعلق تو کسی وضاحت کی ضرورت نہیں - میر یا حالی یا انیس کی سادگی بھی محض روزمرہ کی سادگی نہیں ہے - انگریزی شعرا میں ورڈس ورتھ سادہ اور فطری رنگ کا علم بردار تھا، مگر اُس کی سادگی بھی ایک کاریگری لئے ہوئے ہے، مگر ورڈس ورتھ کے رنگ سخن نے اٹھارویں صدی کے مصنوعی رنگ شاعری کو بدلا اور اُسے فطرت اور زندگی اور روزمرہ بول چال سے قریب کیا۔ ملٹن اور غالب کا رنگ کہنے کو "مصنوعی" ہے - مگر اُن دونوں کی صناعی شاعری کو عظمت و رفعت عطا کرتی ہے - ان دونوں کے نقالوں نے صناعی کو لے لیا، فکر کی عظمت کو نہ اپنا سکے - اس لئے ملٹن کی طرح غالب کا رنگ بھی اپنے اندر بڑے خطرے رکھتا ہے - حسرت کی شاعری ان خطروں سے اپنے آپ کو بچانے کی بڑی اچھی مثال ہے - حسرت نے جذبات اور اُن کی نرم و نازک موجوں کے اظہار کے لئے عام طور پر سادگی اور پرجوش بیان سے کام لیا - انھوں نے غالب کی تحلیلی نظر اور نکتہ سنجی سے احتراز کیا - وہ اپنے اور غالب کے ذہن کا فرق جانتے تھے - ہاں غالب کی طرح استعارے سے بلاغت اور رمزیت میں اضافہ کیا - حسرت چونکہ عشق اور زندگی دونوں کے رمز شناس ہیں اسلئے انھوں نے سادہ کیفیات کے پرجوش بیان پر اکتفا کی، ان کیفیات کو ذہنی پیچ و خم دینے کی کوشش نہ کی - اس لئے عام پڑھنے والوں کے علاوہ حسرت کی شاعری شعرا کے لئے بھی بہت اچھا نمونہ ہے - وہ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ کس کیفیت کے لئے کون سا اسلوب و لہجہ موزوں ہے اور اُس لب و لہجہ کے لئے الفاظ کا دروبست کیسا ہونا چاہئے - اردوئے معلی اسی لئے جاری کیا گیا تھا کہ اُس سے پڑھنے والوں کا مذاق درست ہو - اُن کی شاعری بھی ذوق سخن کے لئے صحت و موزونیت کا ایک زندہ سبق ہے -

بیاض حسرت

میلی ہروی

من بخبر از خویش و دل از کار فتادہ — گویا کہ بسویم نظر یار فتادہ
در کوئے تو افسانۂ میلی بزبانہا — از آمدن و رفتن بسیار فتادہ
چو مرا بہ بزم بیند ز بیاں کنار گیرد — عجب است کیں قدر ہا ز من اعتبار گیرد
بر ہش نہ تا صبح آید ز پئے نصیحت من — کہ بایں بہانہ او ہم سر راہ یار گیرد

حسرتؔ کی سیاسی زندگی

(مولانا سید سلیمان ندوی)

سید فضل الحسن حسرتؔ موہانی مرحوم کی شدتِ علالت کی خبریں ہلال (پاکستان) کے اخباروں میں کئی ہفتوں سے چھپ رہی تھیں کہ دفعتاً ۱۵ مئی سنہ ۱۹۵۱ء کے ریڈیو میں ان کی وفات کی خبر آئی، حسرتؔ مرحوم ابھی چند ماہ ہوئے کہ اسی سال سنہ ۱۳۶۹ھ کے حج سے فارغ ہو کر جدہ سے کراچی آئے تھے، دیکھا کہ اُن کا گداز جسم ضعف سے سکڑ گیا ہے۔ اُسی وقت خیال آیا کہ یہ حضرت بھی جگہ خالی کرنے والے ہی معلوم ہوتے ہیں، کراچی سے واپس جا کر شاید ہی کچھ دن اچھے رہے ہوں کہ علالت کی خبریں آنے لگیں۔

حسرتؔ ضلع اُناؤ کے مردم خیز قصبہ موہان میں نیشاپوری سادات کے خاندان میں سنہ ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے، قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم موہان ہی میں حاصل کی، اس کے بعد اُردو مڈل اسکول میں داخل ہوئے اور اس امتحان میں تمام صوبہ میں ممتاز رہ کر سرکاری وظیفہ حاصل کیا، اور مزید تعلیم کے لئے فتح پور ہسوہ جا کر گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے، اور انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔

فتحپور ہسوہ کی آب و ہوا حسرتؔ کی ادبی و ذہنی و دینی تعلیم کے لئے بہت راست آئی، یہاں مولانا سید ظہور الاسلام صاحب ایک نہایت متقی و پرہیزگار اور باصفات بزرگ تھے، حضرت قطب الوقت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے مرید و خلیفہ تھے، ندوۃ العلماء کے ارکان خاص میں تھے، اس لئے خاکسار کو بار بار اُن کی زیارت کا موقع ملتا رہا، بلکہ میرے بچپن میں وہ مولانا محمد علی صاحب مونگیری کے ساتھ خاکسار کے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ تشریف لائے تھے، تو پہلے پہل وہیں اُن کی زیارت ہوئی تھی، حسرتؔ مرحوم کو انہی پاک مشرب و پاک نہاد اور پاکباز بزرگ کی صحبت حاصل ہوئی، ان کے علاوہ مولانا نور محمد اور مولانا حبیب الدین صاحب جیسے بزرگوں کا فیض بھی نصیب ہوا، بچپن ہی میں وہ قادری سلسلہ میں مولانا شاہ عبدالوہاب صاحب فرنگی محلی (پدر بزرگوار مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی، یعنی جدِ بزرگوار مولانا جمال میاں صاحب فرنگی محلی) کے مرید ہو چکے تھے، اور اسی سلسلہ سے سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے اُن کو عقیدت خاص تھی، اور بزرگانِ فرنگی محل سے بھی ان کو نسبت حاصل تھی، یہی وجہ تھی کہ ہزاروں انقلابات کے باوجود حسرتؔ اپنی مذہبی زندگی اور صوفیانہ مشرب میں ہمیشہ غیر متزلزل رہے۔

فتحپور ہی میں اُن کی شاعری کی زبان بھی کھلی، کچھ مخصوص احباب کی صحبت میں ادبی ذوق پیدا ہوا اور عمر کے ساتھ یہ ذوق بڑھتا گیا، فتحپور سے انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ میں جا کر داخل ہوئے، وہ ذوق و صحبت اور لطف لطافت کے اس مرکز میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، سُنا ہے کہ چونکہ وہ شرفائے اودھ کے لباس اور وضع میں تھے اور ساتھ ہی اودھ کی پُرانی وضع کا بڑا سا پاندان بھی ساتھ تھا، کالج کے دستور کے مطابق بے تکلف دوستوں نے انکو خالہ جان کا خطاب دیا، مگر خالہ جان نے بھانجوں کی شرارت اور چھیڑ چھاڑ کی کبھی پروا نہ کی اور اپنے مذاق طبیعت پر برابر جمے رہے، وہاں شعر و سخن کی ایک نئی مجلس اُردوئے معلیٰ کے نام سے قائم کی اور ان کے وجود سے شعر و سخن کے چرچے نے کافی ترقی کی، کالج کے یونین میں بارہا تقریریں کیں اور نظمیں سُنائیں اور حاضرین اور نواب محسن الملک سے دادِ تحسین حاصل کی۔

مرحوم نے سنہ ۱۹۰۳ء میں بی، اے کی ڈگری حاصل کی اور مذاقِ زمانہ کے خلاف کسی اعلیٰ ملازمت کے بجائے علم و فن اور شعر و سخن کی خدمت کا تہیہ کیا، اور اُردوئے معلیٰ کے نام سے ایک بلند پایہ ادبی رسالہ علی گڑھ سے جاری کیا، اس سے دو تین سال پہلے مخزن لاہور سے نکل چکا تھا، اُردوئے معلیٰ نوجوان جدید

[illegible] تعلیم یافتہ گروہ کی ادبی خدمت کا دوسرا قدم تھا، مگر مرحوم کی طبیعت میں جو تضاد تھا، اُس کا [illegible] زنتیجہ تھا کہ اُردوئے معلیٰ کے صحن میں شعر و سخن کے چمنستان کے [illegible] کچھ سیاست کا خارستان بھی نظر آیا، چنانچہ اُس زمانہ میں جب مسلمان سیاسیات سے جھجکتے [illegible] علی گڈھ کا یہ نوجوان بیباک گریجویٹ کانگریس میں شامل ہوگیا اور سنہ ۱۹۰۴ء میں بمبئی کے اجلاس کانگریس میں ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہوا اور سورت [illegible] کانگریس تک یہ برابر شریک رہے، سورت کانگریس کے اختلاف کے بعد یہ تلک کی رہبری میں کانگریس سے الگ ہوگئے۔

اُردوئے معلیٰ میں شعر و سخن کے پھول اور سیاسیات کے کانٹے ایک ساتھ ناظرین کے سامنے پیش ہوتے رہے اور لوگ حسب مذاق اس دورنگی سے لطف اندوز ہوتے رہے، اس زمانہ کے اُردوئے معلیٰ میں اُن کے اور دوسرے اصحاب ذوق کے خوب خوب ادبی مضامین نکلے، اُس وقت کی ایک دلچسپ ادبی بحث یاد ہے، اقبالؔ کی شہرت کا آغاز تھا، انھوں نے کسی نظم میں "اُن سے کہا" اور "اُن کو کہا" کے موقع استعمال میں غلطی کی تھی۔ حسرتؔ نے اس پر اُنکو ٹوکا اور ان دونوں محاوروں کے فرقِ استعمال کو سمجھایا۔

پانچ برس تک اُردوئے معلیٰ نکلتا رہا سنہ ۱۹۰۸ء میں اس میں ایک بے نام صاحب قلم کا ایک مضمون مصر کے نامور لیڈر مصطفیٰ کامل کی موت پر شایع ہوا، جس میں مصر میں انگریزوں کی پالیسی پر بے لاگ تنقید تھی، یہ مضمون سرکار کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا اور علی گڈھ کی سلطنت میں بغاوت کا پہلا جرم تھا، نتیجہ یہ ہوا علی گڈھ کالج کی حرمت کو بچانے کے لئے کالج کے بڑے بڑے ذمہ داروں نے حسرتؔ کے خلاف گواہی دی، یہاں تک کہ نواب وقار الملک نے بھی ایک دو فقروں میں مضمون مذکور کی مذمت ہی کی پاداش میں حسرتؔ مرحوم کو دو برس کی قید سخت کی سزا ہوئی، ان کا کتب خانہ اور پریس پولیس کے ظلم و ستم کے نذر ہوگیا، اس کتب خانہ میں شعراء کے تذکرے اور دواوین کے بڑے نادر نسخے تھے۔

یہاں حسرتؔ کے ایک کیرکٹر کا ذکر کرنا ہے، مضمون مذکور حسرتؔ کا نہ تھا، مگر مقدمہ قایم ہونے پر حسرتؔ نے اُس کو خود اوڑھ لیا اور باوجود اصرار کے اُس کے لکھنے والے کا نام نہیں بتایا، جہاں تک کان میں پڑی ہوئی بات اس وقت یاد آتی ہے، خیال آتا ہے کہ یہ مضمون اعظم گڈھ کے مشہور شاعر وکیل اقبال سہیل کا تھا، جو اُنہی کی طرح شعر و سخن اور سیاسی مذاق کا اتحاد رکھتے تھے۔

حسرتؔ مرحوم سے میری ملاقات قید سے چھوٹنے کے بعد سنہ ۱۹۱۰ء میں ہوئی، اور وہ اس طرح کہ میں دار العلوم ندوہ سے فارغ ہوکر "الندوہ" کا سب اڈیٹر اور مدرسہ میں مدرس تھا، مدرسہ کے قریب ہی گولہ گنج میں نواب مرشد آباد کے مکان کے ایک کمرہ میں رہتا تھا، یہ وہی مکان ہے جس میں ابا اخبار حق کا دفتر ہے، میں اپنی کوٹھری میں تھا کہ ایک صاحب نے آکر اطلاع دی کہ باہر ایک صاحب کھڑے ہوئے تم کو بلاتے ہیں، باہر نکلا تو حسرتؔ تھے، میں نے کہا کہ آپ نے تکلیف کیوں کی، اندر کیوں نہیں چلے آئے، اُس زمانہ کی سیاسی حالت کی پستی کا اندازہ کیجئے، حسرتؔ نے جواب دیا کہ چونکہ لوگ مجھ سے ملتے ہوئے گھبراتے ہیں، اس لئے میں نے احتیاط کی راہ سے مطلع کر دیا، میں حسرتؔ صاحب کو اپنے کلبۂ احزان میں لایا، اوپر چھت پر جو کمرہ تھا، اُس میں بستی اور گورکھپور کے کچھ احباب تھے، جو کرسچین کالج میں پڑھتے تھے، آرام کے خیال سے رات کو سونے کے لئے وہاں اُن کے لئے انتظام ہوا، ہاں یہ بتا دینا چاہئے کہ اس وقت سیاست میں سودیشی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا، یہ سردی کا زمانہ تھا، میزبانوں نے اُن کے پائتانہ کمبل رکھ دیا تھا، وہ کمبل ولایتی تھا، حسرتؔ نے رات سردی میں اسی طرح کاٹ دی، مگر وہ کمبل نہیں اوڑھا۔

اس کے بعد حسرتؔ کا جب لکھنؤ آنا ہوتا، تو ہمارے دار الاقامہ میں آتے اور سیاست پر باتیں کرتے اور تلک مہاراج کے سیاسی خیالات اور سیاسی عزایم کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کرتے اور ہندوستان کی آزادی کی پیشین گوئی جس یقین اور عقیدہ کی پختگی کے ساتھ کرتے، اُس پر ہم کو بڑا تعجب آتا اور سیاسیات کی ہر مشکل آسان نظر آنے لگتی۔

مسلمان سنہ ۱۹۰۶ء تک ہندوستان کی سیاست سے بالکل الگ تھلگ تھے، ایک مدراس کے سید محمد کا نام کانگریس میں کبھی کبھی سنائی دیتا تھا، یا جسٹس طیب جی کا خیال کبھی کبھی ظاہر ہوتا تھا، مولانا شبلی مرحوم خیال کی حد تک کانگریس کے ساتھ تھے۔ مگر بہادر نوجوان حسرتؔ پہلا شخص ہے جس نے علی گڈھ کی پالیسی کے برخلاف جہاد کا علم بلند کیا اور اُردوئے معلیٰ ادب کے ساتھ [illegible] بھی بنایا، اُسی زمانہ میں دو عالموں کے مضامین کانگریس کی حمایت میں اُردوئے معلیٰ میں چھپے تھے، جن میں مسلمانوں کو سیاست کی دلیرانہ تعلیم دی گئی ہے، اُن میں ایک

مضمون توحید، آباد دکن کے ملا عبدالقیوم صاحب کا تھا، جو دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن کے بانیوں میں سے ایک ہے: کہ مسلم لیگ کا تھا۔ بمبئی وہ مقام برکت اللہ صاحب، مرحوم کا تھا، جو پہلی جنگ عظیم سے بہت پہلے ہندوستان چھوڑ کر یورپ چلے گئے تھے اور آخیر وقت تک اسلام کا بین الاقوامی محب علامہ صاحب مضامین لکھا کرتے تھے، اور ہندوستان کے دوسرے آزادی خواہ ہندوستانی نوجوانوں کی یورپ میں رہبری کرتے تھے، سنہ ۱۹۲۶ء تک وہ زندہ تھے اور سوئزرلینڈ میں قیام تھا، اور خلافت کے احیاء کے لئے کوشاں تھے، وہیں انتقال بھی کیا، مسئلہ خلافت پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی، جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔

قید سے چھوٹنے کے بعد حسرت کے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ وہ اس سیاست سے باز آجائیں، لیکن انھوں نے اس مخلصانہ نصیحت پر کان نہیں رکھا، دوستوں نے ساتھ چھوڑ دیا، اُردوئے معلیٰ کے قدردانوں نے خریداری ترک کر دی، لوگوں نے ملنے جلنے سے احتراز شروع کر دیا مگر ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

حسرت اپنے عقیدہ میں اور پختہ ہوتے چلے گئے اور شروع سے جو اصول قایم کیا تھا، اُس میں سرمو فرق آنے نہ دیا۔

بوڑھوں میں صرف ایک مولانا شبلی مرحوم تھے، جنھوں نے ابتدا ہی میں حسرت کی تائید کی اور سنہ ۱۹۰۶ء میں اُردوئے معلیٰ کا پہلا سیاسی مضمون پڑھ کر داد دی تھی، اور لکھا تھا:-

این کہ گفتی حکایتِ سحر است　　روز روشن ہنوز در قدر است

حسرت مسلمانوں میں سب سے پہلے شخص ہیں، جنھوں نے سودیشی تحریک کی رہبری کی، حسرت ہمیشہ کے غریب تھے، اور یہ غربت ان معنوں میں اُن کی اختیاری تھی کہ کالج کے دوسرے تعلیم یافتوں کی طرح انھوں نے سرکاری نوکری کی راہ اختیار نہیں کی، اور اس امارت اور تعیش کی زندگی پر افلاس اور عسرت کی زندگی کو ترجیح دی، انھوں نے چند آنے گز سے زیادہ کپڑا نہیں پہنا، اور ولایتی کپڑے کو ہاتھ نہیں لگایا، اب انھوں نے سودیشی تحریک میں عملاً حصہ اس طرح لیا کہ سودیشی اسٹور کے نام سے سودیشی کپڑوں کی دوکان قایم کی، اور چاہا کہ ملک میں اس کی شاخیں جا بجا قایم کی جائیں، اُنکے اس کام میں نواب وقار الملک جو خود بھی اس سادگی پر عامل تھے اور مولانا شبلی مرحوم نے اُن کی مدد کی، ان دونوں کی سفارش پر سر فاضل بھائی کریم بھائی سے ، اور مولانا کی سفارش سے سر فاضل بھائی سے قرض کپڑا خریدا، اور اسٹور قایم کر دیا، اُن کی تجارتی سرگرمی کو دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم نے اُن سے کہا تھا کہ "تم آدمی ہو یا جن، پہلے شاعر تھے، پھر پالیٹیشن بنے، اور اب بنیئے ہو گئے" اُن کی یہ دوکان چل نکلی تھی کہ پے در پے سیاسیات کے انقلابات نے ان کو کبھی بنیا بن کر اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیا، اس لئے وہ نفع سے زیادہ خسارہ ہی اُٹھاتے رہے۔

اسی زمانہ میں مسلمانوں میں کسی سیاسی تنظیم قایم کرنے کا خیال ایک بوڑھے اور ایک پختہ کار جوان کے ذہن میں آیا، یہ بوڑھے نواب وقار الملک اور پختہ کار جوان مظہر الحق صاحب بیرسٹر پٹنہ تھے، مظہر الحق صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ انھیں کی کوٹھی تھی، جس میں سب سے پہلے انھوں نے اور نواب وقار الملک نے مل کر مسلم لیگ کا قالب کھڑا کیا، اور شہر ڈھاکہ اس لحاظ سے مبارکباد کے قابل ہے، جہاں خواجہ سر سلیم اللہ صاحب مرحوم کی دعوت پر سنہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا پہلا اجتماع ہوا، اس کے بعد تاریخ کے ورق جلد جلد اُلٹنے لگے، اُس وقت ہندوستان کی سیاست میں بنگال اور پونہ سب سے آگے تھے، اُن کے مقابلہ کے لئے انگریز ہی تھے، جو پس پردہ مسلمانوں کو سیاست کے اسٹیج پر لائے، مگر لحاظ کے قابل یہ ہے کہ جس راہ کو برادرانِ وطن نے پچیس برس میں طے کیا تھا مسلمانوں نے اس کو صرف چھ برس میں طے کر لیا، اس کے لئے سازگار حالات بھی پیش آئے، جن میں سیاسی جراثیم کو اپنے نشو و نما کے لئے مناسب آب و ہوا اور فضا ہاتھ آئی۔

سب سے پہلی چیز جس نے مسلمانوں میں سیاسی انقلاب کی لہر دوڑائی، وہ سنہ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی منسوخی تھی، بنگالیوں کی سیاست کا زور توڑنے کے لئے لارڈ کرزن نے یہ مناسب سمجھا کہ بنگال کو مشرقی و مغربی بنگال میں تقسیم کر دیا جائے، اس تقسیم سے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو ایسی اکثریت حاصل ہو گئی کہ وہ دفعتاً ہندو بنگالیوں کے سیاسی غلبہ کی دستبرد سے باہر نکل آئے اور اس لئے مسلمانوں نے اس کا بہت خوشی سے خیر مقدم کیا، لیکن ہندو بنگالیوں نے اس کے برخلاف نہایت شدت اور زور و قوت سے تمام ملک میں تحریک اُٹھائی اور علانیہ باغیانہ مضامین لکھے اور باغیانہ تقریریں کی جانے لگیں، بلکہ

۔۔۔ مدت تک انگریز اس کو "طے شدہ مسئلہ" کہکر اپنی ہمت کا اظہار کرتے رہے مگر بالآخر انکی طاقت صبر ۔۔۔ میں بنگال کی تقسیم کو منسوخ کرکے دونوں بنگالوں کو پھر ایک کر دیا۔

اُن کی اس پالیسی سے جو بنگالی ہندوؤں کو رام کرنے کی خاطر کی گئی تھی، مسلمانوں میں بڑی برہمی پیدا ہوگئی، اور بقول مولانا شبلی مرحوم سب سے پہلا بہادرانہ مضمون جس نے مسلمانوں کی سیاسی کروٹ بدل دی، وہ نواب وقارالملک مرحوم کا باوقار اور سنجیدہ مضمون تھا، جو "مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" کے نام سے "مسلم گزٹ" لکھنؤ میں چھپا، ان مضامین نے مسلمانوں کی سیاسی ہوا کا رُخ بدل دیا۔

ابھی یہ آگ لگی ہی ہوئی تھی کہ سنہ ۱۹۱۳ء میں کانپور میں ایک مسجد کے انہدام کا واقعہ پیش آیا، جس نے لگی ہوئی آگ میں تیل کا کام کیا اور پورے ملک میں اس سے آگ سی لگ گئی۔

یہی زمانہ تھا، جس میں آغاخاں کی سرپرستی میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک ہندوستان میں کھڑی ہوئی اور مسلمان اُس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن چندہی روز کے بعد یہ سامان سکینت ایک نئے اضطراب کا پیش خیمہ بن گیا، یعنی یہ یونیورسٹی کن اختیارات اور شرائط کے ساتھ لی جائے، اس بحث نے مسلمانوں میں نرم وگرم دو فریق پیدا کر دئے، اور یہی وہ وقت ہے کہ جب مسلمانوں میں احرار نے جنم لیا، جن کے رہبروں اور رہنماؤں میں محمد علی مرحوم شوکت علی مرحوم، مولانا ابوالکلام، ظفر علی خاں اور حسرت موہانی تھے اور یہیں سے حسرت موہانی کو سید الاحرار کہا جانے لگا اور وہ مسلم لیگ جو ابھی چھ برس پہلے بنی تھی، پرجوش نوجوانوں اور مصلحت اندیش بوڑھوں دو حصوں میں منقسم ہوگئی، اور یہ تفریق روز بروز بڑھتی گئی۔

مسلم لیگ میں بھی یہ تفریق روز بروز نمایاں ہورہی تھی، آغاخاں کے بعد راجہ محمد علی محمد خاں محمود آباد کا زور بڑھ رہا تھا، مسجد کانپور کے ہنگامہ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی شخصیت سب سے پہلی دفعہ نمایاں ہوئی، اور سید علی امام وغیرہ کی کوشش سے اس کا اختتام مصالحت پر ہوا، حسرت آغاخاں کی لیگ میں شریک نہیں تھے، مگر جیسے جیسے لیگ میں آزادی بڑھتی گئی وہ اس کے قریب آتے گئے اور اب مسلم لیگ میں داخل تھے۔

مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ آگرہ (سنہ ۱۹۱۴ء) میں جو مسجد کانپور کے ہنگامہ کی مصالحت کے بعد ہی ہوا تھا، حسرت شریک تھے (اور میں بھی اس اجلاس میں شریک تھا) سردیوں کا زمانہ تھا، شب کے جلسے میں مصلحت پسندوں نے لارڈ ہارڈنگ کے شکریے کا رزولیوشن پیش کیا، یہ وہ موقع تھا، جب ان مصلحت پسندوں کے ساتھ بہت سے احرار بھی اس کی تائید میں تھے، ایسے نازک موقع پر صرف دو نوجوان اس کی مخالفت میں اُٹھے، ایک حسرت موہانی اور دوسرے مولوی عبدالودود بریلوی مرحوم۔

اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آیا، اس زمانہ میں مسلمانوں کے احساس میں ایسی شدت آگئی تھی کہ ذرا ذرا سی بات سارے ملک میں اشتعال کا باعث ہوجاتی تھی، سنہ ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی نعمانی نے دارالعلوم ندوہ کی معتمدی سے مخالف ارکان کی مخالفتوں سے زچ آکر استعفا دیدیا تھا، دارالعلوم کے طلبہ نے اس پر اسٹرائک کی، ایسی پر زور اسٹرائک اس سے پہلے کسی درسگاہ میں نہیں ہوئی تھی، سارے ملک میں ہنگامہ برپا تھا، مولانا ابوالکلام کا الہلال اس تحریک کا علمبردار تھا، آج کل کے مشہور مصنف مولانا عبدالسلام ندوی نے جو اُس زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ بمبئی میں بطور مددگار تصنیف کے تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی کے نام جو تعلیم سے فارغ ہوکر ندوہ میں مقیم تھے، ایک خط لکھا تھا، جس میں اُن کو مشورہ دیا تھا کہ وہ طلبہ میں شورش پیدا کریں اور آخر میں لکھ دیا تھا کہ یہ مولانا کا حکم ہے، یہ خط مخالفوں نے ڈاک سے اُڑا لیا اور طلبہ کی اسٹرائک کے بعد انھوں نے اخبارات میں اس خط کو شایع کرکے یہ ثبوت بہم پہونچایا کہ یہ اسٹرائک مولانا شبلی صاحب کے اشارہ سے ہوئی ہے، مولانا مرحوم نے اس خط سے اپنی برأت اور لاعلمی ظاہر فرمائی، مولانا عبدالسلام نے اخباروں میں یہ لکھا کہ بے شبہ یہ میرا خط ہے اور مولانا کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، مولانا کے استعفے کی منظوری کی خبر سے مجھے اس درجہ تکلیف ہوئی کہ میرا دماغی توازن قائم نہیں رہا اور میں نے یہ لکھدیا اور زور ڈالنے کے لئے اپنے خیال کو مولانا کی طرف منسوب کر دیا، اس پر اخباروں میں مولانا عبدالسلام صاحب پر بحث شروع ہوگئی اس موقع پر سید حسرت موہانی پہلے شخص ہیں جنھوں نے لکھا کہ مولانا عبدالسلام صاحب نے جو کچھ کیا وہ بہت ٹھیک کیا، اُس کو معذرت کے بجائے جرأت کے ساتھ یہ اقرار کرنا چاہئے تھا کہ ندوہ کی اصلاح کے لئے میں اسٹرائک کو آخری علاج سمجھتا تھا، اس لئے جو کچھ میں نے کیا وہ حق کیا۔

بہرحال یہ واقعہ تو لطیفہ کے طور پر درمیان میں آ گیا، جس سے حسرت کی طبیعت کا رنگ جھلکتا ہے، ذکر مسلم لیگ کا تھا، بمبئی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے مسلم لیگ اور کانگریس کا ملاپ ہوا، یہ ۱۹۱۵ء تھا اور یہی وہ سب سے پہلا اسٹیج تھا، جہاں مرحوم محمد علی جینا[1] (قائد اعظم) مسلم لیگ کے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے سب سے پہلے ظاہر ہوئے، مظہر الحق مرحوم اس کے صدر اجلاس تھے، کانگریس کا اجلاس بھی یہیں تھا، اس سبب سے مسلم لیگ کے اس اجلاس میں ہندو سیاسی لیڈر بھی دوستانہ شریک تھے، ابھی صدارتوں کے خطبے ہی ہوئے تھے کہ بات یاد نہ رہی کہ اسٹیج پر حسرت موہانی مرحوم نمایاں ہوئے، اور انھوں نے کسی چیز کی بڑی شدت سے مخالفت کی، بس ایک ہنگامہ جلسہ میں پیدا ہو گیا، چند پٹھان جوش و خروش سے آگے بڑھے اور اسٹیج پر قابض ہو گئے، آخر جلسۂ عام ملتوی کرنا پڑا، بعد کو معلوم ہوا کہ انگریز حکام کی تحریک سے یاروں کو خوش کرنے کے لئے بمبئی کے بعض سربرآوردوں نے کرایہ کے پٹھانوں کی مدد سے جلسہ کو درہم و برہم کرا دیا، غلط فہمی سے لوگ حسرت مرحوم کی نسبت سوئے ظن کرنے لگے، حالانکہ ان سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، یہ اتفاقی بات تھی کہ اس معمولی سی بات کو لوگوں نے ہنگامہ کا موقع بنا لیا۔

۱۹۱۴ء والی عالمگیر جنگ روز بروز بڑھتی جا رہی تھی، ٹرکی نے اتحادیوں کے برخلاف جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ جس سے مسلمانوں کی ہمدردی خواہ مخواہ جرمنی کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی، تھوڑے دنوں کے بعد انگریزوں کی سازش سے شریف حسین اور امیر فیصل کی سرکردگی میں ٹرکی سے بغاوت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں شریف حسین کے خلاف بھی نفرت پیدا ہو گئی، حضرت مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) اور اُن کے دوسرے رفقا حجاز میں قید ہو کر مالٹا بھیج دئے گئے، ہندوستان میں بھی بڑے بڑے احرار لیڈر نظر بند کر دئے گئے، مولانا ابو الکلام، رانچی میں، اور محمد علی مرحوم اور شوکت علی مرحوم چھندواڑہ میں، لیکن ابھی تک حسرت آزاد تھے اور مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی میں احرار کی سربراہی کر رہے تھے، آخر وہ بھی ۱۹۱۶ء میں پہلے للت پور اور پھر میرٹھ میں قید کر دئے گئے، جس سے جنگ کے بعد چھوٹے، اس قید میں جو جو مصیبتیں حسرت نے جھیلیں اور جس طرح ناخوشگوار حالات کا مقابلہ کیا، وہ اخلاق کی پختگی اور عقیدہ کی استواری کی ایک بڑی مثال ہے۔

اب مسلم لیگ اور کانگریس یک جان و دو قالب تھے، ایک ہی جگہ دونوں کے جلسے ہوتے تھے، اور ایک کے لیڈر دوسرے کے جلسہ میں خاص طور سے ایک وقت شریک ہوتے تھے، اب خلافت کی تحریک شروع ہوئی، مسلم لیگ کے رہنما جن میں اس وقت لکھنؤ کے اندر راجہ صاحب محمود آباد اور چودھری خلیق الزماں اور دوسری طرف مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی خدام کعبہ کی صدر کی حیثیت سے جس کے سکریٹری شوکت علی مرحوم تھے، اس کی سربراہی کے لئے اُٹھے، راجہ صاحب تو پیچھے رہ گئے، اور سرکاری مناصب میں اُلجھ گئے، چودھری صاحب اور مولانا عبد الباری صاحب باہم نبرد آزما تھے، اور آخر دونوں صاحبوں کی شرکت سے خلافت کا یہ پہلا جلسہ مسلم لیگ کے زیر سایہ منعقد ہوا، اس کے بعد خلافت کی تحریک جیسے جیسے زور پکڑتی گئی، مسلم لیگ اُس کے لئے اپنی جگہ خالی کرتی گئی، اب بھی وہ قایم تھی اور اُس کے جلسے بھی ہوتے تھے، مگر اُس میں کچھ جان نہیں رہی تھی، اب خلافت کانفرنس اور کانگریس کا میل بڑھا اور دونوں کے ایک ساتھ اجلاس ہونے لگے۔

اس موقع پر ایک بات یاد آئی، تحریک خلافت کے آغاز میں امرتسر کے اجلاس کانگریس دسمبر ۱۹۱۹ء سے واپسی کے بعد گاندھی جی کے مشورہ سے یہ ضروری سمجھا گیا کہ کام شروع کرنے سے پہلے مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد وائسرائے سے دہلی میں ملاقات کر کے اپنے مطالبات پیش کرے۔ وائسرائے نے ڈیپوٹیشن سے ملنا منظور کیا، اس ڈیپوٹیشن میں نرم گرم ہر قسم کے لیڈر موجود تھے، حکیم صاحب، ڈاکٹر انصاری، محمد علی، شوکت علی وغیرہ سب ہی تھے، خاکسار بھی شریک تھا، اخیر اخیر وقت تک بعض جاہ پسند لوگ اس میں شرکت کے لئے کوشاں تھے اور محرومی سے مایوس نہیں ہوئے تھے، لیکن

---

[1] شاید لوگوں کے لئے یہ بات اچنبھے کی معلوم ہوگی کہ قاید اعظم مرحوم کے نام کا آخری جزو اس وقت تک "جینا" تھا، جس کے معنی گجراتی میں بنئے کے ہیں، ۱۹۱۶ء میں جب وہ لکھنؤ صدر کی حیثیت سے آئے تو سید جالب مرحوم اڈیٹر ہمدم کی ذہانت نے اس کو جناح بنا دیا، جس کے بعد وہ ایسا مشہور ہوا کہ اس نے اصل کی جگہ حاصل کر لی، خود میرا بھی اس زمانہ کا ایک شعر ہے:۔　　ہے مریض قوم کے جینے کی بھی کچھ کچھ امید　　ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا　　"س"

دو مسلمان رہنماؤں کی شان اس میں نرالی رہی، ایک مولانا ابوالکلام آزاد جو مشوروں میں شریک تھے، جلسوں میں شریک تھے، مگر اس ڈیپوٹیشن میں شرکت منظور نہیں کی، حکیم صاحب وغیرہ نے ہر چند اصرار کیا مگر اُن کا انکار ہر اصرار پر غالب رہا، مگر اس سے زیادہ نرالی شان حسرت موہانی کی رہی۔ مولانا ابوالکلام والے طریق سے اپنی ذات کی بڑائی کا اظہار نمایاں ہوتا تھا، مگر حسرت نے یہ کیا کہ ایک طرف تو خاموشی کے ساتھ ڈیپوٹیشن میں شرکت کی، اور وائسرائیگل ہال میں ڈیپوٹیشن کے ممبروں کے ساتھ موجود تھے، لیکن عرض و معروض و جواب کے بعد جب وائسرائے سے ہاتھ ملانے کا اعزازی لمحہ آیا، تو میں نے دیکھا کہ حسرت چپکے سے اُٹھ کر بے ہاتھ ملائے کترا کر اس طرح نکل گئے کہ کسی نے دیکھا بھی نہیں۔

اس کے بعد ترک موالات کی تحریک اُٹھی، ۱۹۲۰ء کے دسمبر میں ناگپور میں کانگریس کا اجلاس تھا، یہی وہ اجلاس ہے جس میں کانگریس نے ترک موالات کی تحریک منظور کی، اس میں حسرت مرحوم اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ موجود تھے۔

یہ بات یوں یاد رہی کہ واپسی میں ہجوم اتنا تھا کہ ریل کا سفر دشوار معلوم ہوتا تھا، حسرت صاحب نے ہمت دلائی کہ تم میرے ساتھ چلو، چنانچہ اسٹیشن پہونچا، تو دیکھا کہ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبہ میں حسرت مع اپنی بیگم صاحبہ کے بیٹھے ہیں، اور اس میں اتنا ہجوم ہے کہ سر کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کسی طرح سوار ہوا تو دیکھا کہ ایک مرگ چھالے پر حسرت صاحب متمکن ہیں، مٹی کا لوٹا اور مٹی کے برتن ساتھ ہیں، اسی میں کھانا پینا ہے، ہجوم کی کوئی پروا نہیں ہے، دوسری طرف پنڈت موتی لال کا سامان فرسٹ کلاس کے ڈبہ میں لگ رہا ہے اور وہ آرام سے اُس میں سوار ہو رہے ہیں، اسوقت میری زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ یہ سیاسی جھگڑوں کا سفر دو ہی آدمیوں کے لئے موزوں ہے، حسرت جیسے بے نوا، یا موتی لال جیسے باسر و سامان کے لئے، اس کے بعد واقعتاً مجھے کانگریس کے کئی اجلاس میں شرکت کا موقع بہت ملا۔

اب ۱۹۲۱ء کا سال آیا جب گاندھی جی کانگریس پر چھائے تھے، اور ادھر خلافت کے لیڈر محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں ڈاکٹر کچلو، ظفر علی خاں، تصدق شروانی، ڈاکٹر محمود، مولانا ابوالکلام، حسرت موہانی وغیرہ تھے، ترک موالات کا زور تھا، اخیر دسمبر ۱۹۲۱ء گاندھی جی نے ہندوستان کے سوراج ملنے کی آخری تاریخ مقرر کی تھی، احمد آباد میں کانگریس کا یہ تاریخی جلسہ تھا، محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام نظر بند تھے، باقی حضرات شریک تھے، ڈاکٹر انصاری اور سید محمود کے ساتھ اجلاس میں، میں بھی تھا، اجلاس کے پنڈال سے باہر مسلمانوں کی قیام گاہ کے سامنے ایک شامیانے میں مغرب کے بعد خاص مسلمانوں کا جلسہ تھا، حکیم صاحب وغیرہ موجود تھے، گاندھی جی خاص طور سے مسلمانوں سے کچھ کہنے کے لئے آئے ہوئے تھے، اتنے میں دیکھا کہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی سے گھبرائے ہوئے بھاگتے ہوئے دو والنٹیر آئے اور گاندھی جی سے نہایت اضطراب کے ساتھ کہا جلد ہی چلئے سبجکٹ کمیٹی میں حسرت موہانی صاحب نے ہندوستان کے استقلال (انڈپنڈنس) کی تجویز پیش کر دی ہے اور کسی طرح واپس نہیں لے رہے ہیں، فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی گولہ آ کر پڑا ہے، چنانچہ گاندھی جی وغیرہ بھی گھبرائے ہوئے جلسہ سے اُٹھ کر سبجکٹ کمیٹی میں چلے گئے، مگر حسرت ؎

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

حسرت بدستور اپنی بات پر جمے رہے، اور نوٹس دیا کہ وہ اس کو کھلے اجلاس میں پیش کریں گے، چنانچہ وہ وقت آیا، جب کھلے اجلاس میں حسرت نے ہندوستان کے استقلال کی تجویز پیش کی اور آنکھوں نے دیکھا کہ ہزاروں کے مجمع میں ایک آواز بھی اُس کی تائید میں نہیں اُٹھی، پھر نیرنگ قدرت کا تماشا دیکھئے کہ اُس کے آٹھ برس کے بعد لاہور کے اجلاس کانگریس میں ۱۹۲۹ء میں پنڈت جواہر لال نے یہی ریزولیوشن پیش کیا اور کانگریس نے اس کا خیر مقدم کیا، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی خود مختاری کا پہلا اعلان حسرت موہانی کی زبان سے ہوا، اس کے بعد وہ گاندھی جی کی کانگریس سے بھی علاحدہ ہو گئے، حسرت مرحوم نے مجھ سے ایک دفعہ کہا تھا کہ گاندھی جی چینی فلسفی کی طرح ہر کلام میں دو متضاد پہلو رکھتے ہیں اور بیک وقت دونوں کو حق سمجھتے ہیں ــــ کمیونزم اور بالشویزم کے ظہور کے بعد اقتصادی امور میں اُن کا میلان اس کی طرف بھی ہو گیا تھا اور اپنے کو مسلمان کمیونسٹ کہتے تھے، اُن کی عقیدت اس باب میں یہاں تک تھی کہ تقسیم سے چند سال پہلے وہ مسلم لیگ کے کسی وفد کے ساتھ اعظم گڈھ آئے تھے، تو دارالمصنفین بھی تشریف لائے دوران گفتگو میں ایک تازہ سیاسی نظم سنائی، جس کا ایک قافیہ سُوِیَّت تھا، اور وثوق کے ساتھ فرمایا کہ روسی لفظ سوویٹ حقیقت میں عربی لفظ سَوِیَّت ہے، جس کے معنی برابری کے ہیں۔

کانگریس سے ہٹنے کے بعد ایک اور سیاسی پارٹی مولانا آزاد سبحانی کے ساتھ مل کر قایم کی تھی، مگر وہ چل نہ سکی، کانگریس اور لیگ کے متفقہ الکشن کے بعد جب مشترکہ لیگ و کانگریس وزارت بنانے کا اصول کانگریس نے تسلیم نہیں کیا، اور مسلم لیگ نے نئے جوش و خروش کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک نیا دور شروع کیا اور ایک نئے مقصد حیات کی طرح ڈالی تو حسرت موہانی مرحوم نے مسلم لیگ میں بیش از بیش شرکت کی، یہاں تک کہ وہ کانگریس سے بالکل علیحدہ ہو کر خالص لیگی ہو گئے اور اُن کوششوں میں شریک ہو گئے جو مسلم لیگ پاکستان کے حصول کے لئے کر رہی تھی، وہ اس کی مجلس عاملہ کے ارکانِ خاص میں تھے، لیکن یہاں بھی ان کی شان نرالی تھی، قائد اعظم مرحوم کسی اختلاف کو کم برداشت کر سکتے تھے، مگر ایک حسرت موہانی کی ذات تھی جو اپنے خیال میں جس کو حق سمجھتے تھے اُس کے اظہار میں کسی سے مرعوب نہیں ہوئے، بلکہ وہی ہیں جنھوں نے مسلم لیگ میں بھی استقلال اور خود مختاری کا رزولیوشن پیش کیا۔

پاکستان بننے کے بعد انھوں نے ہندوستان ہی میں قیام پسند کیا، اس کی پارلیمنٹ کے ممبر رہے اور تنہا وہ تھے جو پوری پارلیمنٹ کی مخالفت کے باوجود اپنی رائے کے اظہار میں بے باک تھے، نہ کسی کے غصہ پر دھیان اور نہ کسی کی ہنسی کی پروا، نہ کسی کی تحقیر پر افسوس، نہ کسی کی نفرین کا جواب ایک دھن تھی جو اُن کو اپنی منزلِ مقصود کی طرف لئے چلی جا رہی تھی۔

حسرت خواہ کسی قدر بے ضرر رہے ہوں مگر انگریزی عہد میں وہ بڑے خطرناک سمجھے جاتے تھے، وہ کہیں جائیں، ایک خفیہ پولیس کا آدمی اُنکے ساتھ رہتا تھا، اسٹیشنوں پر اُن کی آمد کی اطلاع کر دی جاتی تھی، مگر وہ بھی عجیب دلچسپ آدمی تھے، ہمیشہ پولیس اور ریلوے کے آدمیوں کو انھوں نے دھوکہ دیا، وہ کہتے تھے کہ میں ٹکٹ منزلِ مقصود سے آگے پیچھے کا لے لیتا ہوں، اور بیچ میں اُتر جاتا ہوں، پولیس حیران ہوتی ہے، کبھی یہ کرتے کہ اپنے بجائے دوسرے کو بھیج کر ٹکٹ منگوا لیتے اور پتہ بھی نہ چلتا، پھر یہ ہونے لگا کہ درمیان راہ میں اُن کے ٹکٹ کا نمبر چیک ہوتا۔

ایک دفعہ یہ ہوا کہ ٹکٹ چیکر مسافروں کے ٹکٹ دیکھنے لگا، حسرت تاڑ گئے، وہ چکر کاٹ کر دوسری طرف چلے گئے، ٹکٹ چیکر کو جب خوب حیران کر چکے، تو سامنے آکر فرمایا، کیا تم یہ نمبر ڈھونڈ رہے ہو، اس سے زیادہ لطیفہ یہ ہوتا تھا کہ وہ راہ میں کسی سے اپنا ٹکٹ بدل لیتے تھے، حسرت تو اسٹیشن سے اُتر کر چلتے ہوتے، اور دوسرا ناکردہ گناہ حسرت بنا پولیس کو احمق بنا رہا ہے۔

ایک دفعہ میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، خدا جانے کس جلسہ کی تقریب سے میں اور وہ دونوں دلی میں تھے، مغرب کے بعد حسرت نے کہا چلو کامریڈ کے دفتر میں کوچۂ چیلان چلیں، راستہ نہ انھیں یاد تھا نہ مجھے، فرمایا چلو ایک رہبر ساتھ ہے اُس سے پوچھیں، انھوں نے ایک صاحب کو پکارا کہ بھئی چھپ چھپ کے کیوں چل رہے ہو ساتھ چلو، ذرا کامریڈ کا دفتر بتاؤ، اب وہ صاحب سامنے آئے، تو میں نے دیکھا کہ کسی عربی مدرسہ کے طالب العلم کے لباس میں ایک صاحب ہیں، وہ بے تکلف آگے آگے چلے، اور ہم لوگ پیچھے، حسرت نے کہا یہ ہمارے ہمزاد ہیں، یہ یا ان کے بھائی ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور ایسے مشکل وقتوں میں وہ کام آتے ہیں۔

اب تک جو گفتگو کا سلسلہ چلا آیا وہ سارا سیاسی تھا، حسرت پکے دیندار تھے، وہ کانگریسی بھی رہے اور اپنے کو سوشلسٹ بھی کہتے تھے، مگر بچپن سے موت تک وہ سچے اور پکے دیندار مسلمان رہے، وہ نہ صرف مسلمان بلکہ صوفی مسلمان تھے، اور صوفیوں میں بھی وہ صوفی تھے، جن سے بزرگوں کا کوئی مزار اور کوئی عرس اور کوئی قوالی کی مجلس چھوٹتی نہ تھی، خصوصاً فرنگی محل اور ردولی کی مجلسیں۔

حجاز پر ۱۹۲۴ء میں ابن سعود کے قبضہ کے بعد سے چونکہ وہ وہابیت سے ناراض تھے، اس لئے وہ اس قبضہ سے خفا تھے، لیکن با ایں ہمہ انھوں نے حرمین کی زیارت کی توفیق انھیں وہابیوں کے عہد میں پائی، اس حج کے بعد وہ وہابیوں سے خفگی کے باوجود کچھ ایسے اس سرزمین اقدس کے دلدادہ ہوئے کہ چند سال ہوئے متواتر ہر سال حج کو جاتے رہے اور حکومت کے مہمان ہوتے رہے۔

حسرت جیسی متضاد طبیعت کا انسان شاید ہی منصۂ شہود پر آیا ہو، سیاسیات اور قید و بند کے ساتھ شعر و سخن کی چمن بندی اور آبیاری بہت کم جمع ہو سکتی تھی، لیکن حسرت کے مزاج میں دونوں چیزیں جمع تھیں، اور خود حسرت کو بھی اس اجتماعِ ضدین پر تعجب تھا، جیسا کہ خود ہی کی ایک غزل میں انھوں نے کہا ہے

کیا طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی ؎ ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی

غزل کو لکھنؤ کے تصنع اور غالب کی مشکل گوئی کے کوچہ سے سادگی اور آسان گوئی، اور حقیقت رسی کی منزل تک پھیر کر لانا شاعری میں حسرت کا تجدیدی کارنامہ ہے، حسرت کا مکمل دیوان ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے[1] متفرق دواوین چھوٹے چھوٹے دیوانوں کی صورت میں اکثر چھپتے رہے، بیچاری بیگم حسرت جب تک جیتی رہیں، شوہر کی قید کی صورت میں اکثر وہ ان کے دواوین مختلف ترتیبوں سے چھپوایا کرتی تھیں، ضرورت ہے کہ حسرت کا ایک مکمل دیوان صحت و اہتمام کے ساتھ یادگار کے طور پر چھپوایا جائے اور ان کی دوسری سیاسی اور ادبی تحریروں کو جمع کیا جائے، حسرت کی ادبی تصنیفات میں انکی شرحِ دیوانِ غالب بہترین شرح ہے، اسی طرح متروکات اور معنی شعر پر ان کے رسایل اور مقالات یادگاری چیزیں ہیں۔

حسرت کی زندگی کا تذکرہ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی وفادار شریف اور بہادر بیگم مرحومہ کے تذکرہ کے بغیر تمام نہیں ہوسکتا، آج سے پینتیس برس پہلے وہ پہلے کھول کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس میں باہر آتی تھیں اور کسی کی پروا نہیں کرتی تھیں، شوہر کی قید و بند کے بعد جب اُن کا کوئی مونس و مددگار نہیں ہوتا تھا، ہر قسم کی مشکلوں کو بہادری اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شاید ہی کوئی مسلمان عورت اُن کے مقابلہ کی نکل سکے اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

سید نفیس الحسن حسرت موہانی کی زندگی کے واقعات پر نظر کرکے ان کی شان حضرت ابوذرؓ صحابی کی نظر آتی ہے، جن کی نسبت رسول اللہؐ نے فرمایا:

"ابوذرؓ سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی"

سچ یہ ہے کہ اس عہد پر فریب میں حسرت سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی، اسی طرح حضرت ابوذرؓ کے بعد یہ قول نبوی بھی انہیں صادق آتا ہے کہ "ابوذرؓ کی حق گوئی نے اُس کو زندگی میں تنہا چھوڑ دیا، اس کا کوئی ساتھی نہیں رہا" اور اس لئے اس عہد میں اس مقدس فقرہ کا مورد بھی حسرت کی ذات تھی

عاشق فرید آمد حمید آ　　تنہا جیا اور ستودہ مرا

حسرت کا دماغ خدا جانے کتنے ردیوں میں جلوہ گر ہوا، مگر اُس کا دل بزرگوں کی عقیدت کی خاک سے بنا تھا، مرتے دم پیر کے آستانہ پر جان دی اور انہی کی ابدی خواب گاہ میں آرام کیا۔ مولانا انوار صاحب کے باغ میں جہاں فرنگی محل کے فدا جانے کتنے خزانے دفن ہیں، حسرت بھی اپنی تمناؤں کے خزانہ کے ساتھ دفن ہوئے۔

حسرت! رخصت، تو تنہا آیا تھا، تنہا رہا، تنہا گیا، البتہ تیری نیکی، تیری شرافت، تیرا اخلاص اور حسنِ عقیدت کے اعمال تیرے ساتھ ہیں، اور وہی تیرے رفیقِ آخرت ہیں، بارالٰہا! اُس کی حق گوئی کی بیکسی کی شرم رکھ لیجئے، اور اس کو اپنی رفاقت سے نوازیے۔ وانت الرفیق الاعلیٰ

(معارف)

---

[1] سنہ ۴۲ء میں ان کا پورا دیوان "کلیات حسرت موہانی" کے نام سے شایع ہوچکا ہے۔ (نگار)

بیاض حسرت موہانی

ابن یمین

روزِ محشر عاشقاں را با قیامت کار نیست　　کارِ عاشق جز تماشائے جمالِ یار نیست

سالہا ابن یمیں بر بسترِ غم خفتہ است　　اے طبیبا گوشۂ چشمت بریں بیمار نیست

حیاتی گیلانی

نسیم بادہ دہ و صبح گلفروش آمد　　پیالہ گیر کہ مشرق سبو بدوش آمد

سرے پر از مے و جانے پر از ہوا و نشاط　　بیا کہ مرغ ہوا نیز در خروش آمد

حسرت کا عزم امور

کرکے وہی رہے گا جو دل میں ٹھان لی ہے
روشن ہے ہم پہ حسرت عزم امور تیرا

(مولانا عبدالمالک آروی)

سقراط مغرب کا شہرۂ آفاق فلسفی تھا، اور شمس تبریز مشرق کے ایک بادیہ پیما صوفی، لیکن صوفیانہ ادب کا ایک انگریز ماہر و نقاد دونوں میں ہم رنگی پاتا ہے، دونوں نے اپنے عہد میں اجتماعی زندگی پر نمایاں اثر ڈالا، دونوں نے صاف گوئی اور حق پرستی کو راہ دی، دونوں کو بیکسی کی موت نصیب ہوئی، ڈاکٹر نکلسن کو سقراط اور شمس تبریز ہی کی زندگی میں یہ نقشے نظر آئے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ زمانہ نے ہمیشہ ارباب حق کے ساتھ ایسا ہی کیا۔ حضرت زکریا، حضرت مسیح، سید مودی، ٹراٹسکی، گاندھی اور حسرت ایک ہی مسلک حق کے سرشار تھے، ان کا انجام بھی ملتا جلتا ہے، اس میں شک نہیں حسرت کو نہ تو سقراط کی طرح زہر کا پیالہ پینا پڑا اور نہ شمس تبریز کی طرح نہ اہل دنیا کی نظر میں گردن زدنی ٹھیرے، سید مودی، ٹراٹسکی اور گاندھی کی طرح وہ خاک و خون میں لوٹے بھی نہیں، پھر بھی حقیقت بیں نگاہیں جانتی ہیں کہ حسرت نے زندگی کا سارا دور زہر ہی پی پی کر گذارا، گردن مار کر ان کو کنوئیں میں تو نہیں ڈالا گیا لیکن زندگی میں وہ فانی کی طرح مر مر کر جیتے رہے اور جب تک زندہ رہے بیکسی، نامرادی کی موجوں میں پیچ تاب کھاتے رہے۔

اگر سنان و تفنگ سے ہمکنار ہونے کے بعد سید مودی، ٹراٹسکی اور گاندھی کو "امر" ہونے کی عزت نصیب ہو سکتی ہے تو حسرت بھی اپنوں اور بیگانوں کے سنان زبان و قلم سے ہمیشہ مجروح رہتے، سوسائٹی کے فوز و فلاح کے لئے حق پرستی و راستبازی کا ایک دائمی نقش پیش کرتے رہنے سے شہادت کے عظیم الشان مرتبہ تک پہونچ سکتے ہیں!

حسرت بھی ہندوستانی سماج کے ایک سپاہی تھے، مخلص، بے غرض، ہمدرد، ساری زندگی وہ قوم کے لئے لڑتے رہے اور لڑتے ہی لڑتے مرے، ان کی زندگی میں اخلاص پیہم کا ایک نقش جاوید پایا جاتا ہے، اس لئے ان کی موت سقراط اور شمس تبریز کی طرح بیکسی کی موت ہے، اور ٹراٹسکی اور گاندھی کی طرح وہ "امر" بھی ہیں۔

حسرت نے اپنی فکر و تجربہ اور اپنے نفسیاتی تاثرات کے لحاظ سے اپنے تخلص کا انتخاب کیا انھوں نے نہ تو غالب اور شاد کی طرح اپنے تخلص کے غلط انتخاب پر ناک بھویں پڑھائیں اور نہ خاقانی و سعدی کی طرح درباری رتبہ اور اپنے ولی نعمت کو خوش کرنے کے لئے انھوں نے اپنا تخلص پسند کیا، بلکہ دل و جگر میں ایک دائمی کسک اور گداز محسوس کرنے والے ژولیدہ مو خود رفتہ انسان نے اپنے اعماق ذہن و قلب میں پیدا ہونے والے تاثرات کے لحاظ سے "حسرت" کا انتخاب کیا۔

ان کی شاعری میں نہ تو انتخاب کی غلطی کا شکوہ ہے اور نہ اس سے ہٹ کر ان کے شاعرانہ شیوۂ و انداز میں کوئی مظاہرہ، حسرت ایک صحافی بھی تھے، ایک شاعر بھی اور ایک رہنما بھی، لیکن ان کی صحافت، ان کی شاعری اور ان کی سیاسیات سب میں ایک بے پناہ خلوص، ایک سرفروشانہ عزم اور ایک مجاہدانہ عظمت پائی جاتی ہے، وہ ایک صاف گو نقاد، ایک متین شاعر اور ایک بے ریا سیاستداں تھے اور یہی وجہ ہے کہ جہاں تک "فن زرگری" کا تعلق ہے ہمیشہ ناکام رہے۔

ولولۂ عمل کا یہ عالم تھا کہ بزم و رزم دونوں میں انھوں نے حصہ لیا، تنگی معاش نے ان کو زندگی کے کسی مرحلہ پر تنگ حوصلہ نہ بنایا۔

حسرت کی عظیم الشان زندگی کا یہ اتنا بڑا شرف ہے جس کو ہماری تاریخ فراموش نہیں کرسکتی بیکسی اور علوِ نفس میں آسانی سے ہم آہنگی نہیں ہوتی اگر کہیں یہ دستیاب ہوجائے تو بڑی مقدس چیز ہوتی ہے، اعاظم و اکابر کی زندگی ہی میں ہمیں یہ قران السعدین نظر آتا ہے، ورنہ بیکسی تو انسانیت کا پلہ جھکا دیتی ہے، انسان گرجاتا ہے اور گرکر مشکل ہی سے سنبھلتا ہے۔

حسرت معاشی پریشانیوں میں ہمیشہ مبتلا رہے، لیکن اس کے باوجود نہ ان کی حق پرستی میں کوئی فرق آیا اور نہ حق گوئی میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی، وہ چاہتے تو ہوا کے رخ پر چل کر معاشی اعتبار سے آسودہ ہوجاتے، بلکہ مادی جاہ و جلال سمیٹ لیتے، لیکن ان کی غیرت، ان کی حق نوائی اور اٹل قوت فیصلہ نے ان کو ہمیشہ جادۂ صواب پر قایم رکھا، اور وہ بلا خوف سماج اور مذہب کی مخلصانہ خدمتیں کرتے رہے۔

حسرت کی مستقل مادی بے سروسامانی، معاشی ناآسودگی اور سیاسی بے چارگی جو ان کی پوری زندگی پر چھائی ہوئی ہے، بڑے غور کی چیز ہے اس کے اسباب ہمیں آسانی سے معلوم ہوسکتے ہیں، حسرت ساری زندگی قومی کاموں میں حصہ لیتے رہے، وہ کٹر مسلم لیگی بھی تھے اور اس سے اختلاف کی بنا پر آزاد مسلم لیگ کے مبلغ اور روح رواں بھی۔

۴۶ء میں انھوں نے جناح صاحب کی آمد پر لکھنؤ (امین آباد پارک) میں لیگ کے خلاف مظاہرہ بھی کیا، انھوں نے بھارت پارلیمان میں اپنے کمیونسٹ قسم کے انسان ہونے کا بھی اعلان کیا وہ ایک سچے مسلم بھی تھے اور پکے نیشنلسٹ بھی، حوادث نے ان کو لیگ کے کیمپ میں جا پھینکا لیکن ہر کیمپ کچھ جماعتی اغراض و مقاصد بھی رکھتا ہے وہاں انفرادی آزادی اور حق پرستی سے زیادہ جماعتی معاملہ فہمی کے مطابق کام کرنا پڑتا ہے حسرت اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے "یارانِ طریق" کے گوارے کے نہ تھے، نتیجہ یہی نکلا کہ لیگ کے مجاہدین و قایدین نے ہندوستانی مسلمانوں کو خدا کے حوالہ کرکے بھارت سے جب ہجرت کی تو ان کو "ارضِ پاک" میں مالِ غنیمت سے کافی حصہ ملا، اس کے برعکس حسرت خود "ثواب ہجرت" سے بھی محروم رہے اور کسی کو خیال نہ ہوا کہ اس "مردِ آزاد" کی مخلصانہ خدمتوں کے صلہ میں اس کو اپنا شریک حال بنائے۔

آزاد خیالی اور سیاسی کامیابی دو متضاد چیزیں ہیں، اخلاص و صفائی، حق گوئی و بے باکی اور ایک رجعت پسند طبقہ کی حمایت ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ حسرت کو لیگ میں بھی فروغ نہ ہوا اور وہ بھارت میں بھی انگشت نما ہوگئے، ان کی ملی قربانیاں راس نہ آئیں آسمان دور رہا اور زمین سخت، نہ خدا کا جلوہ میسر آیا نہ بتوں کا وصال!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا حسرت اپنی ان خلقی و دیعتوں کے لحاظ سے سیاست کے لئے موزوں تھے یا نہیں اقبال کے نکتہ چینوں کا بھی خیال ہے کہ انھوں نے سیاسی شاہراہ پر چل کر قوم کو بھی نقصان پہونچایا اور اپنی شخصیت پر بھی بدنامی کے دھبے لگائے، ڈاکٹر سچدانند سنہا اور بہت سے نقادوں کا اقبال کے متعلق یہی اعتقاد ہے، ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے شاعروں نے سیاسیات میں حصہ لیا تو وہ پھولے پھلے نہیں، دانتے، ملٹن، گوئٹے، سوین برن سب کو سیاسی رہبر کی حیثیت سے ناکامیاں ہوئیں جہاں تک سیاسی دنیا میں پینترا بدلنے اور شاطرانہ شیوۂ و انداز کا مظاہرہ کرنے کا تعلق ہے شعرا میں یقیناً وہ کمال پایا نہیں جاتا، اور اس لئے میدانِ سیاست میں شعرا کو اکثر خطروں سے دوچار ہونا پڑا یا وہ اثر و رسوخ، منصب و تمول سیادت و قیادت کے حصول میں کامیاب نہ ہوسکے چنانچہ اقبال بھی پنجاب کی مجلس قانون ساز میں نہ کوئی پارٹی بنا سکے نہ قیادت و وزارت حاصل کرسکے، حسرت کا انجام ان سے بھی برا ہوا، مجلس دستور ساز میں انکی سیاسی بیکسی پر اخبار بیں کو حسرت ہوتی تھی، حسرت ان الم انگیز آثار سے برابر ہمکنار رہے، پھر بھی ان کے اندر بد دلی کا شائبہ نہ تھا، ہندوستان کی مجلس دستور ساز کے اراکین نے جو رویہ ان کے ساتھ رکھا وہ حد درجہ عبرت انگیز ہے اس سے حسرت کے رجحان اور عزم پر ایک روشنی پڑتی ہے اور ہندوستانی سیاسیات اور تقسیم کا مسئلہ قوم پرور مسلمانوں کو بھی سوچ میں ڈالدیتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ سیاسی دنیا میں قیادت و وزارت کا حصول ہی صرف کامیابی کی دلیل ہے یا پھر کسی بلند نصب العین کا پیش کرنا، اور اس کے لئے ایثار قربانی اگر اول الذکر سے یہ اہم تر چیز ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دانتے، اقبال، حسرت اور تمام بڑے بڑے علماء و شعرا جنھوں نے سیاسیات میں صداقت گوئی، اخلاص اور حق پرستی کا مظاہرہ کیا، کامیاب ہوسکے اور ان کی مادی ناکامیوں ہی میں ان کی کامرانیاں مضمر ہیں۔

حسرت برابر سیاسی کاموں میں حصہ لیتے اور قدر اول کے قومی رہناؤں کی طرح قید و بند کی سختیاں جھیلتے رہے، میرٹھ، فیض آباد، یرودا، سابرمتی اور مختلف زندانوں میں، انھوں نے زندگی کے گرانمایہ ایام گزارے، ان کی شاعری کے بہت سے اجزا یہیں کی پیداوار ہیں، سیاسی مشاغل اور اس کے نتائج نے ان کی شاعری کو نقصان پہونچایا اور ان کی شعریت و اخلاص نے ان کو سیاسیات میں ناکام رکھا وہ وطن کے بہت بڑے شاعر تھے اور ان کی وسعت فکر میں نظیر کا دیس پریم اور اقبال کی وطنیت بڑی جامعیت کے ساتھ سمائی ہوئی ہیں' وہ ایک طرف مسلم صوفیہ اور بزرگوں کے ساتھ بھی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، شاہ عبدالرزاق بانسوی، سید عبدالرزاق فرنگی محلی اور حضرت جیلانی کے متعلق انھوں نے بڑی ارادت و احترام کے ساتھ اشعار کہے ہیں، اسی کے ساتھ متھرا، بندرابن، کرشن جی سے بھی انھوں نے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے

کچھ ہم کو بھی عطا ہو کہ اے حضرت کرشن　　اقلیم عشق آپ کے زیر قدم ہے خاص
حسرت کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری　　سنتے ہیں عاشقوں پہ تمہارا کرم ہے خاص
متھرا ہے اہل دل کو وہ آتی ہے بوئے انس　　دنیائے جاں میں شور ہے جس کے دوام کا
گوکل کی سرزمین عزیز جہاں بنی　　کلمہ پڑھا جو ان کی محبت کے نام کا
بندرابن بھی روکش جنت بنا کہ تھا　　پامال ناز انھیں کے بہار خرام کا

حسرت بہت بڑے قوم پرست تھے، آزادی وطن میں ان کا عظیم الشان حصہ ہے ان کی زندگی طوق و سلاسل میں بسر ہوئی اور وہ بہت قدیم وطن پرست تھے، گاندھی جی سے پہلے ہندوستان کے سب سے بڑے رہنما تلک مہاراج تھے، حسرت نے ان کے ساتھ اپنی محبت و خلوص کا اظہار کیا ہے ان کے کلیات میں ایسے متعدد اشعار موجود ہیں مثلاً :-

مفہوم نہ ہو خاطر حسرت کہ تلک تک　　پیغام وفا باد صبا لے کے گئی ہے

نظیر، اقبال و جوش اور اردو کے بے شمار قومی شعرا کی طرح حسرت بھی وطن اور آزادی کے متعلق بڑی وسعت نظر رکھتے تھے، نظیر خوش نصیب تھا کہ ہندوستان کی فرقہ پرستی کے دور سے قبل دنیا سے سدھار گیا اور اس لئے اس کی شاعری اور کردار میں ہمیں ایک ہی سے نظر آتی ہے، اس کے برخلاف اقبال، حسرت اور بعض دوسرے قومی شعرا پر بھی سیاسی انقلاب اثر انداز ہوا، ان کی وسعت فکر کی طنابیں کچھ کھنچنے لگیں اور رفتہ رفتہ اس میں اس قدر کھنچاؤ پیدا ہوگیا کہ اقبال پاکستان کے خلاق بن گئے اور حسرت مسلم لیگ کے حامی، غالباً کوئی انصاف پسند نقاد یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ اقبال کو سرزمین ہند اور اس کی اکثریت سے لگاؤ نہ تھا، ان کو اپنے برہمن ہونے پر ناز تھا، اور وہ ہندوستان کی آزادی، وطن کی محبت اور وطن والوں سے اپنے انتہائی خلوص کے ابدی نقوش چھوڑ گئے ہیں، حسرت نے ہندو معابد و زیارت گاہوں، ہندو بزرگوں اور سیاسی رہناؤں سے اپنے قلبی لگاؤ کا اظہار کیا پھر آخر وہ کون سے اسباب تھے جنھوں نے اقبال کو فرقہ پرستی کی طرف مایل کر دیا، اور حسرت تلک و گاندھی کی قومی و سیاسی شاہراہ سے ہٹ کر مسلم لیگ کے کیمپ میں جا پہونچے، یہ مسئلہ ہندوستان کے ہر متین اور انصاف پسند انسان کے لئے سوچنے کی چیز ہے، اقبال اور حسرت دونوں قدر اول کے وطن پرست تھے لیکن آئے دن ہندوستان میں فرقہ پرستی کا ظہور دیکھ کر وہ رفتہ رفتہ بددل ہونے لگے یہاں تک کہ اقبال کو ان کے بعض نقادوں نے فرقہ پرست شاعر کہدیا اور حسرت کے ساتھ مجلس دستور ساز میں اکثریت نے جیسا سلوک کیا اس نے ہمیں اور ہمارے ساتھ ہر وطن دوست مسلمان کو غمناک بنا دیا۔ آج ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے گفتار و کردار سے جو مظاہرے کئے جا رہے ہیں ان میں ہر محب وطن حصہ لے رہا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہیولیٰ کسی نئی خرابی کا سبب نہ جائے اور اقبال و حسرت کی طرح ہندوستان کا ہر عالم، شاعر اور ادیب قومی شاہراہ سے بہک کر فرقہ پرستی کے خارزار میں نہ جا پڑے یہ وطن کی انتہائی بدقسمتی کا دن ہوگا۔

حسرت کی زبان نظیر، سالی اور داغ کی طرح سہل اور سادہ ہے، اقبال پر ان کے نقادوں کا بڑا اعتراض ہے کہ انھوں نے فارسی آمیز اردو استعمال کی، ڈاکٹر سنہا اور امرناتھ جھا دونوں کو اس کا گلہ ہے، لیکن حسرت کے یہاں ہمیں یہ چیز نظر نہیں آتی، وہ جو کچھ کہتے ہیں صاف اور سلیس انداز میں اور غالباً یہ نتیجہ ہے اس کا کہ انھوں نے ہندی میں بھی اثر آفریں اشعار کہے ہیں۔

حسرت فارسی سے واقف تھے انھوں نے اس میں بھی اشعار کہے ہیں جن میں بیحد سادگی ہے اور اُردو کی طرح ان میں بھی خاصا اثر ہے۔ فارسی میں انھوں نے شمس تبریز (یا رومی) سعدی و جامی کا کافی مطالعہ کیا تھا، اور ان کے کلام میں ان کے حوالے ملتے ہیں۔

مجھے فیضِ سخن پہونچا ہے حسرت — ز روحِ پاکِ شمس الدین تبریز
حسرت اُردو میں غزل ہے تیری — پرتوِ نقشِ سعدی و جامی

شمس تبریز تو امی تھے شعر نہیں کہہ سکتے تھے۔ رومی کا دیوان غزلیات دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہو گیا، رومی کی شدت احساس اور ولولہ انگیز آہنگ شعری سے حسرت کو کوئی نسبت نہیں، البتہ سعدی کی عشقیہ محاکات اور سپردگی کی کیفیتیں حسرت کے یہاں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں ۱۹۴۲ء میں ہم نے حسرت کی شاعری پر ایک اجمالی رائے دی تھی، اور ان کی شاعری کو عشقیہ تاثرات اور داخلی کسک کا نتیجہ بتایا تھا، نیاز صاحب نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ حسرت شاعر پیدا ہوا اور بلا عشق کئے بھی وہ شاعر ہوتا، نیاز صاحب کی یہ تنقید بالکل صحیح ہے حسرت فطرت کی طرف سے شاعری کا ذوق لیکر آیا تھا اس کی زندگی میں ہمیں دانتے و گوئٹے، اسکاٹ و برنس، شیلے و کیٹس، ابن ابی ربیعہ و مومن خاں کی داستان عشق کا پتہ نہیں ملتا۔ بلکہ اقبال کی طرح وہ ہمیں ایک زاہدِ خشک نظر آتے ہیں، اقبال قومی سدھار کے کاموں میں لگ گئے اور اسلامی بین الاقوامیت نے اس کا بھرم رکھ لیا، ورنہ محبت کے نارمز شناس کی حیثیت سے ان کا رنگ تغزل بے آب و رنگ ہے، حسرت کے یہاں ہمیں اقبال کی خشکی اور شیلر کا تفلسف تو نہیں ملتا لیکن سیاسیات کی وجہ سے ان کی شاعری کا معتد بہ حصہ بے کیف بن کر رہ گیا، لیکن جس وقت وہ سیاسی ذہن سے الگ رہے ہیں انھوں نے بے پناہ شعر کہے ہیں۔

حسرت نے لکھنؤ اسکول کی آغوش میں آنکھیں کھولیں، لیکن ان کا میلان اساتذہ دہلی کی طرف ہو گیا انھوں نے نسیم و مومن کی پیروی کا خود اعتراف کیا ہے، ہم نے ۱۹۴۳ء میں لکھا تھا کہ مومن کا حقیقی رنگ حسرت کے یہاں نام کو بھی نہیں، نیاز صاحب نے اس پر بھی جرح کی تھی اور بتایا تھا کہ مومن خاں کے فنی اشارے حسرت کے یہاں موجود ہیں، نسیم کا رنگ رکھاؤ تو نیاز صاحب کے قول کے مطابق حسرت کے یہاں موجود ہے لیکن مومن خاں کے فنی اشارے حسرت کے یہاں شاذ ہی ہیں، اور ان کی دقت بیانی اور معنی آفرینی تو حسرت کے یہاں بالکل ناپید ہے، گو حسرت خود فرماتے ہیں :-

حسرت ہیں وقفِ پیرویِ مومن و نسیم — کیوں سلسلہ ملائیں کسی لکھنوی سے ہم

لیکن مومن کی تقلید کوئی آسان چیز نہ تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ مشکل تھی جتنی غالب کے لئے بیدل کا تتبع، حسرت برابر اعتراف و ادعا کرتے رہے کہ وہ لکھنؤ اسکول سے نہ تو متاثر ہیں اور نہ کسی لکھنوی سے ان کا سلسلہ ملتا ہے، پھر بھی ان کے کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے تو وہ لکھنوی شیوہ کو انداز سے متاثر نظر آتے ہیں۔

حسرت فطرتاً غیر فرقہ پرست تھے، ان کو مذہب کے اختلاف کی بنا پر نہ تو کسی جماعت سے نفرت تھی اور نہ وہ اس اختلاف کو سیاسیات کا آلۂ کار بنانا چاہتے تھے۔ لیگی کی حیثیت سے وہ ناکام رہے اور قوم پرور کی حیثیت سے بھی ان سے مقاطعہ کیا گیا لیکن جہاں تک انصاف پسند قلوب میں نقش وفا قایم کر جانے کا تعلق ہے حسرت کامیاب رہے اور ان کی موت ایک صدیق اور شہید کی موت ہے، حسرت اپنی نجی زندگی میں بھی بڑے مخلص، ہمدرد اور وفا کوش تھے۔

حسرت کی موت ایک مخلص قومی فدا کار کی موت ہے جسے ہندوستان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

حسرت اور اُن کا عشق
ایک تجزیہ

(سید محمد عقیل)

کسی مفکر کا کہنا ہے کہ انسان محض کپڑا لٹکانے کے چوبی ڈھانچے ہیں جنھیں نوجوان اپنے تخئیل کا زرق برق لباس پہنا دیتے ہیں۔

"اگر انسان میں عشق کا احساس نہ ہوتا تو اُسے کبھی خبر نہ ہوتی کہ نصب العین کیا چیز ہے۔ اس روشنی میں ہر چیز کل زندگی اور ساری فطرت حسین نظر آنے لگتی ہے۔ فطرت اور وحدتِ ذہن کا رازِ پنہاں یہاں آشکارا ہو جاتا ہے۔" (ایڈورڈ اشپرانگر)

اُردو شاعری اور اس کے خیالات کا جب ہم جایزہ لیتے ہیں تو سب سے اہم چیز جو ہمیں نظر آتی ہے وہ غزل ہے جس کا موضوع چند شعرا کو چھوڑ کر ہمیشہ 'حکایت با یار گفتن' رہا ہے۔ عشق کا سلسلہ لامتناہی ہے لیکن اس میں چند ابھری ہوئی چوٹیاں بہت نمایاں ہیں جن پر وصل۔ ہجر۔ بیقراری۔ اشکباری وغیرہ کی دھند چھائی ہوئی ہے اور اُردو شاعری کے پورے ذخیرے میں یہی چیز سب سے زیادہ نمایاں بھی ہے اور سب سے زیادہ دھندلی بھی نمایاں اس معنی میں کہ بہت جسیم ہے اور دھندلی اس لئے کہ یکسانیت و ابہام اسے اس طرح گھیرے ہوتے ہیں کہ کوئی صحیح و واضح نقشہ آپ کے سامنے نہیں آنے پاتا۔ کوئی شعر الٰہیات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کسی شعر کے آئینے میں جمالِ یار نظر آنے لگتا ہے۔ کبھی اس میں زمانہ کی گرفتاری منعکس ہوتی ہے اور کبھی معشوق کے ظلم و ستم کے تیر و نشتر پنہاں ہوتے ہیں۔

غزل کے پاس عشق کا کوئی صحیح و واضح تصور نہیں اور یہ وہ گتھی ہے جسے آج تک سلجھایا نہ جا سکا۔ اُردو غزل پر جب ہم تجزیاتی نظر ڈالتے ہیں تو کم و بیش عشق کے دو تین اقسام واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ کچھ شاعر ایسے ہیں جنکے یہاں عشق کی تمام قسموں میں سے کچھ کچھ حصہ پایا جاتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جہاں عشق الٰہی یا روحانی کی بھرمار ہے ایسے شاعروں میں درد۔ مومن۔ سودا کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے۔ درد کا تو پورا کلام عشق الٰہی میں ڈوبا ہوا ہے۔ غالب کے حق میں مسایل تصوف و فلسفہ آئے۔ عشق کا مادی پہلو اور ایک انسان کا انسان سے عشق بہت کم نظر آتا ہے۔ ایک عام رجحان کسی کے یہاں نہیں ہے۔ میر کے یہاں بہت کچھ اشارے ملتے ہیں مگر وہ بھی ابہام اور مثالیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لکھنؤ کے دورِ شاعری میں صرف آتش ایسا شاعر ہے جس کے یہاں انسان سے انسان کے عشق کی ایک چلتی پھرتی شکل غالباً پہلی مرتبہ اُردو غزل میں ایک باقاعدہ رجحان کے ساتھ نظر آتی ہے۔ آتش سے پہلے جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں مادی عشق کی مکمل اور جامع مثال نہیں ملتی۔ آتش کے بعد اس نظرئے کو سراہنے کے لئے حسرت موہانی نے قدم بڑھایا۔

حسرت نے اس وقت آنکھ کھولی جب ہندوستان بالکل ایک نئے دور سے گزر رہا تھا۔ غم و غصہ سے تنی ہوئی رگیں غدر کے شکنجے میں جکڑ کر پاش پاش ہو چکی تھیں۔ آزادی کے تصور کا گلا استبدادی ہاتھوں نے گھونٹ دیا تھا اور ردِ عمل کے طور پر زیادہ تر لوگ محکومیت کے طوق کو خوش آمدید کہہ چکے تھے مگر کچھ سر پھرے اب بھی ایسے تھے جن کے سروں میں جنگ آزادی کا اُبال جوش مار رہا تھا اور جس کا ظہور ۱۸۸۵ء یا اس کے بعد انڈین نیشنل کانگریس کی صورت میں ہوا۔ ہندوستانی ذہنیت اس وقت دو طبقوں میں بٹی ہوئی تھی ایک وہ جو ظلم و تشدد کے بعد بھی برٹش گورنمنٹ کا لوہا ماننے کو طیار نہ تھی اور ہر وقت بغاوت پر کمربستہ تھی اور دوسری وہ جو سمجھ بوجھ کر سلجھے ہوئے طریقے سے اپنی دقتوں کو پیش کر کے گورنمنٹ سے سمجھوتہ کرنا چاہتی تھی۔ کانگریس کے

علمبردار دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انیسویں صدی کا آخری حصہ اسی کشمکش و پیچ میں کٹا کہ آخر برٹش گورنمنٹ سے سمجھوتہ کس طرح کیا جائے؟ سنہ ۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں دادا بھائی نوروجی کے زیر صدارت جو اجلاس ہوا اس میں سب سے پہلے کانگریس کو سوراج کا خیال پیدا ہوا۔ ملک میں سیاسی خیالات تیزی کے ساتھ پھیل رہے تھے۔ کانگریس، سوراج کو اپنا مطمح نظر بناکر آگے بڑھ رہی تھی۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں بال گنگادھر تلک نے ہوم رول کی تحریک شروع کی، ابھی یہ گرمی ٹھنڈی نہ پڑی تھی کہ لائڈ جارج کی وعدہ خلافی نے تحریک خلافت کی آگ بھڑکا دی۔ اسی زمانہ میں سنہ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں کانگریس کا ایک تاریخی اجلاس ہوا جس میں حسرت موہانی نے تجویز پیش کی "ہندوستان کو سوراج ملنے کے معنی یہ ہونے چاہئیں کہ ہندوستان تمام اثرات سے بالکل بری ہوجائے"۔ مگر گاندھی جی نے اس کی شدید مخالفت کی اس لئے کہ اس میں تشدد کا امکان تھا اور گاندھی جی اس وقت عدم تشدد کا پرچار کر رہے تھے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں بردولی اجلاس اور چورا چوری کا سانحہ پیش آیا اس سلسلے میں بہت سی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ حسرت موہانی بھی گرفتار ہوئے اور یرودا اور سابرمتی جیلوں میں قید رہے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں ہندوستان میں ایک بہت بڑی اسٹرائیک ہوئی اور گرینی کامگار اور ریڈ فلیگ یونین قایم ہوئیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے نمک کے اجارہ کے خلاف آواز اٹھائی اور ۸، آدمیوں سمیت سمندر کے کنارے نمک بنانے گئے۔ اس کے بعد بدیسی مال۔ کپڑا۔ شراب وغیرہ کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ گاندھی جی نے ملک کے مرد اور عورتوں سے درخواست کی کہ وہ بدیسی مال کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کریں اس کے ساتھ ہی پشاور کی بغاوت عمل میں آئی اور ۵ رمئی کو گاندھی جی کو حکومت نے گرفتار کرلیا۔ گاندھی جی کی گرفتاری نے ملک بھر میں کھلبلی مچادی۔ شولاپور اور بمبئی میں بڑے بڑے مظاہرے اور ہڑتالیں ہوئیں۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں کانگریس کا پٹنہ میں اجلاس ہوا اور بالاتفاق یہ بات طے پائی کہ سول نافرمانی کو بلا کسی شرط کے ختم کردینا چاہئے۔ کانگریس اب آنے والے الیکشن کی طیاری میں مصروف ہوگئی۔ اس زمانہ میں دو اور قابل توجہ سیاسی موڑ نظر آنے لگے سنہ ۱۹۳۶ء میں قومی جذبات سے متاثر ہوکر ہندوستان کے طلبہ نے ایک انجمن "اسٹوڈنٹس فیڈریشن" کے نام سے قایم کی جس کے صدر جناح صاحب چنے گئے۔ دوسری سوشلزم اور اشتراکیت کی تحریک تھی جس کی بنیاد تحریک خلافت کے بعد ہی مسلمانوں نے ڈال دی تھی۔

یہ تھا وہ سیاسی پس منظر جس میں حسرت اور ان کی شاعری نے آنکھ کھولی۔ ادبی دنیا میں اس وقت اقبال۔ حالی۔ آزاد اور چکبست کے نغمے گونج رہے تھے۔ اردو شاعری نئے نئے تجربات پر تلی ہوئی تھی اور ایک باغی کی طرح امنگ بھرا فاتحانہ قدم اٹھا رہی تھی۔ حالی اور آزاد نے اردو شاعری کی اس طرح جرّاحی کی تھی کہ اردو غزل میں میں عشق کا موضوع ایک بدگوشت کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ کسے خیال تھا کہ اس جرّاحی اور فصادی کے بعد یہ مادہ پھر ابھرے گا اور ایک دفعہ پھر ریشمی آنچل کا پھریرا لہرانے لگے گا۔

اگر کلیات حسرت کی غزلوں میں لکھی ہوئی تاریخیں صحیح ہیں، اور کوئی وجہ نہیں کہ صحیح نہ مانی جائیں، تو حسرت کی غزلوں کی ابتدا سنہ ۱۸۹۴ء یعنی ان کی انیس سال کی عمر سے ہوتی ہے۔ جو ان کی طالب علمی کا زمانہ تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسرت ابتدا ہی سے مادی عشق کے قایل تھے اور اپنے عشق کی تاثیر ایک چلتے پھرتے انسان میں دیکھنا چاہتے تھے حالانکہ یہ دور ان کی شاعری کا وہ تھا جب وہ نسیم۔ مومن۔ مصحفی اور غالب کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے اور کوئی چیز الگ ہٹ کر نہ پیش کرسکتے تھے اور یہ اثر ان کی شاعری سے آخر تک نہ جاسکا اس لئے کہ روایت سے بغاوت ہر آدمی کا کام نہیں چنانچہ حسرت صرف چھوٹے چھوٹے تجربوں تک محدود رہے۔

وہ شرمائے بیٹھے ہیں گردن جھکائے　　غضب ہو گیا اک نظر دیکھ لینا
نہ بھولے گا وہ وقت رخصت کسی کا　　مجھے مڑکے پھر اک نظر دیکھ لینا　　(سنہ ۱۸۹۶ء)
وہ شرماتی صورت وہ نیچی نگاہیں　　وہ بھولے سے ان کا ادھر دیکھ لینا
وہ آغاز محبت میں کرم ان کا وفا ان کی　　رہے گا یاد حسرت ہم کو برسوں وہ زمانہ بھی

ان شعروں کو صرف تجربہ ہی کہا جاسکتا ہے اور گو ان سے ایک نئے عزم کا پتہ چلتا ہے مگر قوافی، ردیف کے لحاظ سے وہ قدامت پرستی کا شکار ہوجاتے ہیں اور تقلید انھیں گھسیٹ کر قافیہ پیمائی کی طرف لے جاتی ہے۔ اور وہ کاغذ، علاج، عید اور عاشق جیسی ردیفوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور جس پر انھیں فخر بھی ہے وہ چاہتے ہیں کہ ان کے کلام کو اسی کسوٹی پر کسا بھی جائے چنانچہ اپنے دیوان ہفتم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"حروف ابجد میں سے ہر حرف کی ردیف میں سے کم از کم ایک غزل ان میں ضرور موجود ہے، مگر اب تو ملاحظہ فرمائیں گے کہ" ث، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ن، ک وغیرہ حروف کی ردیفوں میں جو غزلیں ہیں وہ بھی یکسر بے لطف و بے رنگ نہیں ہیں۔" (دیباچہ دیوان حسرت حصہ ہفتم صفحہ ۱۹۔ انتظامی پریس حیدرآباد ایڈیشن)

غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جس کی حد ہم مشکل ہی سے متعین کر سکتے ہیں، اس کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ عموماً اس میں تسلسل نہیں رہتا۔ شاعر ایک شعر میں خدا کی حمد کرتا ہے تو دوسرے میں معشوق مجازی کی طرف باگیں پھیر دیتا ہے۔ تیسرے شعر میں کوئی فلسفہ بیان کرنے لگتا ہے۔ غرض ہر شعر بذات خود ایک موضوع ہوا کرتا ہے اور جو اپنی جگہ پر مکمل ہوتا ہے۔ اس لئے ہم حسرت کی شاعری کے لئے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ صرف مادی عشق سے تعلق رکھتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء کے بعد سے ان کی غزلوں میں انسانی عشق کے کوایف و مناظر بہت نمایاں نظر آنے لگتے ہیں اور اسے ہم ان کا شعوری رجحان اس لئے کہتے ہیں کہ ہر غزل میں دو چار شعر ضرور ایسے ملتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں نہ وصل میں بے حیائی کی لذت کا بیان ہے، نہ ہجر میں صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے ناپید ہونے کی خواہش۔ انکے عشق میں اعتدال ہے اور ان کی غزلوں میں وہی جذبات ہیں جو ایک عاشق کے دل میں ہجر اور وصل کے موقع پر پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان کے یہاں حسن اور حسین جسم کا ایک افادی تصور ضرور ہے جس میں کبھی کبھی جوش اور جذبہ مبالغے کی رنگ آمیزی بھی کر دیتا ہے مگر یہ کوئی عیب نہیں اس لئے کہ ہم جذبات کے لئے کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں مقرر کر سکتے اور خاص طور سے عشق کے جذبات کے لئے!

حسرت کے یہاں "معشوق کے آگے بچھ جانے والا" عشق نہیں ہے۔ وہ معشوق سے برابر کی سطح پر ملنا چاہتے ہیں جس کے باعث انکے یہاں انہماک اور گمشدگی پیدا نہیں ہونے پاتی۔ ان کے یہاں عاشق کی خودداری کی ہر طرح سے حفاظت کی جاتی ہے وہ کسی بھی حالت میں عاشق کی خودداری کو مجروح کرنا پسند نہیں کرتے اگر ایک آدھ شعر ایسا مل جائے تو اُسے محض رسمی چیز تصور کر لیجئے۔ ورنہ ان کا عشق معشوق پر بھی اثر انداز ہوتا ہے:

ہو کے آگاہِ غمِ عشق میری حالت پر　　اب تو بھر لائے ہے وہ شوخ بھی بارے آنسو
ہے محبت سے سروکار ہمیں بھی حسرت　　چشمِ جاناں میں یہ کرتے ہیں اشارے آنسو

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت کا عشق ایک انسان کا عشق ہے جس میں دونوں طرف التہابی کیفیت پائی جاتی ہے۔ حسرت کی ایک غزل ملاحظہ فرمائیے:-

جی میں آتا ہے کہ اس شوخ تغافل کیش سے　　اب نہ پھر ملئے کبھی اور بے وفا ہو جائیے
دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال　　آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جائیے
کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو بھول کر　　مایلِ آرام و مشتاقِ شفا ہو جائیے
ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں　　یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے
بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد　　اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے

یہ ایک حقیقت ہے کہ عشق میں ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جب عاشق کا دل بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے اور یہی دل چاہتا ہے کہ معشوق کے کھنچنے پر خود بھی کھنچ جائے اور ہو سکے تو اسکی بیوفائیوں کا بدلہ بھی لیا جائے۔ یہ جھنجھلاہٹ زیادہ تر انسانی ذہن کی ساخت کے باعث ظہور میں آتی ہے۔ بگڑنا اور بننا گویا زندگی کی لہریں ہیں جو اُٹھتی اور میٹھتی رہتی ہیں۔ اور کبھی کبھی زندگی کی یکسانیت بھی ایسی جھنجھلاہٹ کا باعث ہوا کرتی ہے۔ کون کہیگا کہ ایسی کیفیتوں کا بیان عشق کی مادیت کا اثر نہیں ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ محبت کا انسان کی مادی زندگی سے زبردست تعلق ہے۔ وہ مادی اقتصادی اُلجھنیں ہیں، وہ مادی زندگی جو سوسائٹی کے ساتھ بڑھتی اور پھیلتی ہے۔ محبت زندگی کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ بدن کے ساتھ وہ تمام قوا اور احساسات جو جسم کو ایک متحرک مشین بناتے ہیں مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محبت کی پیدایش بھی انسانی سوسائٹی ہی سے ہوگی اور سوسائٹی ہی کے مفاد کے لئے اسے ہونا بھی چاہئے۔

جہاں سے انسانیت اور سوسائٹی کو دھکا پہونچنا شروع ہو وہیں سے مادی محبت کی حدیں ٹوٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ بات ہمارے غزل گو شعراء کے ذہن میں واضح نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ ہمارا عشق بہت کچھ خود غرضی کا عشق رہا جس کی روشن مثال عاشق کا سوسائٹی سے نفرت کرنا، جنگل جنگل گھومنا، اکیلے رہنے کی خواہش اور صرف اپنے دل کی داستان کہتے رہنا ہے۔ ہماری اس محبت کا تصور نہ تو سوشل ہے اور نہ معاشی۔ عاشق کا التہاب صرف وصل تک ہے۔ اسکے بعد گویا عشق کی تمام اُلجھنیں ختم ہو جاتی ہیں اور عاشق پر صرف اس کا غم چھوڑ جاتی ہیں کہ "افسوس سحر ہو گئی"۔ ان اسقام سے بالکل تو حسرت کی شاعری کو بھی

بری نہیں کیا جا سکتا ۔ مگر یہ مقام اتنے نہیں ہیں کہ حسرت کی انفرادیت اس سیلاب میں غائب ہو جائے ۔ جنسیت کے تذکرے حسرت کے یہاں بھی ملتے ہیں مگر خلوص کے ساتھ اور ظاہر ہے کہ جب تک جنسی جذبات میں خلوص موجود ہے بوالہوسی ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی ۔ تقلیدِ غالب، مصحفی و میر و نسیم و مومن، میں پڑ کر حسرت اور آگے کچھ نہ سوچ سکے ورنہ شاید عشق کی حدیں اور وسیع ہو جاتیں، پھر بھی حسرت نے عشق کو حقیقی زندگی کے قریب لانے کی کافی کوشش کی اور ان کی یہ کوشش کامیاب بھی ہوئی ۔ مثلاً ان کی وہ غزل جس کا مطلع ہے :-

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

پاک عشق، اردو غزل میں ایک ایسی اصطلاح چلی آتی ہے کہ جب غزل کا نام آتا ہے تو اس کا سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ شاعر نے پاک محبت، پیش کی ہے یا نہیں ۔ اگر پاک محبت کے نقوش نہیں ملتے تو شاعر کو بوالہوس ۔ فحش نگار قرار دیا جاتا ہے ۔ میں نے بارہا اس بات کے سمجھنے کی کوشش کی کہ آخر پاک محبت سے کون سی محبت مراد لی جاتی ہے ——— آیا اس سے مراد خدا کی محبت ہے یا صرف حسن کا تصور مگر اردو غزل مجھے ان دونوں کا جواب نہ دے سکی اور آج تک میں اسی کشمکش و پیچ میں پڑا ہوں کہ آخر اس پاک محبت کو کہاں اور کس طرح سمجھا جائے ۔ یہ بات تو بخوبی ظاہر ہے کہ یہ پاک محبت اس محبت سے الگ ہے جو بھائی کو بہن سے، بیٹے کو ماں سے، باپ کو بیٹے سے اور شوہر کو بیوی سے (اس لئے کہ بیوی کی محبت میں جنسیت کا ہونا ضروری ہے اور پاک محبت کو جنسیت سے کوئی لگاؤ نہیں معلوم ہوتا) ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ اس لئے کہ اس سلسلے میں پاک محبت کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا ۔ یہ اصطلاح ہمیشہ اس موقع پر سننے میں آتی ہے جہاں عشق کا تذکرہ ہوتا ہے ۔ غور کرنے پر اس پاک عشق کو زیادہ سے زیادہ یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ کسی ایسی خوبصورتی کی تعریف کرنا جو واقعی میں خوبصورت ہو اور جس سے آپ کی کوئی غرض وابستہ نہ ہو ۔ اگر یہی پاک محبت ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر اس میں رقابت کا عنصر کہاں سے داخل ہوتا ہے ۔ عموماً دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ اگر ہم کسی چیز کو پسند کرتے ہیں تو یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اس کی تعریف کریں اور جتنے لوگ ہماری اس پسند کی تعریف کرتے جاتے ہیں ہماری خوشی بڑھتی ہے کہ اور لوگ بھی ہمارے ہم خیال ہیں ۔ نہ کہ رقابت کا جذبہ پیدا ہو ۔ اردو غزل میں ہمیں کوئی ایسا پاک عشق نہیں ملتا جس میں رقیب کا اندیشہ ساتھ نہ لگا ہو اور اگر باوجود اس دلیل کے تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ پاک عشق کوئی چیز ہے جو جنسیت سے الگ ہے تو کسی ایسے شخص کو جو جنسی حیثیت سے کمزور ہو اس کو پاک محبت یا روحانی عشق کیوں نہیں ہوتا ۔ ایسے لوگوں کو تو نفرت کرتے ہوئے پایا گیا ہے محبت کرتے ہوئے تو نہیں دیکھا گیا ۔ حسرت کی غزلیں اس قسم کے پاک عشق سے خالی ہیں ۔ وہ ایک عورت سے محبت کرتے ہیں، ایک ایسی عورت جو جنسی ضرورتوں کو پورا کر سکے اور جو محض خیالی نہیں ہے بلکہ اس میں وہ سب انداز موجود ہیں جو صنفِ نازک میں ہونے چاہئیں ۔ مثال کے لئے اوپر نقل کی ہوئی غزل ہی کافی تھی مگر تھوڑے سے اشعار اور پیش کئے جاتے ہیں :-

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے ——— دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
ہم سے ہرچند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن ——— کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے
دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے ——— جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے
جان کر سوتا تجھے وہ قصدِ پابوسی مرا ——— اور تیرا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے
ذات پہ جن کی ختم تھا شیوۂ جور و جفا ——— آج ہیں بر سرِ وفا پھر یہ خیالِ دلبری

معشوق کے سراپا کا ذکر حسرت کے یہاں مشکل سے نظر آتا ہے اور جہاں کہیں ہے وہ بالقصد نہیں لکھا گیا جیسا کہ قدما کے یہاں ملتا ہے ۔ نہ قدما کی طرح وہ ایک ایک اعضا کی تشریح کرتے ہیں بلکہ ضمنی طریقے سے سامنے کی باتیں کہتے چلے جاتے ہیں جو ایک عام آدمی کسی حسین جسم کو دیکھ کر غیر ارادی طور پر کہہ دیا کرتا ہے یہ ضرور ہے کہ خوبصورتی کا معیار حسرت کا بھی وہی ہے جو قدما کا تھا حسرت کو بھی بس ساری خوبصورتی زلف، ساعد، بازو اور قد ہی میں پوشیدہ نظر آتی ہے مگر وہ عجیب و غریب تعریفوں سے اپنے معشوق کو مافوق الفطرت ہستی نہیں بنا دیتے ۔ سراپا کے متعلق چند مثالیں دیکھتے چلئے :-

سر تا سر اک لطیفۂ خوشبو ہے وہ نگار ——— زلف اس کی عنبریں ہے تو ہے مشکبار خط
دلپذیر پری کے ہر انداز کی ہے تجھ میں نمود ——— رخ بھی رنگیں ہے تیرا قد بھی ہے دلجو تیرا

کھول کر بال جو سوتے ہیں وہ شب کو حسرت — گھیر لیتی ہے انھیں زلفِ معنبر کیا خوب
ملتے ہوئے آنکھیں اٹھتے ہیں وہ آنکھیں جو خواب سے — پھیلا ہوا ہے نورِ جمال خمارِ صبح

ظاہر ہے کہ یہ سیدھی سادی باتیں ہیں جو بالقصد سراپا بنا کر نہیں کہی گئیں اور چونکہ شاعر کو افادیت مدِ نظر ہے اس لئے خارجی ہیات پر خیالات کا صرف نہیں کرتا۔ اردو غزل کا مطالعہ کرتے وقت اکثر میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ جوں جوں غزل گو کی عمر بڑھتی جاتی ہے، معاملاتِ عشق کے بیان میں وہ زیادہ صفائی سے کام لیتا ہے۔ معاملات کو خوب چٹخارے لے لے کر بیان کرتا ہے اور اگر صاف صاف کہا جائے تو یہ کہ مجسّم بے حیائی پر اتر آتا ہے۔ حالانکہ یہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ اگر وہ اپنے دل لگانے اور ہجر و وصل کے تذکروں کو چھوڑ کر اپنے ذاتی تجربات نرمی و نزاکت سے بیان کرتا اور اس میں وہ اثر بھی قائم رکھتا جو کہ غزل کا تقاضا ہے تو کہیں بہتر تھا مگر ہمارے شاعر پر اول سے آخر تک صرف ایک ہی جذبہ طاری رہتا ہے اور اس سن میں بھی وہ اپنے والہانہ عشق کی ابتدا ہی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔

حسرت موہانی بھی غزل کی اس خصوصیت کو فراموش نہ کر سکے اور آخر عمر میں بھی ایسے ایسے اشعار کہتے رہے جن میں ان کی جوانی کی امنگیں جھومتی ہیں سفر حضر میں جہاں انھیں کوئی حسین صورت نظر آتی ہے بے اختیار ان کا دل اس پر آجاتا ہے اور پھر جذبات میں وہ تڑپ ہوتی ہے کہ جوانی کا پورا جوش عود کر آتا ہے۔ جیل میں بھی وہ اپنے ماحول کو فراموش کر کے عورت ہی کے حسن و محبت کا راگ گاتے ہیں۔ جیل کی بیڑیاں ان میں بغاوت کا جذبہ نہیں پیدا کرتیں۔ حسرت کی کوئی غزل ایسی نہیں ملتی جو کسی سیاسی شعور کے تحت میں لکھی گئی ہو یا پوری سیاسی ہو۔ چاہے وہ جیل میں ہوں یا جیل کے باہر۔ ۶۵ سال کی عمر میں برنڈسی (اٹلی) میں جہاز پر ایک غزل لکھتے ہیں:-

رعنائی میں حصّہ ہے جو قبرص کی پری کا — نظارہ ہے مسحور اسی جلوہ گری کا
رفتار قیامت یونہی کیا کم تھی پھر اس پہ — اک طرہ ہے فتنہ تیری نازک کمری کا

ایک اور غزل مسلسل ملاحظہ ہو جو روم میں ۹ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء کو لکھی گئی:-

ہم رات کو اٹلی کے حسینوں کی کہانی — سنتے رہے رنگینیِ ڈوپا کی زبانی
ہونٹوں کے قریب آئی جو وہ زلفِ معنبر — جھٹ چوم لیا ہم نے طبیعت ہی نہ مانی
ہوتی جو خبر اس کو تو کیا کیا نہ بگڑتی — ڈوپا نے غنیمت ہے کہ یہ بات نہ جانی

اسے تنگیِ خیال کہا جائے یا تنگیِ نظر کہ حسرت تمام یورپ کا سفر کرتے ہیں مگر ان کو کوئی چیز قابلِ ذکر نہیں ملتی جسے وہ غزل میں پیش کریں۔ نہ وہ مناظر سے متاثر ہوتے ہیں نہ مغربی ممالک کی معاشرتی ترقی ان کا دل پگھلاتی ہے جس کے لئے وہ ہندوستان میں نعرے لگاتے پھرتے ہیں۔ وہ جیل بھی جاتے ہیں مگر یہ سب واقعات ان کی شاعری پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ انھیں ہر جگہ صرف عورت نظر آتی ہے اور جس سے وہ صرف والہانہ عشق کا اظہار کرتے ہیں حسرت کے پیشرو اس بیان کے لئے اس واسطے معاف کئے جا سکتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں غزل مواد کے لحاظ سے اور کسی طرح لکھی نہ جاتی تھی مگر حسرت نے اقبال کے ساتھ آنکھ کھولی تھی اور اس فضا میں ان کی پرورش ہوئی تھی جس میں حالی، آزاد اور چکبست کے نغمے گونج رہے تھے۔ اور کچھ نہ سہی تو حسرت بھی غزلوں میں وہ سب کچھ پیش کر سکتے تھے جو ان بزرگوں نے پیش کیا۔ اقبال بھی یورپ کا سفر کرتے ہیں ان کے تاثرات۔ اندلس اور قرطبہ دیکھ کر کیا ہوتے ہیں اور اسی یورپ سے حسرت کس طرح متاثر ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل کو ان سب چیزوں سے دور ہی رکھنا چاہتے تھے۔

حسرت کی عشقیہ شاعری کا تو ہم جائزہ لے چکے مگر ان کا عشقیہ رجحان اور سیاسی زندگی دو متضاد چیزیں ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ ہم اس بات کی بھی تلاش کریں کہ باوجود اس سیاسی عملی زندگی کے حسرت کا دماغ ان کے دل سے تعاون کیوں نہیں کرتا۔ کیا وجہ ہے کہ حسرت ایسے سیاسی ماحول میں بھی رہ کر جس کی مختصر تاریخ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، حسنِ یار ہی کے ریشمی آنچل کا کنارہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تضاد کی توجیہ کس طرح کی جائے حسرت کی شاعری پر جب ہم ایک تجسس آمیز نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ بات صاف بالکل صاف واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک شاعری اور سیاست بالکل دو الگ چیزیں ہیں۔ نہ وہ شاعری میں سیاست کی آگ بھرنا چاہتے ہیں نہ سیاست کی مدد کے لئے شاعری کا مضبوط بازو انھیں درکار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی

طریقے سے تو وہ بالکل سیاسی ہیں مگر دل اور دماغ ان کا بالکل قدامت پسند ہے اور اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو وہ اپنے سے گزشتہ دور کے شاعروں سے بھی زیادہ قدیم معلوم
ہوں گے۔ اس سے زیادہ قدامت پسندی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی عملی طریقے سے تو جدید سیاست میں حصہ لے رہا ہو مگر اس کے دل و دماغ میں وہی قدیم لہریں
اٹھ رہی ہوں جو آج سے دو صدی قبل اُردو غزل گو کے دماغ میں اُٹھا کرتی تھیں اور باوجود زندگی کی مختلف کشمکشوں کے اس کے دل و دماغ فنی قیود اور
رعایتوں سے گریز نہ کرتے ہوں۔ اگر حقیقت کی نگاہوں سے دیکھا جائے تو حسرت جس قدر فن برائے فن کے حامی ہیں شاید ہی اُردو کا کوئی شاعر رہا ہو۔ سودا، میر
مومن۔ غالب سبھی زمانے کی نامساعدت کا شکوہ کیا، اس سے بحث نہیں کہ کس شکل میں۔ داغ جیسا شوخ طبع شاعر بھی ضبط نہ کر سکا اور بڑے درد سے مرثیۂ دہلی لکھا
مگر حسرت ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتے ہیں، عملی طریقوں سے تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں مگر کام و دہن ہر وقت لب لعلیں کی تنگ شکری کو ترسا
کرتے ہیں۔ آنکھوں میں ہندوستان کی زبوں حالی اور کس مپرسی رقص کر رہی ہے مگر دل ہر وقت زلف یار کی زنجیروں میں اسیر ہے۔ مجھے تو بعض اوقات ہنسی معلوم
ہوتی ہے اور تعجب بھی ہوتا ہے جب لوگ حسرت کو سیاسی شاعر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے جہاں نفس انسانی میں فولادی طاقت
پیدا ہوتی ہے، جہاں بغاوت کی نشوونما ہوتی ہے، ہمارا شاعر عصبیت کا شکار اور جنسیت کا مریض نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اور کچھ نہیں کر سکتا تو خیال
ہی سے سارا لطف اٹھا لینا چاہتا ہے۔ حسرت کی اس قسم کی غزلوں کے مطالعے کے وقت اکثر یہ خیال ذہن میں آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ حسرت سیاسی حقایق کی تلخی
کی کمی کے لئے رنگین آنچل کا محض سہارا چاہتے ہوں اور چونکہ غزل داخلی صنف ہے اس لئے اس کا امکان ہے بھی۔ جس طرح قدما کے یہاں ایک ہی شعر مجاز اور
حقیقت دونوں کی طرف جُھکا جاتا ہے۔ مگر آپ اس خیال کے تحت مشکل ہی سے دو قدم چل پائیں گے، کیونکہ آپ کو ایسے ایسے صاف اشعار ملیں گے جنہیں آپ
کسی طرح سیاست کا رنگ دے ہی نہیں سکتے۔ اور ایک دو اشعار نہیں بلکہ غزل در غزل ایسے ہی اشعار آتے جائیں گے، جیسے :-

ہوش میں کیا آئیں نہیں چھوڑتا ، جلوۂ جاناں کا نظارہ ہمیں
آنے میں ان کے دیر ہے لیکن شب وصال ، پیش نظر وہ چہرۂ زیبا ابھی سے ہے
وہ بے پردہ سوتے ہیں ظاہر میں لیکن ، دو پٹہ یونہیں منہ پہ ڈالے ہوئے ہیں

سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی کس طرح ان اشعار کو کھینچ تان کر سیاست یا عشق خداوندی کی طرف لے جائے گا۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ حسرت عاشقانہ غزلیں ہی کہتے
رہے حالانکہ چکّی کی مشقت بھی جاری رہی اور ہندوستان میں وباؤں کی آندھیاں بھی چلتی رہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا ہوا کیوں ؟۔ اس کا جواب
ہم چند جملوں میں دیتے ہیں: — حسرت نے اپنا میدان شاعری غزلوں کے لئے محدود کر لیا تھا اور غزل کی نرمی و دلکشی ان کو اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ سیاست
کے کھردرے مضمون سے اُسے ہمکنار کریں۔ اس دلیل کے ثبوت میں ہم مولانا کا خود وہ جملہ لکھے دیتے ہیں جو انھوں نے اپنے دیوان ہفتم کے شروع میں بطور دیباچہ لکھا
ہے۔ فرماتے ہیں :— " یہ کل غزلیں اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں جبکہ فقیر پر حکومت کی جانب سے ایک دوسرا مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ مگر اس کے سبب سے انشاء اللہ
تعالیٰ کہیں پریشانیِ خیال کے نمونے نظر نہ آئیں گے "۔ یہ عبارت ظاہر کرتی ہے کہ انھیں قدیم طرز و فن کا کتنا پاس تھا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تجربہ کے
طور پر دو ایک سیاسی شعر کسی کسی غزل میں کہہ کر اس موضوع کو ترک کر دیا۔ حسرت انقلابی نہ تھے اور یہی وجہ ہے کہ آج وہ کانگریسی تھے تو کل مسلم لیگی
پرسوں اشتراکی اور اسی طرح نہ معلوم کیا کیا ہوتے گئے۔ ان کے قواء اگر ایک طرف مرکوز ہو جاتے تو شاید ان کے خیالات میں وہ سرچشمے پھوٹ نکلتے جو انہیں
غزل ہی تک محدود نہ رکھتے بلکہ نظموں کی طرف بھی ان کو قدم اُٹھانے پر مجبور کرتے اور اگر نظم نہ لکھتے تو غزلوں کو تو وہ سیاسی ہونے سے بچا ہی نہ سکتے تھے۔ غزلوں کو
انھوں نے " مشق سخن " ہی تک محدود رکھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ جیل میں بھی بیٹھ کر ایسی ہی عشقیہ غزلیں لکھا کرتے ہیں جو تنہائی میں ان کا دل بہلاتی رہیں اور
نتیجے کے طور پر وہ اُردو شاعری کو کوئی بہت بڑی چیز نہ دے سکے۔ معاملات عشق میں خلوص اور اطمینان اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ حسرت عشق کی
مئے ہوشربا سے اکثر سرشار ہوتے رہے اور اس قسم کے اشعار

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے ، وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

ان کی کامیابی کی دلیل میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

حسرت کی شاعری کا جمالیاتی پہلو

(پروفیسر حنیف فوق)

حسرت کی شاعری کی دنیا حسن و عشق کی دنیا ہے۔ یہ موضوع اردو شاعروں کے لئے نیا نہیں ہے۔ غزل کی بنیاد ہی اس جذبہ پر ہے لیکن ہندوستان کی قدیم فضا میں عشق کے پنپنے کے امکانات بہت کم تھے اور سماجی پابندیوں نے محل سرا اور دیوان خانہ کی زندگی کو ایک دوسرے سے بالکل الگ کر دیا تھا۔ ہمارا کلچر ابھی تک اسی طبقہ کی زندگی کا آئینہ دار تھا۔ اس لئے اس دور کا عکس ہماری شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔

مرد اور عورت کی باہمی زندگی گناہ نہیں ہے ورنہ اس کا ذکر اربعین کوئی جرم۔ لیکن اس کے لئے ذہنی پاکیزگی شرط ہے اور حسرت کے یہاں یہ چیز بدرجۂ اتم نمایاں ہے۔ جنسیات کے متعلق حسرت کا نقطۂ نظر بہت سلجھا ہوا ہے۔ ان کا ذہن کسی پیچیدگی یا بے راہ روی کا شکار نہیں ہے۔ اس لئے ان کے یہاں جنسی کج روی، سوقیت، ابتذال کا نشان نہیں ملتا۔ ان کی شاعری میں عشق کا تصور نشاط سے معمور ہے۔ ذہنی ان سے نہیں۔ حسرت کے یہاں عشق ایک جمالیاتی تصور بن جاتا ہے جس میں شبِ ہجراں کی کسک بھی ہے اور روزِ وصل کی عشرت بھی۔ لیکن کسی جگہ بھی تشنگی یا ناکامی کا احساس نہیں ہوتا۔ حسرت کے یہاں پہلی بار ہم کو جسم کی عظمت کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس صحتمندانہ ہے۔ یہ ہمیں خوبصورت چیزوں سے محبت کرنا سکھاتی ہے اور عشق کو بھی زندگی کی ایک ایک بلند قوت تسلیم کرتی ہے۔ اسے محض شورش دل یا وقتی تسکین کا وسیلہ نہیں سمجھتی۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ حسرت کے یہاں جہاں بھی ہم محبوب کا بیان ملتا ہے وہ ہمارے گرد و پیش پھیلی ہوئی زندگی کا سارا حسن سمیٹ لیتا ہے اور اس پر مروجہ اخلاق کی گرفت نہیں ہو سکتی۔ ان کے یہاں اس اعتبار سے خارجی حالات کو بدلنے اور بدلتی ہوئی ضروریات کے تحت نئے اخلاقی رابطے قائم کرنے کا ولولہ ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں جمالِ محبوب کی دلفریبی اور دلنوازی کے بیان میں جو تازگی اور حسن کاری جھلکتی ہے اسے ہم حیات آفریں کہہ سکتے ہیں مثلاً:-

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام	دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود	رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا	طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
اللہ رے کافر ترے اس حسن کی مستی	جو زلف تری تابہ کمر لے کے گئی ہے

وہ اکثر شاعروں کی طرح محض اپنی انفرادیت کے دائرہ ہی کے اندر نہیں رہتے بلکہ ان کی شاعری آگے بڑھ کر خوبصورتی کے چہرہ سے نقاب اٹھا دیتی ہے۔ یوں تو حسن کے خارجی متعلقات کا ذکر لکھنوی شاعری میں بھی بڑے شدومد سے ملتا ہے لیکن وہاں صرف سنگار اور سامانِ آرایش گنا دینا ہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس شاعری کے مطالعہ سے اس زمانہ میں عورتوں کے پہننے کے کپڑوں اور زیوروں کی خاصی طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔ اردو شاعری میں سراپا نگاروں نے اس طرف خاص طور سے توجہ دی ہے۔ لیکن ان کی پیش کردہ تصویریں عموماً بے جان رہتی ہیں۔ اس کے برخلاف حسرت کے یہاں انفرادی مشاہدہ کی تازگی جھلکتی ہے۔ ان کے یہاں حسن کا مطالعہ ہر رنگ میں ملتا ہے اور ان کے تمام رنگوں میں دلکشی اور دل آویزی پائی جاتی ہے۔ پھر حسرت کے یہاں یہ تصویریں سکڑی سمٹی نہیں رہتیں بلکہ متحرک بن جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں ہمیں رنگ و بو کا احساس ہوتا ہے اور یہ گہرا احساسِ جمال حسرت سے پہلے اپنے نامکمل انداز میں ہمیں صرف مصحفی کے یہاں ملتا ہے۔ مصحفی کے چند اشعار دیکھئے:-

بھیگ کے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا — پانی میں نگاریں کف پا اور بھی چمکا
جمنا میں جب نہا کر کل اس نے بال باندھے — ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے
تیری رفتار سے اک بے خبری نکلے ہے — مست و مدہوش کوئی جیسے پری نکلے ہے

حسرت کے یہاں مصحفی کا یہ انداز مکمل انداز پختگی اختیار کر لیتا ہے اور ان کی شاعری کے دلنواز ترنم سے ہمارے حسیات جاگ اٹھتے ہیں اور ذہن میں نشاط کی وہ لہر دوڑ جاتی ہے جسے ہم انگریزی ادیب و شاعر میریڈتھ (Meredith) کے الفاظ میں Ecstacy of understanding کہہ سکتے ہیں۔ حسرت کے یہاں اس رنگ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

دفتِ پیرہن ہوئی خوبیِ جسمِ نازنیں — اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا
محتاج بوئے عطر نہ تھا جسمِ خوب یار — خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی
ہر وضع دلفریب ہے ہر رنگ دل پذیر — کیا بات ہے کسی کے تنِ جامہ زیب کی
پائی ہے بلکہ پاکیِ داماں نظر میں — خوشبوئے حیا نے تری چادر سے نکل کر
شوقِ مخمور ہوا مست ہوئے لگا — نکہتِ گیسوئے یار آنے لگی

حسرت کی شاعری میں ”یادِ یار“ اور ”حسنِ یار“ کہیں کہیں اتنی رنگین ہو جاتی ہے کہ ہمیں ہر گام پر جذب و مستی کا احساس ہونے لگتا ہے اور الفاظ کے پس پردہ ہم ایک دلفریب اور جمالیاتی تجربہ محسوس کرتے ہیں۔ ان مقامات پر شاعری اپنی حسن کاری کی رو سے زمان و مکان کا احاطہ کر لیتی ہے۔-

نہ چھیڑ دیکھ انھیں محوِ خواب رہنے دے — خدا کے واسطے اسے اضطراب رہنے دے
نثارِ عشق تری نیم وا پہ نثار — نہ ڈال مجھ پہ یہ افسونِ خواب رہنے دے

یہاں جذبہ، شاعری، مصوری، موسیقی اور فن کی تکمیل ہمیں بے اختیار کولرج (Coleridge) کی کرسٹابل (Christabel) کی ادائے خواب یاد دلاتی ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ:-

Her gentle limbs did she undress
And lay down in her loveliness

دراصل ایسی ہی نادر جمالیاتی تصویروں میں آرٹ اپنی انتہائی بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔

ہمیں حسرت کی شاعری میں اپنے زمانہ، سماج اور ماحول کی عکاسی ملتی ہے اور ان کا عشق بھی ایک مخصوص دور معاشرت کی چیز ہے۔ یہ تہذیب متوسط طبقہ کے (خصوصیت سے یوپی کے) مسلمان گھرانوں کی سماجی زندگی کی آئینہ دار ہے جس میں ان کی معاشرت کا رکھ رکھاؤ، بندشیں، پابندیاں اور اخلاقی رجحانات سب ہی کی آمیزش ہے اسی لئے حسرت کی شاعری میں بچپن کی باتیں، پردہ کی جھلک اور در و بام کی نظر بازیوں کا بار بار تذکرہ ملتا ہے۔ اسی اثر سے حسرت کی شاعری میں تنوع نظر نہیں آتا۔ بلکہ گھر کی پاکیزہ فضا کا حسن نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں عشق کی مختلف منزلوں میں التفات بھی ہے اور بے رخی بھی، لاگ بھی ہے اور لگاؤ بھی، ستم بھی ہے اور دلداری بھی، مگر اس تمام ”کار و بارِ عاشقی“ میں کندن کی دمک ہے، کھوٹ کی آمیزش نہیں۔ اس لحاظ سے حسرت کی عشقیہ شاعری میں وہ خلوص و طہارت ملتی ہے جسے عام طور پر مسلمان گھرانوں میں ”بنتِ عم“ کے تصور سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ شیلی (Shelly) کی طرح (آرنلڈ Arnold کے الفاظ میں) خلاؤں میں پر نہیں پھڑپھڑاتے۔ بلکہ ان کی شاعری کے مطالعہ سے گرد و پیش کا جو تصور ابھرتا ہے وہ ان کے عشق کی حیات کا بہترین ضامن ہے اور انکی عشقیہ شاعری کو آب و تاب عطا کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک مخصوص کلچر کی آواز ملتی ہے:

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے — مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے
بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا — اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا

مجھ سے تم چھپنے لگے اچھا کیا یونہی سہی اور جو یہ ہو اب دیدۂ دل سے تمھیں دیکھا کروں
آہ کہنا وہ ترا پاکے مجھے گرم نظر ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں
نہاں ہے دل پذیری جس سے ہر ہر لفظ شیریں میں یہ کس جانِ وفا کے ہاتھ کی رنگیں نگارش ہے
لوگ سب جان گئے چھپ نہ سکی شوق کی بات میں گلی سے جو تری ہو کے مکرر گزرا
یہ جو آویزہ تیرے کان میں ہے جانِ خوبی مرے گمان میں ہے

ان کی شاعری میں محاکات کی بھی فراوانی ہے کیونکہ وہ حسن کی نازک سے نازک ادا کو بھی اپنے مشاہدہ کے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں اور داخلی تاثرات کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں بے لاگ خارجیت کا نکھار بھی اتنا نمایاں ہے کہ ان کے لب و لہجہ میں کلاسکی عظمت آجاتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

مجھ سے وہ کھلیں کیا کہ نظر اٹھ نہیں سکتی محجوب ہیں پیمایشِ داماں میں لگے ہیں
آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے
تمنا نے کی خوب نظارہ بازی مزہ دے گئی حسن کی بے شعوری

حسرت نے آغازِ محبت کی حکایتِ لذیذ کو بہت طول دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے حافظہ پر اس یاد کے نقوش بہت گہرے ہیں۔ اسی لئے ان کی شاعری کی محفل بار بار ان سنہری لمحوں کی تابانی سے جگمگا اٹھتی ہے:۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے
تجھ سے وہ ملا شوق سے اور تو نے نہ جانا حسرت کو ابھی یاد ہے تیرا وہ زمانا
یاد ہیں سارے وہ عیشِ با فراغت کے مزے دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں التماس، عذر و تمہید شکایت کے مزے

ان اشعار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر نے ہر ادائے حسن سے کیف حاصل کیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ ان تاثرات کو اپنے تاثرات کا جزو بنا لیا ہے۔ محبوب کے تغافل سے لیکر سپردگی تک کتنی منزلیں ہیں۔ اسی طرح چاہنے اور چاہے جانے کے کتنے مراحل ہیں جن کا بیان حسرت کی شاعری میں ملتا ہے لیکن رعنائی خیال کا دامن کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہ پاتا اور وہ عشق کی نازک کیفیات کو اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ ان میں زندگی کا رس اور شباب کے تجربات کا لہو دوڑنے لگتا ہے۔ یہاں ان کی شاعری جیتے جاگتے محسوسات کی زبان بن جاتی ہے اور اس میں وہ عمومیت اور ہمہ گیری آجاتی ہے کہ ہم اسے قدرِ اول کی چیز کہہ سکتے ہیں۔ ان مقامات پر حسرت کی شاعری میں وسیع تر فضاؤں کا احساس ہونے لگتا ہے اور اس کے ڈانڈے آفاقیت سے مل جاتے ہیں حسرت کی شاعری میں جذبات کا یہ بھرپور وار دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے:۔

مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل پھر تم نے یاد آکے بدستور کر دیا
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی
کچھ دل ہی بجھ گیا ہے مرا ورنہ آج کل کیفیتِ بہار کی شدت چمن میں تھی
ستائیے نہ مجھے یوں ہی دلفگار ہوں میں رلائیے نہ مجھے یوں ہی بے قرار ہوں میں

الغرض حسرت کی شاعری یکسر مادی احساسات کی شاعری ہے لیکن یہ انکی شاعری کی بڑائی ہے کمزوری نہیں۔ اسلوب بیان کے اعتبار سے اگر ہم ایک لفظ میں حسرت کی شاعری کی تعریف کرنا چاہیں تو ہم بڑی آسانی سے اسے "بے تکلفانہ" کہہ سکتے ہیں جس میں انکی کھری اور بے ریا شخصیت جگمگا رہی ہے۔ انھیں جو کچھ کہنا ہے وہ برملا کہتے ہیں انکی تصویریں صاف اور واضح ہیں جن میں ابہام اور اشکال کی کوئی گنجایش نہیں۔ حسرت کی غزلوں میں صورت و معنی کا بہترین امتزاج ملتا ہے لیکن صورت پرستی نہیں۔ انکی شاعری کا واقعاتی انداز اور جمالیاتی رنگ انکی اپنی چیز ہے۔ سچ تو یہ ہے حسرت نے عشق کو پاکیزہ مہذب اور خوشگوار بنا دیا۔ ان کی شاعری کی بڑی تہذیبی قدر و قیمت ہے جسے آنے والی نسلیں آسانی سے نظرانداز نہ کر سکیں گی۔

انتخاب کلیاتِ حسرت موہانی

حسرت مرحوم نے اپنی ۷۵ سالہ عمر میں ۶۰ سال تک شعر کہے اور صرف ۱۰ سال ... جذبہ سے خالی گزرے۔ اس مدت میں انھوں نے تقریباً سات ہزار اشعار کہے جن میں سے تقریباً ۲۵۰۰ اشعار انتخاب میں آسکے یعنی تقریباً ... فی صدی۔

... ساتھ انتخاب ... کیا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ حسرت کی شاعری کا ارتقائی دور ۲۸ سال ... سے ۱۹۲۲ء تک قائم رہا کیونکہ ۱۱۲۱ اشعار اس دور کی شاعری کا انتخاب ہیں۔ اس کے بعد ان کی غزل گوئی میں نہایت تیزی کے ساتھ انحطاط شروع ہوا اور آخری ۱۱ سال میں صرف ۴۴ اشعار قابلِ انتخاب کہے گئے۔

نیاز

۱۸۹۳ء۔ ۱۹۰۳ء

جو آتا ہے تو آ دیکھ لے ... کافت
یہ عرضِ جلوۂ حیرت فزا کیا

... وقت الم ہائے پھر تو کہنا
... رنج ... کا ... کیا

نہ ہو مجھ سا کوئی محوِ تمنا
ہوا کرتی ہیں باتیں دل سے کیا کیا

ہوا حسرت مجھے کچھ شوق ایسا
جنوں نے چھ ... سمجھا دیا کیا

میری نگہِ شوق کا شکوہ نہیں ... جاتا
سوتے ہیں بھی ... دیکھا نہیں جاتا

کرتے تھے کبھی ... ترکِ محبت
اب صدمۂ دوری بھی اٹھایا نہیں جاتا

امید نہیں اُن سے ملاقات کی ہرچند
آنکھوں سے ... شوق ... اٹھایا نہیں جاتا

واللہ تجھے چھوڑ کے اے کوچۂ جاناں
حسرت سے تو فردوس میں جایا نہیں جاتا

کیا کہوں تم سے مدعا کیا ہے
کاوشیں میں خود ہی جانتا کیا ہے

ہاں دلِ دردمند پھر تو ذرا
وہ تپِ غم کا ... مزا کیا ہے

حکم پر ان کے جان دیتا ہوں
میں نہیں جانتا قضا کیا ہے

مستِ صہبائے شوق ہوں حسرت
ہوش جانے مری بلا کیا ہے

کیا تم کو علاجِ دلِ شیدا نہیں آتا
آتا ہے پر اس طرح کہ گویا نہیں آتا

ہو جاتی تھی تسکین سو اب فرطِ الم سے
اس بات کو روتے ہیں کہ رونا نہیں آتا

جوشِ ارماں میں خیالِ رُخِ زیبا نہ رہا
کثرتِ شوق سے یارائے تماشا نہ رہا

میرے اظہارِ وفا کی انھیں پروا نہ رہی
ان کی تخصیصِ جفا کا مجھے دعویٰ نہ رہا

دلِ مایوس بھی عجب شے ہے
پھر اسی کا خیال کرتا ہے

ہم سے اُس شوخ سے اگلی سی محبت نہ رہی
گلۂ ترکِ ملاقات کا جھگڑا چھوٹا

اب نہیں کوئی بھی ارمان خوشا ناکامی
ایک آفت سے دلِ وقفِ تمنا چھوٹا

ایک ٹھوکر ہی سہی اے شوخِ بے پروا خرام
رہگذر میں ہے تری اک آرزو والا پڑا

کرتی تھی پیلائے شبِ نورِ مہِ کامل نثار
سو رہا تھا بام پر وہ گیسوؤں والا پڑا

اس شرابی کا وہ عالم آج تک نظروں میں ہے
حسرتِ دیوانہ دل پھرتا ہے متوالا پڑا

اللہ رے محرومی اللہ رے ناکامی
جو شوق کیا ہم نے سو خام نظر آیا

اس شغل سے آنکھوں کو دم بھر جو ملی فرصت
رونے میں وہ کیا ایسا آرام نظر آیا

وہ بگڑنا بھی کبھی مجھ سے تو منے کے لئے
یاد ہے انداز تیرے جورِ لطف آمیز کا

کیا پوچھتے ہو عاشقِ بیمار کا مزاج
آہ اس فدائے لذتِ آزار کا مزاج

میں کیا کہوں کہ شرم سے کیسے جھکا کے سر
پوچھا انھوں نے حسرتِ بیمار کا مزاج

گزر گئی مدتِ پائمالی عتابِ ترکِ کلام کب تک
ترے ... گریۂ پیام و سلام کب تک

قفس میں صیاد بند کر دے نہیں تو یہ حرم چھوڑ ہی دے
یہاں امید و بیم آخر رہیں گے ہم زیرِ دام کب تک

کچھ عرضِ حال کرنے نہ پائے کسی سے ہم
کس طرح شکوہ سنج نہ ہوں بیخودی سے ہم

ناکامیوں پہ اپنی ہنسی آ گئی تھی آج
سو کتنے شرمسار ہوئے بے کسی سے ہم

کس درجہ دلپذیر ہے حیرانیِ جنوں
فارغ ہیں شوقِ عزتِ فرزانگی سے ہم

ستایئے نہ مجھے یوں ہی دلفگار ہوں میں
رُلایئے نہ مجھے خود ہی بیقرار ہوں میں

ترا یہ رنگ کہ ہے بے سبب خفا مجھ سے
مرا یہ حال کہ بے وجہ بیقرار ہوں میں

نہ درد مند ہوا حسرت، کہ اب بجائے ستم
کرے جو لطف بھی کوئی تو اشکبار ہوں میں

پھر ادائے تغافل کا سبب کیا ہے خدایا
میں یاد نہ آؤں انھیں ایسا نہیں ممکن

اس بیخودیٔ شوق کی ہو کس سے شکایت
وہ سامنے ہیں پھر بھی تماشا نہیں ممکن

ملتے ہیں اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں
کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں

شوقِ بقائے درد کی ہیں ساری خاطریں
ورنہ دعا سے اور کوئی مدعا نہیں

خود اس کو میری عرضِ تمنا کا شوق ہے
کیوں ورنہ یوں سنے ہے کہ گویا سنا نہیں

کب یہ کہتے ہیں کہ ہم تیرے گنہگار نہیں
ہاں مگر اتنی جفا کے بھی سزاوار نہیں

نہ سہی آپ جفا سے جو نہیں باز آتے
جائیے جائیے اب ہم کو بھی اصرار نہیں

دستِ نازک سے تو قاتل نہ اٹھی تلوار
اور ہوا نام مرا مفت گرانجانوں میں

یادِ ایام کہ ہم جوشِ جنوں میں حسرت
خوار پھرتے تھے پریشان بیابانوں میں

مضطرب ہے بہت میری طبیعت کئی دن سے
دیکھی جو نہیں آپ کی صورت کئی دن سے

چھیڑے ہے مجھے پھر خلشِ خارِ محبت
بیچین ہے کیا میری طبیعت کئی دن سے

ہزاروں بار نکلا اشک لیکن پھر بھی کم نکلے
الٰہی اور کیسے آرزوئے چشمِ نم نکلے

ہزاروں بار چھیڑا کاوشِ غمہائے فرقت نے
ہزاروں بار آنسو آپ کے سر کی قسم نکلے

وہ جو بیچین ہوئے دیکھ کے حالت میری
ہو گئی اور پریشان طبیعت میری

دیکھ لینا کہ وفا میری رلائے گی تمھیں
یاد آئے گی مرے بعد محبت میری

آہ وہ ذکر پہ حسرت کے کسی کا کہنا
لوگ کہتے ہیں کہ ہے اسکو محبت میری

کہاں شکوے تھے جورِ ناروا کے
کہاں اب شوق ہیں انکی جفا کے

سناتے ہیں انھیں افسانۂ قیس
بہانے ہیں یہ عرضِ مدعا کے

خدا جانے تجھے اے دل تمنائے شفا کیوں ہے
یہ ان کے درد سے بے وجہ آخر تو خفا کیوں ہے

غمِ ہجراں کا یارب کس زباں سے ماجرا کہئے
نہ کہئے گر تو کیا کیجے اگر کہئے تو کیا کہئے

کہاں ہر لحظہ پیشِ دوست محوِ لطف رہتے تھے
کہاں یہ صدمہائے غم اٹھاتے ہیں کہ کیا کہئے

وہی آرزوئیں ہیں حسرت وہی ہے
تجھے تم سے ابتک محبت وہی ہے

ہوئی گرچہ ترکِ محبت کو مدت
مگر مجھ کو رونے کی عادت وہی ہے

اٹھا ہے ان میں گو خوئے تغافل آتی جاتی ہے
مگر ہے یوں کہ ان کو مجھ سے الفت بڑھتی جاتی ہے

بہار آئی ہے ساقی بادۂ گلگوں پلانا بھی
کہاں کی پارسائی کیسی توبہ جام لانا بھی

وہ آغازِ محبت میں کرم ان کا جفا انکی
رہیگا یاد حسرت ہم کو برسوں وہ زمانہ بھی

فکر سے تو نہ ہوا وصل کا ساماں کوئی
تو ہی تدبیر بتا اے دلِ ناداں کوئی

موسمِ گل میں عجب رنگ ہیں دیوانوں کے
چاک داماں ہے کوئی چاک گریباں کوئی

بیکلی سے مجھے راحت ہوگی
چھیڑ دیں آپ عنایت ہوگی

ایک دن کھول کے جی رو دیں گے
ضبطِ غم کی جو اجازت ہوگی

چھیڑا ہے دستِ شوق نے مجھ سے خفا ہیں وہ
گویا کہ اپنے دل پہ مجھے اختیار ہے

وہ سب مزے تھے کاوشِ دردِ جگر کے ساتھ
اب اشکبار آنکھ نہ دل بیقرار ہے

پھر تغافل کس لئے گر محبت دل میں ہے
سچ بتا کیا تیرے آخر بے مروت دل میں ہے

عذرِ گناہ پر بھی اس درجہ کج ادائی
اللہ ری کم نگاہی اللہ ری بے وفائی

تیرا فسوں کہاں ہے اے گریۂ محبت
کر آہِ نارسا کی کچھ تو ہی رہنمائی

عفوِ خطا کی حسرت بیکار ہیں امیدیں
اس دشمنِ وفا سے اب ہو چکی صفائی

شرمِ جفا سے لطف سراپا بنے ہوئے
وہ آجکل ہیں جانِ تمنا بنے ہوئے

جملہ ۴۲ اشعار

سنہ ۱۹۰۳ سنہ ۱۹۱۳ء

رونقِ پیرہن ہوئی خوبیٔ جسمِ نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

طے نہ کسی سے ہو سکا تیرے سوا معاملہ
جانِ امیدوار کا حسرتِ محوِ یاس کا

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرمِ نیاز
تجھ کو آخر آشنائے نازِ بیجا کر دیا

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہِ سکوں
دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

جورِ پیہم نہ کرے شانِ توجہ پیدا
دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

تجھ سے وہ ملا شوق سے اور تو نے نہ جانا
حسرت کو ابھی یاد ہے سادہ زمانا

اب عشق کا وہ حال نہ ہے حسن کا وہ رنگ
باقی ہے فقط عہدِ تمنا کا فسانا

آتی ہے تری یاد، سو حسرت کو شبِ غم
ہر بار اسے افسانۂ دل کہہ کے سنانا

کوئی بھی پرساں نہیں حالِ دلِ رنجور کا
یہ ستم دیکھو دیارِ شوق کے دستور کا

جاتے جاتے رہ گیا وہ نازنیں صبحِ وصال
نازبردارِ اثر ہوں گریۂ مجبور کا

خاطرِ مایوس میں نقشِ امیدِ وصلِ یار
نور ہے صحرا میں گویا اک چراغِ دور کا

دل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا
ساغر کو رنگِ بادہ نے پرنور کر دیا

مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل
پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا

بیتابیوں سے چھپ نہ سکا ماجرائے دل
آخر حضورِ یار بھی مذکور کر دیا

ہم نے کس دن ترے کوچے میں گزارا نہ کیا
تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

ایک ہی بار ہوئیں وجہِ گرفتاریٔ دل
التفات انکی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

گر یہی ہے ستمِ یار تو ہم نے حسرت
نہ کیا کچھ بھی جو دنیا سے کنارا نہ کیا

چہرۂ یار سے نقاب اٹھا
دل سے اک شورِ اضطراب اٹھا

رات پیرِ مغاں کی محفل سے
جو اُٹھا مست اُٹھا خراب اُٹھا

ہم تھے بیباک اور وہ محجوب
شب غمِ لطف بے حساب اُٹھا

مست صہبائے شوق ہے حسرت
ہمنشیں ساغرِ شراب اُٹھا

ہجومِ بیکسی کو دستِ الفت بیکراں پایا
کہ ہم نے آج اس نامہرباں کو مہرباں پایا

کہیں تھا رازِ ناز بزمِ یار میں [illegible]
کسی کو سرنگوں دیکھا کسی کو شادماں پایا

کسے فرصت تھی اے تیری نگاہِ شوق دید سے
ابھی ہم نے کہاں ڈھونڈھا ابھی ہم نے کہاں پایا

ہجومِ غم [illegible]
فراق نے التفات کا دریا بہا دیا

اب وہ ہجومِ شوق کی سرمستیاں کہاں
مایوسیِ فراق نے دل ہی بجھا دیا

اضطرابِ عاشقی پر کارفرما ہوگیا
صبر میرا ناشکیبائی سراپا ہوگیا

سادگیہائے تمنا کے مزے جاتے رہے
ہو گئے مشتاق ہم اور وہ خودآرا ہوگیا

نہاں شانِ تغافل میں ہے رمزِ امتیاز اُسکا
باندازِ جفا ہے التفاتِ دلنواز اُس کا

غلط ہے شکوہ تنہا میرے عشقِ ناشکیبا کی
بجا کرتا ہی جو کرتا ہی حسنِ بے نیاز اُس کا

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرت کا
وہ وضعِ پارسا اسکی وہ عشقِ پاکباز اُسکا

بر سرِ ناز وہ از راہِ کرم پہونچا تھا
شب عجب لطف کا سامان بہم پہونچا تھا

شرحِ بیمہریِ احباب کریں کیا حسرت
رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہونچا تھا

ادب کہ نازِ یار بشکلِ عتاب تھا
جو کامیاب تھا وہی ناکامیاب تھا

اب میں ہوں اور تغافلِ بسیار کے گلے
وہ میں کہ موردِ کرمِ بے حساب تھا

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا
باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا

عشقِ روزافزوں پہ اپنے مجھکو حیرانی نہ تھی
جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو نازِ یکتائی نہ تھا

دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی
جبکہ تیرا حسن سرگرمِ خودآرائی نہ تھا

کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق
ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا

مٹتا ہے مٹائے سے اب شوق کہیں تیرا
ہے پیشِ نظر ہر دم حسنِ نمکیں تیرا

آنکھوں کے تبسم نے سب کھول دیا پردہ
ہم پر نہ چلا جادو اے چینِ جبیں تیرا

سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا
باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا

گر جوششِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی
میں بھول جاؤنگا کہ مرا مدعا ہے کیا

اک برقِ مضطرب ہے کہ اک سحرِ بیقرار
کچھ پوچھئے نہ وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا

چل بھی دئے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا
آئینِ اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

مجھ کو خبر نہیں کہ مرا مرتبہ ہے کیا
یہ تیرے التفات نے آخر کیا ہے کیا

ملتیں کہاں گدائے طبیعت کی لذتیں
رنجِ فراقِ یار بھی راحت فزا ہے کیا

کیا کہئے آرزوئے دلِ مبتلا ہے کیا
جب یہ خبر بھی ہو کہ وہ رنگیں ادا ہے کیا

دیکھو جسے ہے راہِ فنا کی طرف رواں
تیری محل سرا کا یہی راستا ہے کیا

ہم کیا کریں اگر نہ تری آرزو کریں
دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا

یوں شکرِ جور کرتے ہیں تیرے اداشناس
گویا وہ جانتے ہی نہیں ہیں گلا ہے کیا

رونے لگے ابھی سے کہ ہے ابتدائے حال
تم نے ابھی فسانۂ حسرت سنا ہے کیا

نالوں کو جس نے صبر سے بیگانہ کر دیا
کیا کہئے آہ وہ نگہِ آشنا ہے کیا

غضب ہے دل کا حالِ شوق اُنسے مجمل کہنا
مگر کاہے کو مانے گا یہ پابندِ اجل کہنا

ارادے تھے کہ اُنسے حالِ دل سب ٹھیک کہدینگے
مگر ملنے پہ ہم سے آج ہوتا ہے نہ کل کہنا

غضب میں جان ہے پابندیِ آدابِ الفت سے
کہ ہر ہر بات کو در پردہ کہنا فی المثل کہنا

ادا نہ ہم سے ہوا حق تری غلامی کا
نصیبِ شوق رہا داغ ناتمامی کا

کھلا نہ ہم سے خموشانِ آرزو کی زباں
جو اتفاق کبھی ہو اُن سے ہمکلامی کا

بقدرِ شوق کہاں تابِ التماس ہمیں
لکھیں جواب جو اس نامۂ گرامی کا

اک برقِ طپاں ہے کہ تکلم ہے تمھارا
اک سحر ہے لرزاں کہ تبسم ہے تمھارا

صحبتِ اہلِ عشق و شغلِ شراب
تھا یہی مقتضائے عہدِ شباب

جان بھی دی پیامِ شوق کے ساتھ
ہم نے کھینچا نہ انتظارِ جواب

جانفزا تھی کسقدر یارب ہوائے کوئے دوست
بسگئی جس سے مشامِ آرزو میں بوئے دوست

بن گئی محفل کی محفل اک طلسمِ بیخودی
چل گیا آخر فسونِ نرگسِ جادوئے دوست

جو نازِ حسن سے کی تھی کبھی غرور کی بات
سو آج تک ہے تجھے یاد وہ حضور کی بات

بدیر جاکے ہوا ختم سلسلہ اس کا
چلی جو اہلِ خرابات میں سرور کی بات

یہ ہوا جیتا ہیوں پر نشۂ مے کا اثر
کہدیا سب اُن سے حالِ شوق گستاخانہ آج

حسرتیں دلکی ہوئی جاتی ہیں پامالِ نشاط
ہے جو وہ جانِ تمنا رونقِ کاشانہ آج

ہم بھی مشتاق ہیں شہادت کے
اے تجھے خونِ اہلِ شوق مباح

شرمندۂ جور ہو نہ وہ شوخ
اربابِ وفا ہیں یوں بھی خرسند

سیکھا ہے کہاں سے اے لبِ یار
یہ شیوۂ دلکشِ شکرخند

لے صبر و سکوں سے کام حسرت
آئینِ وفا کی تجھ کو سوگند

یہ ماتمِ روزِ وصل تاکے
یہ گریۂ بیقرار تاچند

مجبور مجھ کو جان کے عہدِ وفا کے بعد
بے مہریاں وہ کرنے لگے اعتنا کے بعد

تم پر مٹے تو زندۂ جاوید ہو گئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد

صبر مشکل ہے ضبط ہے دشوار
دل وحشی ہے اور جنونِ بہار

لطف کر لطف اے سراپا ناز
تجھ پہ رنگینیِ بہار نثار

اب تو اُٹھ سکتا نہیں آنکھوں سے بارِ انتظار
کس طرح کاٹے کوئی لیل و نہارِ انتظار

اُنکی الفت کا یقیں ہو اُنکے آنے کی امید
ہوں یہ دونوں صورتیں تب ہے بہارِ انتظار

انکے خط کی آرزو ہے اُن کی آمد کا خیال کس قدر پھیلا ہوا ہے کاروبارِ انتظار
ہے غضب ہنگامۂ فصلِ بہاراں کی برس دل پہ کاہے کو رہیگا اختیار ابکی برس
فرقتِ ساقی میں ہم حسرت کشانِ بادہ سے مل کے رویا خوب ابرِ نو بہار ابکی برس
مدتیں ترکِ محبت کو ہوئیں پھر لے عجب یاد یار آتی ہے کیوں بے اختیار ابکی برس

پیمانِ وفا نہ کر فراموش اے حسرتِ بیقرار خاموش
پوشیدہ سکونِ یاس میں ہے اک محشرِ اضطراب خاموش
آزاد ہیں قید میں بھی حسرت ہم دل شدگانِ خود فراموش

سب ہیں تری انجمن میں بیہوش نظارۂ حسن کا کسے ہوش
تم آنے کو ختم ہو گئے ہم باقی تھے مگر اسی لئے ہوش

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
اللہ ری جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

کام لوں ناکامیوں سے عشق کا کونا کروں ہو کے واقف لطفِ غم سے رات دن رویا کروں
بڑھ چلا تھا حد سے جو رشیوۂ بیگانگی ورنہ میں اور اس سراپا ناز کا شکوا کروں
مجھ سے تم چھپنے لگے، اچھا کیا، یونہیں سہی اور جو میں اب بھی دل سے تمہیں دیکھا کروں
اے ستمگر مجھ سے گو ترکِ وفا ممکن نہیں میں کروں لیکن کبھی ایسا تو کیا بیجا کروں
حسرت اُس پر آشنائی آرزو آساں نہیں دل میں پہلے ضبطِ غم کا حوصلا پیدا کروں

آوارۂ دشتِ جستجو ہیں ہم خانہ بدوشِ آرزو ہیں
دشوار ہے اہتمامِ تمکیں ہم پیرِ ہلاکِ گفتگو ہیں

بدل لذتِ آزار کہاں سے لاؤں اب تجھے اے ستمِ یار کہاں سے لاؤں
پرسشِ حال پہ ہے خاطرِ جاناں مائل جرأتِ کوششِ اظہار کہاں سے لاؤں
ہے وہاں شانِ تغافل کو جفا سے بھی گریز التفاتِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں

نہیں ہے قدرداں کوئی تو میں بھی قدرداں اپنا تکلف برطرف بیگانۂ رسمِ شکایت ہوں
کمالِ خاکساری پر یہ بے پروائیاں حسرت میں اپنی داد خود دیتے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں

نگاہِ یار بھی کس کس ادا سے لطف کرتی ہے تغافلہائے پیدا میں نوازشہائے پنہاں میں
مجھے معلوم ہے پھر جوشِ الفت رخنہ ڈالیگا ترے عہدِ تغافل میں مرے پیمانِ حرماں میں
الٰہی خیر میرے عہدِ ترکِ مے گساری کی ہجومِ شوق میں ہنگامۂ فصلِ بہاراں میں

ہم پر بھی مثلِ غیر ہیں کیوں مہربانیاں اے بدگماں یہ خوب نہیں بدگمانیاں
• ٹھہرا ہے ضبطِ شوق پہ آکر معاملہ اس درجہ آرزو کی بڑھیں بے زبانیاں
گو ترکِ آرزو کو زمانہ گزر گیا لیکن گئیں نہ ہم سے تری سرگرانیاں

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں الٰہی ترکِ اُلفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد انکی مہینوں تک نہیں آتی مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں
بیزبانی ترجمانِ شوق بیحد ہو تو ہو ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

عشق میں جان سے گزر جائیں اب یہی جی میں ہے کہ مر جائیں
شب وہی شب ہے دن وہی دن ہیں جو تری یاد میں گزر جائیں

قصۂ شوق کہوں درد کا افسانہ کہوں دل ہو آمادہ تو اس شوخ سے کیا کیا نہ کہوں
خود ہے اقرار انھیں اپنی ستمگاری کا پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ میں ایسا نہ کہوں
آپ بیٹھیں تو سہی آکے مرے پاس کبھی کہ میں فرصت میں حدیثِ دلِ دیوانہ کہوں

کسی عنوان صبر آتا نہیں مجھ ناشکیبا کو الٰہی کیا کروں اس خاطرِ محوِ تمنا کو
نہ تھی واقف جو میرے اشتیاقِ بے نہایت سے نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں اس نگاہِ بے محابا کو
وہ خوابِ ناز میں تھے اور تھی لے شوقِ پابوسی دیکھی پہ ہمت تری اس لطفِ ابا کو

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ تری نگاہ کو اللہ دلنواز کرے
ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

لایا ہے دل پر کتنی خرابی اے یار تیرا حسنِ شرابی
پیراہن اُس کا ہے سادہ رنگیں یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی
عشرت کی شب کا وہ دورِ آخر نورِ سحر کی وہ لاجوابی
پھرتی ہے ابتک دل کی نظر میں کیفیت اُن کی وہ نیم خوابی
اس قیدِ غم پر قربان حسرت عالی جنابی گردوں رکابی

اور تو پاس مرے ہجر میں کیا رکھا ہے اک ترے درد کو پہلو میں چھپا رکھا ہے
آہ وہ یاد کہ اُس یاد کو ہو کر مجبور دلِ مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے
نگہِ یار سے پیکانِ قضا کا مشتاق دلِ مجبور نشانے پہ کھلا رکھا ہے

دل کو تری دزدیدہ نظر لے کے گئی ہے اب یہ نہیں معلوم کدھر لے کے گئی ہے
اُس بزم سے آزردہ نہ آئے گی محبت آئینِ وفا تا بہ نظر لے کے گئی ہے

ستم تم چھوڑ دو میں شکوہ سنجیہائے ناچاری کہ فرضِ عین ہے کیشِ محبت میں رواداری
ہوئیں ناکامیاں بدنامیاں رسوائیاں کیا کیا نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوئے جاناں کی ہواداری
نہیں غم جیب و دامن کا مگر ہاں فکر ہے اتنی نہ اُٹھیگا مرے دستِ جنوں سے رنجِ بیکاری
نہ اُن کو رحم آتا ہے نہ مجھ سے صبر ہے ممکن کہیں آساں ہو یارب محبت کی یہ دشواری
وفورِ اشکِ پیہم سے ہجومِ شوقِ سجدہ میں مری آنکھوں سے ہے اک آبشارِ آرزو جاری

نہ دیکھے اور دلِ عشاق پر پھر بھی نظر رکھے / قیامت ہے نگاہِ یار کا حسنِ خبرداری
یہی عالم رہا گر ایک حسنِ سحر پرور کا / تو باقی رہ سکیگی دنیا میں راہ و رسمِ ہشیاری
چلا برسات کا موسم نہ چھوٹے قیدِ غم سے ہم / بڑی بے لطفیوں میں اب کی گزرا وقتِ میخواری

عشاق کے دل نازک اس شوخ کی خو نازک / نازک اسی نسبت سے ہے کارِ محبت بھی
ہر چند ہے دل شیدا حریتِ کامل کا / منظورِ دعا لیکن ہے قیدِ محبت بھی

آنکھوں کو انتظار سے گردیدہ کر چلے / تم یہ تو خوب کارِ پسندیدہ کر چلے
ہم بیخودوں سے چھپ نہ سکا رازِ آرزو / سب سے عرضِ حالِ دل و دیدہ کر چلے
یہ طرفہ ماجرا ہے کہ حسرت سے مل کے وہ / کچھ جان و دل کو اور بھی شوریدہ کر چلے

اربابِ اشتیاق سے پروا نہ چاہیے / اے حسنِ خود نما تجھے ایسا نہ چاہیے
کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں تری کج ادائیاں / اس درجہ اعتبارِ تمنا نہ چاہیے
انتہائے عشق ہے انتقا پہ تو حسن سے / اظہارِ آرزو میں محابا نہ چاہیے

روشِ حسنِ مراعات چلی جاتی ہے / ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے
اُس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتا / سعیِ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے

توڑ کر عہدِ کرم نا آشنا ہو جائیے / بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے
میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجے التفات / بلکہ پہلے سے بھی بڑھکر کج ادا ہو جائیے
خاطرِ محروم کو کر دیجیے محوِ الم / درپئے ایذائے جانِ مبتلا ہو جائیے
میری تحریرِ ندامت کا نہ دیجے کچھ جواب / دیکھ لیجے اور تغافل آشنا ہو جائیے
مجھ سے تنہائی میں گر ملیے تو دیجے گالیاں / اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جائیے
ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا / آپ کچھ اس سے بھی بڑھکر پرجفا ہو جائیے
جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے / اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے
دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال / آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جائیے
ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں / یعنی آ کر بے نیازِ مدعا ہو جائیے
بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد / اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے
ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر / اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے

ابھی دیکھی نہیں گستاخیاں جوشِ تمنا کی / تمہاری کم نگاہی التماسِ بے زباں تک ہے
سکھا دیگی ندامت شیوۂ قدرِ وفا انکو / یہ شانِ کج ادائی میری جانِ ناتواں تک ہے

ترا ناز بھول بیٹھا مری سب نیازمندی / بغرورِ دلربائی بہ یقینِ دلپسندی
نہ ہے اختیار تجھ پر نہ ہے اعتبار دل پر / ترے عاشقوں کا دیکھے کوئی رنگِ تمندی
مجھے شکوۂ جفا کی نہیں آنے پاتی نوبت / وہ ستم بھی گر کرے ہے تو بلطفِ ہوشمندی
تری بزمِ ناز ظالم ہے عجب طلسمِ حیرت / کہ جہاں ہے میرے دل کو سرِ خدمت پسندی
غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں / مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

تھی راحتِ حسرت کی کس درجہ فراوانی / میں نے غمِ ہستی کی صورت بھی نہ پہچانی
دیکھ اے ستمِ جاناں یہ نقشِ محبت ہیں / بنتے ہیں بدشواری مٹتے ہیں بآسانی
میں اُس بتِ بدخو کی اس آن پہ قرباں ہوں / کھینچا نہ کبھی اُس نے اندوہِ پشیمانی

سُن چکے شادی سے ملالِ خاطرِ ناشاد کے / ہم کہ خوگر ہیں سپاسِ لذتِ بیداد کے
دیکھ کر عالم مری حیرانیِ خاموش کا / اُڑ گئے ہوش اُنکی تمکینِ ستم ایجاد کے

مینوشیوں میں بیخبرِ دو جہاں رہے / ہم خوش رہے کہ بندۂ پیرِ مغاں رہے
یہ مقتضائے رابطۂ حسن و عشق تھا / ہم بدگماں ادھر، وہ ادھر بدگماں رہے
محرومیِ وفا سے نہ آیا یقینِ لطف / وہ مہرباں ہوئے بھی تو ہم بدگماں رہے
اُن سے شبِ وصال بھی کھلکر نہ ہم ملے / تا صبح شکوہائے جفا درمیاں رہے

اُس نازنیں سے ہمکو پہنچنے گزند پہونچے / سب دلپذیر پہونچے سب دلپسند پہونچے
عالم ہی اب نہیں وہ تفریحِ بے دلی کا / محفل میں تیری ناحق ہم دردمند پہونچے

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے / دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا / اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے / اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں / یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے
یاد ہیں وہ حسنِ الفت کی نرالی شوخیاں / التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے
صحبتیں لاکھوں مری بیماریِ غم پر نثار / جس میں اُٹھے بارہا اُنکی عیادت کے مزے

میں ہوں مجبور دل ہے سودائی / رخصت اے صبر اے شکیبائی
مذہبِ عاشقی میں ہے اے عقل / بیخودی انتہائے دانائی
بندۂ بندگانِ حضرتِ عشق / حسرتِ سرفرازِ رسوائی

خیالِ یار میں بھی رنگ و بوئے یار پیدا ہے / یہ رنگیں ماجرائے عشقِ شیریں کار پیدا ہے
مرے انکارِ مضطر میں نہاں تھی میری ہاں دیکھی / ترے اقرارِ آساں سے ترا انکار پیدا ہے

کثرتِ التفات آموزِ مینوشی نہ تھی / ورنہ خمخانے میں ساقی مجھکو بیہوشی نہ تھی

عرضِ کرم پہ ترکِ جفا بھی نہ کیجیے / ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجیے
پھر رہیے کس امید پہ ہم زندگی کریں / جب آپ التفات ذرا بھی نہ کیجیے

تجھ میں کچھ بات ہے ایسی جو کسی میں نہ ملی / یوں تو اوروں سے بھی دل ہمنے لگا دیکھا ہے
دلِ بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت / نگہِ شوق نے کیا جانئے کیا دیکھا ہے

مجبورِ وفا کر کے محرومِ کرم کرنا / بھولینگی نہ یہ باتیں اے عہد شکن تیری
اب رونے سے کیا ہوگا پروانہ ہے بے پروا / برباد ہے سب محنت اے شمعِ لگن تیری

ظاہر ملالِ رشکِ رقابت نہ کیجیے / بہتر یہی ہے ان سے شکایت نہ کیجیے
مٹنے نہ پائیں رنجشِ باہم کی لذتیں / رفعِ ملال و دفعِ کدورت نہ کیجیے

عذرِ ستم ضرور نہ تھا آپ کے لئے حسرت کو شرمسار ندامت نہ کیجئے

ستم ہو جائے تمہیدِ کرم ایسا بھی ہوتا ہے محبت میں بتا اے ضبطِ غم ایسا بھی ہوتا ہے
جفائے یار کے شکوے نکرنا بیخ ناکامی امید و یاس دونوں ہوں بہم ایسا بھی ہوتا ہے

دل کی جو ترکِ عشق سے حالت بدل گئی وہ بے خودی و خرّمی بے خلل گئی
تجھ کو زوال نے مجھ سے چھڑایا تو کیا ہوا کیا تیری یاد بھی مرے دل سے نکل گئی
اب دل ہے اور فراغِ محبت کی راحتیں تشویشِ زندگانی و فکرِ اجل گئی

دلِ مایوس کو سرچشمۂ صدق و صفا کر دے گدازِ غم اگر چاہے تو مجھ کو باخدا کر دے
عطا کر دے اس دشمنِ وفا کو توفیقِ کرم یا رب نہیں تو پھر مجھی کو بے نیازِ مدعا کر دے

تسکین ہو سکی نہ دلِ بے شکیب کی سب ہم پہ کھل گئیں تری باتیں فریب کی

نہ مجھ کو اس کی خبر ہے نہ خود انھیں ہے خیال کچھ اس طرح سے محبت بڑھائی جاتی ہے
دوچار ہو نظرِ شوق اس سے کیا حسرت نگاہِ یار تو دل میں سمائی جاتی ہے

دل میں کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی روبرو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی
ہم رہے شیوہ ہیں تا دلِ ستم خو والیں کیا ہوا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی
[illegible] ان کی تصویر بھی آنکھوں سے نکالی نہ گئی
دل کو تھا حوصلۂ عرضِ تمنا سو انھیں سرگزشتِ شبِ ہجراں بھی سنائی نہ گئی
کم رہی یہ کشاکش تو بہت کی لیکن یادِ ان کی دلِ حسرت سے بھلائی نہ گئی

دل آرزوئے شوق کا اظہار نہ کر دے ڈرتا ہے مگر یہ کہ وہ انکار نہ کر دے
ہشیار کہ اس پرسشِ پیہم کی نوازش عشاقِ ستم کش کو ہوسکار نہ کر دے
ہم جور پرستوں پہ گماں ترکِ وفا کا یہ وہم کہیں تجھ کو گنہگار نہ کر دے
کچھ حد بھی ہے اس شورشِ خاموش کی حسرت یہ کشمکشِ غم تجھے بے کار نہ کر دے

جملہ ۲۲۷ اشعار

سنہ ۱۹۱۲ء - ۱۹۱۶ء

شرفِ حاصل ہے اس جانِ جہاں سے مجھ کو نسبت کا غلامی کا ہی گر ہو نہ سکتا ہو محبت کا
غضب تھی عشق کے جذباتِ گوناگوں کی رنگینی دلِ حسرت بھی اک نیرنگ ہے رازِ محبت کا
وہ میرے قتل ہی کو آئیں لیکن سامنے آئیں نتیجہ کچھ تو نکلے جذب و تاثیرِ محبت کا

تجھ سے گرویدہ اک زمانہ رہا کچھ فقط میں ہی مبتلا نہ رہا
آپ کو اب ہوئی ہے قدرِ وفا جب کہ میں لائقِ جفا نہ رہا
عشق جب شکوہ سنجِ حسن ہوا انتہا ہو گئی گلا نہ رہا

بجاں منظور ہے جو کچھ سزا ہو جرمِ الفت کی کہ ہم نے فیصلہ اس بات کا بھی آپ پر رکھا
نہ کرنا تھا ہمیں دعوے تمکیں پر کیا دل پر نہ رکھنا تھا انھیں الزامِ بیتابی مگر رکھا
جذبِ کامل کو اثر اپنا دکھا دینا تھا میرے پہلو میں انھیں لا کے بٹھا دینا تھا

تم جو افسردہ ہوئے سنکے مرا حال سو کیوں سرسری طور سے باتوں میں اڑا دینا تھا
وہ جو بگڑے تو خفا تم بھی ہوئے کیوں حسرت پائے نخوت پہ سرِ شوق جھکا دینا تھا

قرب میں ہے نہ بُعدِ یار میں تھا جو مزہ اس کے انتظار میں تھا
مجھ پر اب طعنِ اضطراب ہے کیوں دل انھیں کے تو اختیار میں تھا
ہم بھی آخر ہلاکِ شوق ہوئے یہی دستور اس دیار میں تھا

مایوس نہ یوں ہوتے تو دور اگر ہوتا ہم کچھ نہ سمجھے کہتے مجبور اگر ہوتا
کچھ دادِ وفا حسرت ہم کو نہ ملی ملتی دنیا میں یہ افسانہ مشہور اگر ہوتا

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہوا
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
کون لاتا ترے عتاب کی تاب خیر گزری کہ سامنا نہ ہوا
چھڑ گئی جب جمالِ یار کی بات ختم تا دیر سلسلہ نہ ہوا
میں گرفتارِ الفتِ صیاد دام سے چھوٹ کے بھی رہا نہ ہوا
ہجر میں جانِ مضطرب کو سکون آپ کی یاد کے سوا نہ ہوا

کون لے عرضِ حال کر کے عذاب جان پر اُن کی سرگرانی کا

شوقِ پوشیدہ کا اظہار نہ ہونے پایا داغِ دل کوئی نمودار نہ ہونے پایا
دل کچھ اس ڈھب سے لئے اُنسے کہ برسوں کوئی حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پایا

محفل میں اُن سے کی ہوں گستاخیاں کسی نے پردہ یہی کہیں گے "سب ہے قصور تیرا"
بیتابِ دل کے ہاتھوں کیوں لے اسیرِ الفت پھر اس گلی میں جانا ٹھہرا ضرور تیرا

انھیں منا کے بھی اظہارِ حال ہو نہ سکا قبولِ عذر سے رفعِ ملال ہو نہ سکا
جفا سے باز نہ آئے تم اور کیوں آتے کہ ہم سے ترکِ وفا کا خیال ہو نہ سکا
حضورِ یار گئے بھی تو کیا ہوا حسرت سلام کر نہ سکے ہم سوال ہو نہ سکا

یاس کا دل پہ کچھ اثر نہ ہوا قصۂ شوق مختصر نہ ہوا
اشکِ پیہم سے شوقِ بیجد کا گوشۂ آستیں بھی تر نہ ہوا
صرفِ عصیاں ہوا وہ لحظۂ عمر جو تری یاد میں بسر نہ ہوا

شکوۂ عشق جو ہم سے کسی عنواں نہ ہوا حشر میں بھی وہ جفاکار پشیماں نہ ہوا
شکوۂ جور کا دیتے ہو تغافل سے جواب دشمنی یہ تو ہوئی مجھ پہ کچھ احساں نہ ہوا

ہر گھڑی شیخ کو ہے فکرِ ثواب یہ بھی اک طرح کا عذاب ہوا
اب یہ کیوں آپ من کے پھر بگڑے اب یہ کس بات پر عتاب ہوا
آپ کے ہاتھ سے کرم کہ ستم جو ہوا مجھ پہ بے حساب ہوا

لطف تو نے جو کیا بھی تو عجب کام کیا دلِ دیوانہ کو سرگشتۂ اوہام کیا
جس کو جو تھے تھی سزاوار خدا نے بخشی تجھ کو جانباز کیا تجھ کو دلآرام کیا

پھر گئی نور سے تاریک شب منتظراں … جلوہ اس روئے نکو نے جو سرِ بام کیا
کچھ محبت بھی عجب شے ہے کہ حسرت سا غیور … اور اسے آپ نے خود کردۂ دشنام کیا

وصل میں بھی تو وہی ہے دل کی شانِ اضطراب … عیش حاصل ہو رہا ہے رائگاں اضطراب
شوقِ بیحد کے ارادوں سے واقف نازِ حسن … شرمِ خوباں سب سمجھتی ہے زبانِ اضطراب
حوصلے اب تک وہی ہیں خاطرِ بیتاب کے … ناتوانی میں بھی ہے باقی توانِ اضطراب

جان کو صبر ہے نہ دل کو ہے تاب … تو نہیں ہے تو زندگی ہے خراب
نشۂ مے سے بڑھے شوق کی مستی ساقی … نظر لطف بھی اک ہو جو پسِ جامِ شراب
قیدِ مینا سے نہ مے چھٹ کے بھی آئی اب تک … حائل اک اور رہی حدِ قفسِ جامِ شراب

آج سنکر میرے نالوں کو زراہِ التفات … زیرِ لب اُسنے بھی کھینچی ایک آہِ التفات
دوستی اس فتنۂ دوراں کی ہے یادش بخیر … جان بربادِ کرم ہے دل تباہِ التفات
شوق کا حسنِ عقیدت دیکھنا اکثر ہوا … تیری بے پروائیوں پر اشتباہِ التفات
ہے دلِ دیوانۂ حسرت ہلاکِ آرزو … اس طرف بھی اے ستمگر اک نگاہِ التفات

سب نے آخر خدا پہ چھوڑ دیا … تیرے بیمار کا ہوا نہ علاج
لاتے ہیں عاشقانِ با جگرِ زار … نذرِ حسرت کو آنسوؤں کا علاج

اُن کی تھی میرے حالِ دل پہ نظر … آہ اس عہدِ التفات کی یاد
کچھ نہیں ہے تری رضا کے سوا … خواہشِ عاشقِ خجستہ نہاد
غم سے تیرے نہیں ایک دل بھی آزاد … فریاد ز دستِ عشق فریاد
عاشق ہوئے اور مر مٹے ہم … اپنی تو یہ مختصر ہے روداد
ہوگا کسے جان دینے میں عذر … ارشاد اور آپ کا یہ ارشاد
رہنے لگی ان کی یاد ہر دم … اب اور ہمیں رہیگا کیا یاد
بھولے ہمیں اور سب فسانے … اک قصۂ آرزو رہا یاد

ہیں اسی حال میں اب تک تری فرقت کے مریض … کچھ نہ ہوتی ہے دعا کی نہ دوا کی تاثیر
اب وہ کرتے ہیں جفا بھی تو ہمیں پر حسرت … بارے اتنی تو ہوئی آہِ رسا کی تاثیر

عشق تھا بار بار یہ [illegible] … ہم کو ہے یاد وہ زمانہ ہنوز
سُرخیٔ چشمِ یار سے ہے عیاں … اثرِ مستیٔ شبانہ ہنوز

وہ تو کر دیں مرا قصور معاف … میں ہی کہتا نہیں حضور معاف
میں نے اقبالِ جرمِ عشق کیا … اور انھوں نے کیا ضرور معاف
اُنکے قدموں پہ گر بھی جا حسرت … یوں نہ ہوگا ترا قصور معاف

دل تیری طلب میں رہے بیتاب کہاں تک … اے بیخبر اے دشمنِ احباب کہاں تک

توہی دل شادماں دل پارسا دل … ترے عاشق نے بھی پایا ہے کیا دل
بڑی درگاہ کا سایل ہوں حسرت … بڑی امید ہے میری بڑا دل

کیا ہی شرمندہ چلے ہیں دلِ مجبور سے ہم … آئے تھے انکی زیارت کو بڑی دور سے ہم
دیکھنا ایک نظر بھی اُنھیں ٹھہرا ہے گناہ … درخورِ عفو ہیں واقف نہ تھے دستور سے ہم
ربط باہم کی ہو کیا شکل کہ آگاہ نہیں … دلِ رنجور سے تم خاطرِ مسرور سے ہم

تصور میں وہ شوخ تھا ہم سے باہم … عجب لذتِ بے خودی تھی فراہم
سب آئے پر اک تو نہ آیا نہ آیا … ترا دیر دیکھا کئے راستا ہم
جفا کو وفا سمجھیں کب تک بھلا ہم … اب ایسے بھی ان کے نہیں مبتلا ہم
یہ کیا منصفی ہے کہ محفل میں تیری … کسی کا بھی ہو جرم پائیں سزا ہم
تری خوئے برہم سے واقف تھے پھر بھی … ہوئے مفت شرمندۂ التجا ہم

عشق میں صبر و سکوں لے دلِ ناکام کہاں … اُس دلآرام کی خواہش ہے تو آرام کہاں
حسرتِ زار ہے اور کشمکشِ یاس و امید … اب وہ بالیدگیِ شوق کا ہنگام کہاں

دیکھے کوئی نیرنگِ محبت کے یہ نقشے … کرتے ہیں جفا آپ تو دیتا ہوں دعائیں
آزردگیِ شوق بھی کیا شے ہے کہ حسرت … جانا نہ کسی نے وہ خفا ہیں کہ خفا میں

کیسے چھپاؤں رازِ غم دیدۂ تر کو کیا کروں … دل کی تپش کو کیا کروں سوزِ جگر کو کیا کروں
غیر ہیں گرچہ ہمنشیں بزم میں ہے تو وہ حسین … پھر مجھے لیجا رہیں ذوقِ نظر کو کیا کروں
حال مرا تھا جب بتر تب تو ہوئے نہ تم خبر … بعد مرے ہوا اثر اب میں اثر کو کیا کروں
دل کی ہوس مٹا تو دی اُنکی جھلک دکھا تو دی … پر یہ کہو کہ شوق کی "بارِ دگر" کو کیا کروں
شورشِ عاشقی کہاں اور مری سادگی کہاں … حسن کو تیرے کیا کہوں اپنی نظر کو کیا کروں

ان کو دیکھوں یہ مجھ میں تاب کہاں … لے چلا ہے دلِ خراب کہاں
بے مثالی کی ہے مثال وہ حسن … خوبیِ یار کا جواب کہاں
چھوڑ دوں عفوِ حق پہ فکرِ گناہ … مجھ سے ہوتا ہے یہ حساب کہاں

اب جو بگڑے تو خوشامد نہ کریں گے ہم بھی … کہ منانے سے وہ کچھ اور خفا ہوتے ہیں
بے کہے حسن سے کہہ جائیں گے ہم شوق کی بات … کچھ یونہی خوب مطالب یہ ادا ہوتے ہیں
دل سے مجبور نہ ہوتا تو نہ آتا حسرت … آپ اس بات پہ ناحق کو خفا ہوتے ہیں

حسنِ بے مہر کو پروائے تمنا کیا ہو … جب ہو ایسا تو علاجِ دلِ شیدا کیا ہو
رات دن رہنے لگی اس ستم ایجاد کی یاد … حسرت اب دیکھئے انجام ہمارا کیا ہو

سر یہ حاضر ہے جو ارشاد ہو مر جانے کو … کون ٹالیگا بھلا آپ کے فرمانے کو
بھول جاؤں میں اُنھیں ہو نہیں سکتا ناصح … آگ لگ جائیو ظالم ترے سمجھانے کو

کافی ہیں تیرے سودائیوں کو … جا بہائے روشن دلہائے آگاہ
اس نازنیں کی محفل میں ایکدن … لے چل مجھے بھی اے شوق ہمراہ
فرقت کی شب میں کیا ہو جو حسرت … آجائے مجھ تک وہ شوخ ناگاہ

تمہیدِ صلح شوق کے سامان ہوگئے … جتنے تھے اُنکے جور سب احسان ہوگئے

اُن کی نگاہِ قہر کو ہم نے منا لیا   پھر اس طرح کہ خود بھی وہ حیران ہو گئے

انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار   ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

گر وفاداریِ اغیار کا غوغا ہے یہی   جان سے ہم بھی گزر جائیں گے سوچا ہے یہی
خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی   تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی
مرمٹیں گے جو غمِ ہجر کی ایذا ہے یہی   اک نہ اک روز ترے عشق میں ہونا ہے یہی
ناگوارا ہے بہت تلخیِ ہجراں لیکن   تم جو کہتے ہو گوارا تو گوارا ہے یہی
یہ جو ایک دردِ محبت کی خلش ہے حسرت   مقصدِ دل ہے یہی جانِ تمنا ہے یہی

اگر ہوا بھی تو اُلٹا اثر دعا میں ہوا   سکونِ یاس ملا اضطراب کے بدلے
فریب سب ہیں یہ آغازِ عشق کے حسرت   وہ لیں گے اس کرم بے حساب کے بدلے

جمالِ یار کی رنگینیاں ادا نہ ہوئیں   ہزار کام لیا ہم نے خوش بیانی سے

ابھی کچھ اور دم واپسیں ٹھہر جاتا   کچھ اور بھی جو ترا انتظار ہم کرتے
وہ وقت بھی کہیں آتا کہ عرضِ حال کے بعد   تری جفا پہ تجھے شرمسار ہم کرتے
ابھی سے تجھ پہ فدا ہو گئے تو غم کیا ہے   کہ یہ وہی ہے جو پایانِ کار ہم کرتے

تاثیر برقِ حسن جو اُن کے سخن میں تھی   اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی
واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب   آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی
غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی   جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی
اچھا ہوا کہ خاطرِ حسرت سے مٹ گئی   ہیبت سی اک جو خطرۂ دار و رسن میں تھی

بہت خجل ہے ترے درد سے دعا میری   یہ خوف ہے کہ نہ سُن لے کہیں خدا میری
چھپے وہ مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی   وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری
کہیں وہ آ کے مٹا دیں نہ انتظار کا لطف   کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری

اس پر بھی کچھ ایسا ہے راضی ہیں بہم دونوں   ہم شاد نہیں ہوتے تم یاد نہیں کرتے

میں ہوں کیا میری محبت کی حقیقت کیا ہے   اتنے پہ بھی تو نے پوچھا تری حالت کیا ہے
مجھ سے برگشتہ نہ ہوتے تو تعجب ہوتا   آپ کو عذرِ تغافل کی ضرورت کیا ہے

پہلے تو ارزاں تھی متاعِ وفا   اب یہ مرے بعد گراں ہو گئی
ہم سے تھی مخصوص پر اب وہ نظر   مائلِ نازِ دگراں ہو گئی
موت سے پوری ہوئی شرطِ وفا   پر نہ کہا تم نے کہ ہاں ہو گئی

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے   ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق   تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے
بار بار اُٹھنا اُسی جانب نگاہِ شوق کا   اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بیباک ہو جانا مرا   اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً   اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے
تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہِ لحاظ   حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے
غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف   وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے   وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے   جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے
چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ   مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے
باوجودِ ادعائے اتقا حسرت مجھے   آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے   مشتاقِ دید اور بھی للچا کے رہ گئے
آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن   آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے
ٹوکا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے انہیں   کہنے بنا نہ کچھ وہ قسم کھا کے رہ گئے

نشانۂ ستمِ بے حساب رہنے دے   خراب حالِ وفا کو خراب رہنے دے
ہزار عشق تری چشمِ نیم وا پہ نثار   نہ ڈال مجھ پہ یہ افسونِ خواب رہنے دے
میں چاہتا تو بہت ہوں کہ چپ رہوں حسرت   پہ جب یہ خاطرِ بے صبر و تاب رہنے دے

جملہ ۱۴۸۵ اشعار

۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۷ء

جلوۂ امید گویا درمیانِ فکر و یاس   اک نمونہ ہے چراغِ رہ گزارِ باد کا
سن کے ذکرِ عشق رہ جاتے ہیں اکثر ہم خموش   اب تلک اتنا اثر باقی ہے اُن کی یاد کا

دلِ مایوس کو گرویدۂ گفتار کر لینا   وہ ان کا پھر دمِ انکار میں اقرار کر لینا
سکونِ یاس بھی ممکن نہیں اب ہم غریبوں کو   قیامت ہے کسی کا وعدۂ دیدار کر لینا
یہ کیا ایذا پسندی ہو گئی حسرت عشقِ جاناں میں   تجھے ہر عقدۂ آسان کو بھی دشوار کر لینا

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا   اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا
کیا کہا میں نے جو ناحق تم خفا ہونے لگے   کچھ سنا بھی یا کہ یونہیں فیصلا ہونے لگا
کیا ہوا حسرت وہ تیرا ادعائے ضبطِ غم   دو ہی دن میں رنجِ فرقت کا گلا ہونے لگا

کچھ مرے کام نہ آئے گا طبیبوں کا علاج   بے ترے کس سے ہو برگشتہ نصیبوں کا علاج
کیا ہوا گر نہ کیا اُس نے دلِ زار پہ رحم   کون کرتا ہے بھلا ایسے غریبوں کا علاج
حالِ دل پہلے ہی ابتر تھا اور اب تو حسرت   نہ عزیزوں کی دعا ہے نہ طبیبوں کا علاج

باطن میں ہیں آزاد بظاہر ہیں نظر بند   ہے دیدۂ دل باز یہاں دیدۂ سر بند
اس غم طلبی کی بھی کوئی حد ہے کہ حسرت   بیچین ہوئے ہم جو ہوا در دلِ ... بند

چھپ نہیں سکتی چھپانے سے محبت کی نظر   پڑ ہی جاتی ہے رُخِ یار پہ حسرت کی نظر
ہجر میں رہنے لگیں اور بھی کچھ یاد ہمیں   وہ مراعات کی باتیں وہ مروت کی نظر

ہم پہ نگاہِ یار سے گزرا جو تھا کبھی   ہے آج تک وہ پیشِ نظر ماجرائے ناز
اہلِ نظر کی جان ہے جس چیز پر نثار   اک بات انہیں اور بھی کچھ ہے سوائے ناز

شوقِ بقائے یار میں مرتے تو ہو مگر / حسرت جو نقدِ جاں بھی نہ ٹھہرے بہائے [illegible]

کی میں نے لطفِ یار کی بیجا نہ کچھ بھی قدر / ہوتی ہے کس سے جنسِ فراواں کی احتیاط

رنگینیِ سخن میں بھی ہے سادگی کی شرط / مشکل ہے اس فریضۂ آساں کی احتیاط

آئی جو ترے روئے منور سے قرینِ شمع / ہم لوگ بھی سمجھے کہ محفل میں نہیں شمع

کیوں کہیں ہم کہ غمِ دہر سے مشکل ہے فراغ / جب تری یاد [illegible] ہر فکر سے حاصل ہے فراغ

کوئی دل عشق سے آزاد نہیں ہے گویا / [illegible] دعویِٰ باطل ہے فراغ

اے تصورِ حسنِ یار میں اب تجھے کیا کہوں / دل کا جو حال تیری بدولت ہے آج کل

شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھ کو کہ اور بھی / [illegible] اضطراب کی شدت ہے آج کل

اک طرفہ بیخودی کا ہے عالم کہ عشق میں / [illegible] ہے آج کل

اس تغافل پر بھی کرتے ہیں تجھی کو یاد ہم / [illegible] ہم

آئے تھے محفل میں تیری باندازِ آرزو / [illegible] ناشاد ہم

[illegible] / [illegible] شاد ہم

ہم پہ تری نگاہ [illegible] پہلے تھی اب نہیں / [illegible] نہیں

تھے بسکہ دلپذیر محبت کے واقعات / کچھ [illegible] اب بھی یاد ہیں جو سب نہیں

حسرت جفائے یار تو اک عام تھی ادا / اظہار التفات مگر بے سبب نہیں

اُسی سے چھپتے ہیں ہوتی ہے جس پر اُن کی نظر / اگر یوں ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں

شکایت اُن کی نہ جا ہو یہی کہو حسرت / [illegible] ستم روزگار ہم بھی ہیں

مانا کہ رسائی [illegible] دل / [illegible] نہیں کرتے ہیں مجبور کسی کو

[illegible] / [illegible] یاد آرزو کی بہت دور کسی کو

دل غم سے جو [illegible] / [illegible] یاد کبھی آجائے تو کیا ہو

مرتا ہے کسی شوخ پہ [illegible] حسرت / شاید یہ فسانا کہیں تم نے بھی سنا ہو

ہم سے تو [illegible] / [illegible] یاد جانے

اب کاہیکو [illegible] گے وہ حسرت / آغازِ جنوں کے [illegible]

[illegible] / شوق اُنہیں [illegible]

جان [illegible] / [illegible]

عشق میں [illegible] / [illegible] دل میں [illegible]

زندگی [illegible] / [illegible] اگر گزرے

اُن سے اظہار [illegible] / [illegible]

اُن کے قدموں پہ رکھ [illegible] / [illegible]

سرِ پُرشور بھی ایک [illegible] / [illegible]

تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار [illegible] / [illegible]

بجا ہیں کوششیں ترکِ محبت کی مگر حسرت / جو پھر بھی دلنوازی پر وہ چشمِ سحرکار آئی

شبِ فرقت میں یاد اُس بے خبر کی بار بار آئی / بھلانا ہم نے بھی چاہا مگر بے اختیار آئی

الٰہی رنگ یہ کب تک رہے گا ہجرِ جاناں میں / کہ روزِ بے دلی گزرا تو شامِ انتظار آئی

یہی ہے فصلِ گل میں [illegible] دل [illegible] / مستانہ کیوں نہ گزرے ہنگامِ بادہ نوشی

آغاز [illegible] تھا جوش و خروش [illegible] / یا انتہائے غم ہے حیرانی و خموشی

دیدار کی طلب میں [illegible] / [illegible] امیدواری اُن کی بہانہ کوشی

جملہ ۳۴۵ اشعار

سنہ ۱۹۱۶ء — سنہ ۱۹۱۹ء

کچھ بھی [illegible] کے سوا / [illegible] کے سوا

کون رکھیگا ترے غم سے دل و جاں کو عزیز / [illegible] راحت کے سوا

[illegible] / [illegible] کچھ بھی اذیت کے سوا

[illegible] / [illegible] راحت کے سوا

[illegible] / کون [illegible] دلِ دیوانۂ حسرت کے سوا

[illegible] / [illegible]

میری جانب سے شکایت کا تقاضا [illegible] / [illegible] کچھ ایسا ہوتا

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا / شیوۂ عشق نہیں [illegible] کرنا

[illegible] / [illegible] برسا کرنا

شام ہو یا کہ سحر [illegible] / دن ہو یا رات [illegible] کا کرنا

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہے حسرت / [illegible] بار تمنا کرنا

نظر پھیرنے کی آس پہ دل چین کا بیٹھنا / [illegible] کوئی قرینا

سیرِ گل خوش نہیں آتی کسی عنوان ہمیں / [illegible] دیوارِ گلستاں کے قریب

[illegible] سلام کے بعد / [illegible] نام کے بعد

کمالِ شوق کو آتے ہیں [illegible] / تمامِ شوق تری خواہشِ تمام کے بعد

[illegible] / [illegible] کے بعد

[illegible] / [illegible]

[illegible] / [illegible]

[illegible] / [illegible]

[illegible] / [illegible]

[illegible] / [illegible]

[illegible] / [illegible]

[illegible] / [illegible]

پھر تقاضا ہے یہی مجھ سے کہ اُس محفل میں چل — اس دلِ بیتاب کی ضد کو الٰہی کیا کروں
پوچھتے ہیں کہ ہم سے تیری خواہش ہو سو کہا — دل میں جو جو کچھ ہو میرے اب میں اُن سے کیا کہوں
ہجومِ شوق ہو دل میں مگر خاموش رہتے ہیں — چھپایا تھا جو تم سے راز ہم نے آج کہتے ہیں
خدا جانے یہ اپنا حال کیا ہو ہجرِ جاناں میں — کہ آہیں لب تک آتی ہیں نہ اشک آنکھوں سے بہتے ہیں
خموشی کی تو جب یہ گفتگو ہے وصل میں باہم — سمجھتے ہیں وہ کچھ ہم سے نہ ہم کچھ اُن سے کہتے ہیں
سب سمجھتے ہیں پھر بھی انھیں کیسے تو پروا نہ کریں — سیرِ گلشن وہ کریں شوق سے تنہا نہ کریں
اب تو آتا ہے یہی جی میں کہ اے محوِ جفا — کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں
دردِ دل اور نہ بڑھ جائے تسلّی سے کہیں — آپ اس کام کا زنہار ارادہ نہ کریں
شکوۂ جور بہ تقاضائے کرم عرضِ وفا — تم جو دل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں
حال کھل جائے گا بیتابیِ دل کا حسرت — بار بار آپ اُنھیں شوق سے دیکھا نہ کریں
شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی — ورنہ ہم اور کرمِ یار کی پروا نہ کریں
جان ہی سے نہ گزر جائیں کہیں اہلِ نیاز — شوق سے ناز کریں وہ مگر اتنا نہ کریں
پھر بھی ہے تم کو مسیحائی کا دعویٰ دیکھو — مجھ کو دیکھو مرے مرنے کی تمنا دیکھو
جرمِ نظارہ پہ کون اتنی خوشامد کرتا — اب بھی وہ روٹھے ہیں لو اور تماشا دیکھو
ہم نہ کہتے تھے بناوٹ سے ہے سارا غصّہ — ہنس کے لو پھر وہ اُنھوں نے ہمیں دیکھا دیکھو
گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال — شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو
ہوسِ دید مٹی ہے نہ مٹے گی حسرت — دیکھنے کے لیے چاہو اُنھیں جتنا دیکھو
مرادِ آرزو [illegible] ناز تمنا سے — مرے دل سے کوئی پوچھے کہ تو نے فتنہ گر کیا ہے
جذبۂ شوق کدھر کو لیے جاتا ہے مجھے — پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے
اُس جفا کار سے ملنے کی تمنا ہے مجھے — اب بھی میں کچھ نہیں کہتا یہی کہنا ہے مجھے
التفاتِ نگہِ یار کے لائق میں کہاں — مجھ سے بیگانہ رہیں وہ یہی اچھا ہے مجھے
تجھ سے بیگانہ وہ ظاہر میں خفا ہیں حسرت — جب میں جانوں کہ منالونگا یہ دعویٰ ہو مجھے
پایا کہیں جو شکوہ گزارِ جفا مجھے — بولے وہ ہنس کے آپ نے یہ کیا کہا مجھے
نزدیک ہے کہ اُن کے تغافل سے ہار کر — کرنی پڑے عتاب کی بھی التجا مجھے
ہر نغمے نے انھیں کی طلب کا دیا پیام — ہر ساز نے اُنھیں کی سنائی صدا مجھے
"محبت یوں کرو گے تو نہیں سکتی وفا مجھ سے" — یہ تم نے کیا کہا مجھ کو یہ تم نے کیا کہا مجھ سے
تمھارے منھ سے یہ تکرار بھی پر لطف ٹھہری — وہی باتیں سہی جو کر چکے ہو بارہا مجھ سے
دل اور تہمتِ ترکِ خیالِ یار کرے — کسے یقین ہو کون اس پہ اعتبار کرے
قرارِ جاں کے لیے اُس نے شیوۂ تسکین — کبھی جو اور کیا ہو تو اختیار کرے
گزر چکی ہے تمنا کی حد سے دشواری — کہاں تک اور ترا کوئی انتظار کرے
شکرِ جفا بھی اہلِ رضا نے کیا ادا — اُن سے یہی نہیں کہ شکایت نہ ہو سکی
خاموشیوں کا رازِ محبت وہ پا گئے — گو ہم سے عرضِ حال کی جرأت نہ ہو سکی

جملہ ۵۵ اشعار

سنہ ۱۹۱۸ء - سنہ ۱۹۲۲ء

اب تو فرقت میں تڑپنا بھی نہیں ممکن کہ تو — میری تاثیرِ محبت پہ گماں لیجائے گا
رائگاں حسرت نہ جائیگا مرا مشتِ غبار — کچھ زمیں لیجائے گی کچھ آسماں لے جائے گا
شکوۂ غم ترے حضور کیا — ہم نے بیشک بڑا قصور کیا
آپ نے کیا کیا کہ حسرت سے — نہ ملے حُسن کا غرور کیا
دمِ واپسیں آئے پرسش کو ناحق — بس اب جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم
عشق میں جذب کیا اثر بھی نہیں — مر مٹے ہم اُنھیں خبر بھی نہیں
چل چکا آپ کا فریبِ وفا — اب میں اس درجہ بے خبر بھی نہیں
اے دل اُن کو وفا کی خو ہی نہیں — درخورِ لطفِ یار تو ہی نہیں
کثرتِ شوق سے ہمیں گویا — حسرت اب کوئی آرزو ہی نہیں
عشقِ بتاں کو جی کا جنجال کر لیا ہے — آخر یہ میں نے اپنا کیا حال کر لیا ہے
نادم ہوں جان دیکر آنکھوں کو تو نے ظالم — رو رو کے بعد میرے کیوں لال کر لیا ہے
دیکھ لے اب بھی کہیں آکر جو وہ غفلت شعار — کس قدر ہو جائے مرجانے میں آسانی مجھے
بے نقاب آنے کو ہیں مقتل میں وہ بیشک مگر — دیکھنے کا ہوش کب دے گی میری حیرانی مجھے
اور بھی ہو گئے بیگانہ وہ غفلت کرکے — آزمایا جو اُنھیں ضبطِ محبت کرکے
دل نے چھوڑا ہے نہ چھوٹے ترے ملنے کا خیال — بارہا دیکھ لیا ہم نے ملامت کرکے
گھبرا کے تغافل سے تمنا ہے ستم کی — حالت کوئی دیکھے ترے مجبورِ الم کی
خو سمجھ میں نہیں آتی ترے دیوانوں کی — دامنوں کی نہ خبر ہے نہ گریبانوں کی
ہر طرف بیخودی و بیخبری کی ہے نمود — قابلِ دید ہے دنیا ترے حیرانوں کی

جملہ ۱۸ اشعار

سنہ ۱۹۲۲ء - سنہ ۱۹۲۳ء

منزلِ وصلِ یار ہے پیدا — درمیانِ حدودِ بیم و رجا
جان دیدی پہونچ کے اُنکے حضور — ہم نے اور اُنسے کچھ کہا نہ سنا
غصّے میں ادائے ناز اُن کی — گرمی میں ہے لطف چاندنی کا
آنکے آگئے لب فریاد بھی گویا نہ ہوئے — چپ رہے ہم جو دمِ شکوہ گزاری آیا
دلِ مجبور بھی کیا شے ہے کہ در سے اپنے — اُس نے سو بار اُٹھایا تو میں سو بار آیا
لطف کی اُن سے التجا نہ کریں — ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں
صبر مشکل ہے آرزو بیکار — کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں
بھول ہی جائیں ہم کو یہ تو نہ ہو — کون کہتا ہے وہ جفا نہ کریں

شوق اُن کا سو مٹ چکا حسرت
کیا کریں ہم اگر وفا نہ کریں

کل تو رندوں میں ملا تھا۔ مگر اب پھر بھی کہیں
دیکھئے حسرتِ گمنام ملے گا کہ نہیں

کچھ میرے حالِ زار کی اُن کو خبر نہیں
کیا ہو جو میں ہی جاکے سنا دوں۔ مگر نہیں

پرسش ہے میرے حال کی یاربّ روزِ حشر
اتنا بھی اب یہ قصۂ غم مختصر نہیں

اُمرا دوں کو شاد کام کرو
کرم اپنا کبھی تو عام کرو

سب کی خاطر کا ہو خیال تمھیں
کچھ ہمارا بھی انتظام کرو

پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو
تم بھی حسرت اُٹھو سلام کرو

لاکھ اُس شوخِ جفاکار سے پرہیز کرو
شوق پھر بھی یہی کہتا ہے سبیل انگیز کرو

کیا کام اُنھیں پرسشِ اربابِ وفا سے
مرتا ہے تو مر جائے کوئی اُن کی بلا سے

اِک یہ بھی حقیقت میں ہے شانِ کرم اُنکی
ظاہر میں وہ رہتے ہیں جو ہر وقت خفا سے

میرا یہ حُسنِ ظن کہ تغافل ہے التفات
دل کی یہ ضد کہ درد ہے درماں مرے لئے

فرمانِ قتل ہو جو نہیں اذنِ پائے بوس
آخر ہو کچھ تو لطفِ خوباں مرے لئے

بجا ہے دلِ زار کی ناصبوری
کہاں تک اُٹھائے کوئی رنجِ دوری

وہ تمہید ہی سے اُڑا لیں گے مطلب
کہیں شوق نے کی نہ ہو بات پوری

تماشے کی خوب نظارہ بازی
مزہ دے گئی حُسن کی بے شعوری

وہ چُپ ہو گئے مجھ سے کیا کہتے کہتے
کہ دل رہ گیا مدعا کہتے کہتے

مرا عشق بھی خود غرض ہو چلا ہے
ترے حُسن کو بے وفا کہتے کہتے

کیا کیا نہ اُن کی یاد سے ہوں شرمسار ہم
فرصت کبھی جو کشمکشِ روزگار دے

حسرت سے کہتے ہیں وہ بتا اپنی آرزو
اب کیا اُنھیں جواب یہ ناکردہ کار دے

اے عشق تازہ کار تری ابتدا کہ ہم
جب سوچتے ہیں کہتے ہیں گویا ابھی سے ہے

جملہ ۲۸ اشعار

سنہ ۱۹۲۳ء

ہم شکوۂ فلک ہی کریں گے حضورِ دوست
ظاہر ہونے دیں گے وہاں بھی قصورِ دوست

بارہا کھائی ہو جس نے لبِ جاناں کی قسم
خضر کھاتے ہیں یہ کیا چشمۂ حیواں کی قسم

جملہ ۲ اشعار

یکم اکتوبر سنہ ۲۳ء سے ۹ نومبر سنہ ۲۳ء

عہدیک عمرِ فراغت سے بھی خوشتر گزرا
وہ جو اک لحظہ تری یاد میں ہم پر گزرا

تجھ سے اب مل کے تعجب ہے کہ عرصا اتنا
آج تک تیری جدائی کا۔ کیونکر گزرا

یہ بھی اک بات ہے غیروں کے ستانے کو فقط
التفاتِ نگہِ یار ستم میں در گزرا

اب وہ آئیں بھی تو کیا، رو بکیں بھی تو کیا حسرت
ہجر میں تجھ کو جو کرنا تھا سو تو کر گزرا

عاشق بنے تھے پھر بھی کیا شکوۂ جفا
سچ پوچھئے تو ہم سے بجا ہے ملالِ دوست

مانوس ہو چکے تھے ازل میں فنا سے ہم
اس انتہا کو جانتے ہیں ابتدا سے ہم

اس انجمن کے شوق میں جی کا زیاں سہی
اک بار اُن کو دیکھ تو لیں گے بلا سے ہم

آپ کو آتا رہا میرے ستانے کا خیال
صلح سے اچھی رہی مجھکو لڑائی آپ کی

جملہ ۸ اشعار

آخر سنہ ۲۳ء

رنجِ بیجا پہ کیا ہم نے جو اظہارِ ملال
ان کی چتون سے عیاں پھر ہوئے آثارِ ملال

منحصر وقتِ مقرر پہ ملاقات ہوئی
آج یہ آپ کی جانب سے نئی بات ہوئی

جملہ ۲ اشعار

مارچ سنہ ۱۹۲۴ء

قدموں پہ ان کے رکھ کے سر رفعِ ملال کر دیا
ہمتِ عذر خواہ نے آج کمال کر دیا

چلو جان دیکے حسرت ہوئی خوب غم سے فرصت
وہ کبھی نہ تم سے ملتے یونہیں صبح شام کرتے

جملہ ۲ اشعار

سنہ ۲۵ سنہ ۳۴ء

کرنے کو تو میں عہد کر دوں ترکِ ہوس کا
پر دل سے کبھی کیا جو نہیں ہے مرے بس کا

ہو رہی ہے صباحِ عشق طلوع
ہو چلے ہیں چراغِ عقل خموش

تجھ کو لے محو تغافل میری پروا ہی نہیں
حالِ دل کس سے میں کہتا تو نے پوچھا ہی نہیں

جملہ ۳ اشعار

سنہ ۳۵ سنہ ۴۰ء

شکوۂ جور و جفا کو چھوڑ کر شکرِ ستم
کیجئے اور خوب سا اُن کو پشیماں کیجئے

کوئی ان کی بزمِ جمال سے کب اُٹھا خوشی سے کہاں اُٹھا
جو کبھی اُٹھا بھی اُٹھائے سے تو اُسی طرف نگراں اُٹھا

یہ خلوصِ غم کی تھی کمی تو پھر اور کیا تھا کہے کوئی
کہ نہ اشتبِ دردِ دل ہوئی نہ ہنوز پردۂ جاں اُٹھا

یہ سزا کہاں یہ جزا ہوئی بخلافِ خواہشِ مدعا
پئے قتلِ حسرت ملتجی خود اگر وہ جانِ جہاں اُٹھا

قسمت شوق آزما نہ سکے
اُن سے ہم آنکھ بھی ملا نہ سکے

دلمیں کیا کیا تھی عرضِ حال کے شوق
اسنے پوچھا تو کچھ بتا نہ سکے

ہم تو کیا بھولتے انھیں حسرت
دل سے وہ بھی اُنھیں بھلا نہ سکے

جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لئے
اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے لئے

تھی کبھی یاد اُنکی وجہ سکوں
اب کسی حال میں قرار نہیں

کیا ہوئیے آج پوچھیں گے اس نازنیں سے ہم
تجھ سا جو کوئی ڈھونڈھ نکالیں کہیں سے ہم

کھیلے ہم کھیل محبت کا انجام سے ہو کر بے پروا
معلوم نہیں کیا پانا ہے معلوم نہیں کیا کھونا ہے

تم ہم سے چھٹے کچھ ایسی گھڑی شغل نہ پھر امید رہی
اب یاس کی آہیں بھرنا ہیں اور خون کے آنسو رونا ہے

جملہ ۱۲ اشعار

(بقیہ انتخاب کلیات صفحہ ۴ پر ملاحظہ ہو)

ایجنسی کی چند کتابیں

دواوین و مجموعۂ کلام

کلیات غالب ---- عہ
〃 آتش ---- عہ
〃 وفا ---- عا
〃 سودا ---- ہے
〃 بیخود موہانی ---- عا
دیوان غالب ---- عہ
〃 میر حسن ---- ۸
〃 درد --- عا، ۱۲
〃 ذوق ---- عہ
〃 ذوق مرتبہ آزاد ---- سے
〃 جان صاحب ---- سے
〃 رنگین انشاء ---- عا
〃 حالی ---- عا
〃 اثر ---- عہ
〃 تاباں ---- عہ
〃 ظفر ---- ۱۲
〃 رضا فرنگی محلی ---- عا
باقیات فانی ---- سے
تابش خیال - افسر امروہوی عہ
رمز و کنایات -- فراق -- ہے
مشعل ---- 〃 ---- عا
شبستان ---- 〃 ---- سے
روپ ---- 〃 ---- صہ
روح کائنات ---- 〃 ---- صہ
سبد گل -- شاعر لکھنوی -- عہ
شاعر کی راتیں -- جوش -- صہ
رُباعیات شاد ---- للعہ
ظہور رحمت -- شاد ---- عہ

تصاویر ذوق - مرتبہ سر سلیمان -- عہ
مطلع الانوار - برق دہلوی -- عا
نقش و نگار - جلیل قدوائی -- عہ
خواب گراں - صفت برنی --- عہ
زنجیریں -- تیغ الہ آبادی -- ۱۲
گنجینۂ جوہر - مرتبہ دوست قدوائی عا

ناولیں

درد --- احمد حسین خاں -- عا
سُرخ حرف -- 〃 -- عہ
نظیر بیگم -- 〃 -- عہ
واہ -- 〃 -- عہ
وہ عورت -- 〃 -- عہ
شریر بیوی -- عظیم بیگ چغتائی عا
خل بوٹ -- 〃 -- عہ
لفٹنٹ -- 〃 -- عہ
خانم -- 〃 -- للعہ
خطوط کی ستم ظریفی 〃 -- عہ
انگوٹھی کا راز 〃 -- عہ
ہوائی -- سلطان حیدر جوش عا
نقش و نقاش -- 〃 -- عا
سنہری لاش -- تیرتھ رام -- صہ
سنہری بچھو -- 〃 -- صہ
کرنیل کی بیٹی -- 〃 -- ہے
مہر خموشی -- 〃 -- ہے
آزادی -- 〃 -- سے
قاتل ہار -- 〃 -- صہ
شگفتہ -- نسیم انہونوی -- سے

کہکشاں -- نسیم انہونوی -- عہ
شبنم -- 〃 -- عا
طرز زندگی 〃 عا
فتح شوستر - علامہ صادق سردھنوی للعہ
جنگ اصفہان -- 〃 -- للعہ
عجیب جنگ -- 〃 -- للعہ
نقاب پوش مصر -- 〃 -- للعہ
شیر سوڈان -- 〃 -- للعہ
سسلی کی ساحرہ 〃 -- للعہ
حور مراقش -- 〃 -- للعہ

جوشِ اسلام -- 〃 -- عہ
ماہِ طلعت -- 〃 -- سے
بنت البحر - خان محبوب طرزی - ہے
طلسم حیات -- 〃 -- ہے
دو دیوانے -- 〃 -- عا
سفر زہرہ -- 〃 -- عا
سبز مینار -- 〃 -- ہے
سورج مکھی -- 〃 -- عا
دردانہ -- 〃 -- عا

راجپوت و مغل زن و شو کی معاشرت --- مقبول احمد - تاریخ -- ہے ۱۲
انارکلی --- اختر اورینوی -- افسانے --- عا
سمنٹ و ڈائنامیٹ --- 〃 --- عا ۱۰
تحقیق و تنقید --- 〃 --- تنقید --- سے
ارضی دیوتا --- خلیل جبران --- افسانے --- عا
مداوا --- فرقت --- دفتر جدید شاعری پر --- للعہ
اُردو کی عشقیہ شاعری --- فراق - تنقید --- عا ۱۲
شباب سے پہلے --- مرتبہ شیدا - تذکرہ --- للعہ
محوِ خواب --- اظہار الاسلام -- ناول --- ہے ۱۲
روسیاہ --- رئیس احمد جعفری --- 〃 --- للعہ
بہشت --- خالد بشیر --- ڈرامہ --- عہ
آفتاب --- سید نصیر حیدر --- ناول --- عہ
شہر خموشاں --- 〃 --- افسانے --- عا
تذکرہ عبدالحق محدث -- سید احمد --- سوانح --- ہے
دوزخ --- سعید بھوپالی -- افسانے --- عہ
اقبال کی شاعری --- عبدالمالک --- تنقید --- عہ
مشاطۂ سخن --- صفدر مرزاپوری - اصلاحات --- للعہ
اصلاحات اقبال - بشیر الحق - اصلاحات عہ
غریب نواز - محمد اجمل خاں - سوانح - ۲

ملنے کا پتہ :- **الناظر بک ایجنسی لکھنؤ**

دی مغل لائن لمیٹیڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہاز ران کمپنی

بحراحمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

بمبئی سے

عدن، جدہ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت پڑنے پر دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کرسکیں گے

مزید معلومات کے لئے

حسب ذیل پتہ پر لکھئے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹیڈ

۱۲- بنک اسٹریٹ - بمبئی